قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مئی 2021 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطور خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23، شمارہ:05، مئی 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھرگٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم

نئی تعلیمی پالیسی — شریف احمد قریشی 7
قومی تعلیمی پالیسی 2020 — بدرالاسلام 9
تعلیمی دائرے میں وسعت کا رجحان — محمد فیروز عالم 12

نقد و نگاہ

شانتی رنجن بھٹا چاریہ..... — ہمایوں اشرف 15
مظفر خیرآبادی کی ہندی شاعری میں ہندوستانی تہذیب — عشرت ناہید 19
مثنوی سحرالبیان — محمد سہیل انور 22
شکیل الرحمٰن کی گرونانک شناسی — ریحان حسن 25

رفتار تحقیق

اردو لسانیات کے حوالے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمات — محمد جہانگیر وارثی 29

گنج ہائے گرانمایہ

دیویندر ستیارتھی — حیات افتخار 33
طارق جمیلی — قسیم اختر 36

کتاب دریچہ

جن کتابوں نے متاثر کیا — ارشاد احمد 39

سلسلہ صحافت

اردو صحافت اور کالم نگاری — مہتاب امروہوی 41
مولانا عبدالغنی عزیزی اور رسالہ 'کرن' — ساجد ذکی فہمی 44

ہم نے جنھیں بھلا دیا

نئی جہت اور صداقتوں کا شاعر جلیس نجیب آبادی — ایم اے کنول جعفری 47
موسیٰ مجروح کی افسانہ نگاری — ذاکر حسین ذاکر 50

یاد رفتگاں

کمال جائسی کی یاد میں — اشتیاق سعید 53

دوسری زبانوں سے

شیکسپیئر کے گیارہ سانیٹس کا اردو ترجمہ — ف س اعجاز 56

نیا آسمان نئے ستارے

اردو شاعری میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و معاشرت — سجاد احمد نجار 59
سرسید احمد خان کی انشائیہ نگاری — محمد علی عالم 62

کمپیوٹر

ایکسل میں چارٹ بنانا 64

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف — ادارہ 68

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 75

ہماری بات

اردو ایک شیریں اور پرکشش زبان ہے،اس کی سحر انگیزی کا عالم یہ ہے کہ اپنے اور پرائے سبھی اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں لیکن اردو کا حسن درست تلفظ کے ساتھ مشروط ہے۔غلط تلفظ کی صورت میں الفاظ اپنی کشش کھودیتے ہیں جس کے سبب زبان کی مٹھاس جاتی رہتی ہے۔کبھی بار غلط تلفظ کرنے کی صورت میں لفظ کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔اردو میں ایسے بہت سے الفاظ ہیں جن کی تحریری شکل ایک ہی جیسی ہوتی ہے،مگر معانی الگ الگ ہوتے ہیں۔ایسے الفاظ کو غلط پڑھنے یا بولنے کی صورت میں معنی کی ترسیل میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔اسی لیے بولتے اور پڑھتے وقت تلفظ کی سطح پر احتیاط نہایت ضروری ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ تلفظ کے تعلق سے جس قدر احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہے،فی زمانہ اسی قدر بے احتیاطی اور بے توجہی دیکھنے کو مل رہی ہے اور وقت کے ساتھ اردو تلفظ کے مسائل میں اضافہ ہورہا ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ تلفظ کے تعلق سے یہ لاپرواہی صرف غیر اردو داں طبقے میں ہی دیکھنے کو نہیں مل رہی ہے بلکہ بہت سے اردو داں حضرات بھی تلفظ کے حوالے سے غفلت کے شکار ہیں۔اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو اردو کی خوبصورتی اور کشش ماند پڑسکتی ہے۔

اردو کے اساتذہ اور طلبا کو خاص طور سے تلفظ پر دھیان دینا چاہیے۔طلبا اپنے اساتذہ کا تتبع کرتے ہیں۔اس لیے اساتذہ کو ہر لفظ کے صحیح تلفظ سے باخبر ہونا چاہیے۔صحیح تلفظ تک رسائی کے لیے ایک مؤثر ذریعہ 'لغت' ہے۔لیکن اردو میں بہت کم لغات ہیں جو صحیح اور رائج تلفظ کی نشاندہی کرتی ہوں اور وہ لغات عام طور پر دستیاب بھی نہیں ہیں۔بہت سی لغت کی کتابوں میں الفاظ کا تلفظ تو دے دیا جاتا ہے مگر نہ تو رائج تلفظ بتایا جاتا ہے اور نہ ہی اردو کے صوتی مزاج ولہجہ کا خیال کیا جاتا ہے،اس لیے لغت کی کتابوں میں دیکھ کر تمام الفاظ کا اردو کے آہنگ ومزاج کے مطابق تلفظ کرنا مشکل ہے۔لہٰذا ایسی لغات کا تیار کرنا وقت کا اہم تقاضہ ہے جن میں مختلف زبانوں سے نئے الفاظ شامل کیے گئے ہوں۔ان نئے لفظوں کے تلفظ سے عام طور پر لوگ نا آشنا ہوتے ہیں اس لیے ان کے تلفظ کا تعین بھی بہت ضروری ہے اور آج کے کثیر لسانی عہد میں جب ایک زبان دوسری زبانوں سے بہت سی سطحوں پر اخذ واکتساب کر رہی ہے تو یہ عمل اور بھی لازمی ہوجاتا ہے کیونکہ اردو میں بہت سی دوسری زبانوں کے الفاظ ہیں اس لیے اردو کے لیے ایک اسی نوع کی ایک ڈکشنری کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے جس میں لفظ کے ماخذ واشتقاق اور معانی کے ساتھ تلفظ پر بھی خاص طور پر زور دیا گیا ہو۔

اردو میں تلفظ کے بڑھتے مسائل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں،خاص طور سے عربی،فارسی،ترکی کے الفاظ کا استعمال اردو میں بہت زیادہ ہے،اس لیے ان الفاظ کی اصلیت سے واقفیت حاصل کرنے کی طرف بھی اردو والوں کو توجہ دینی چاہیے یہ لازمی نہیں کہ عربی،فارسی،ترکی کے الفاظ کو بالکل عربی،فارسی یا ترکی کی طرح ہی بولا جائے بلکہ اس میں اردو کے مزاج ولہجہ کا بھی دھیان رکھنا پڑے گا۔فی زمانہ اردو میں انگریزی،ہندی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا استعمال بھی خوب ہورہا ہے،لیکن ان دوسری زبانوں کے لفظوں کو اردو زبان میں استعمال کرتے ہوئے کس طرح بولا جانا چاہیے،اس پر بھی سمیناروں اور ورکشاپوں کے انعقاد کی ضرورت ہے۔اردو میں بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے تلفظ کے تعلق سے کنفیوژن پایا جاتا ہے یا عدم واقفیت کی وجہ سے الفاظ کو مختلف انداز سے بولنے کی وجہ سے کنفیوژن پیدا کردیا گیا ہے،ایسے الفاظ کی فہرست سازی پر کام ہونا چاہیے اور باضابطہ ماہرین کی ورکشاپ میں مناسب تلفظ کا تعین کیا جانا چاہیے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اردو کا دائرہ دن بہ دن وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے اور اردو دُور دَراز کے شہروں اور ملکوں میں بھی پہنچ رہی ہے،اور وہاں کی مقامی زبان وثقافت پر بھی اپنے اثرات مرتب کر رہی ہے،تو ایسے میں ظاہر ہے کہ اردو کے تلفظ پر خاص طور پر دھیان دیا جانا چاہیے کیونکہ دوسری زبانوں سے تعلق رکھنے والے افراد اسی انداز میں بولیں گے جو وہ اردو والوں سے بولتے یا پڑھتے ہوئے سنیں گے،اس لیے اردو والوں کو تلفظ کے باب میں پوری طرح چوکنا رہنے کی شدید ضرورت ہے۔

شیخ عقیل احمد

ربط و التفات

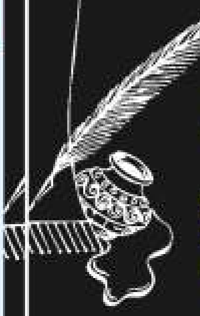

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

✍ شمارہ اپریل کے اداریے میں مدیر صاحب نے اردو زبان کی ترقی و فروغ کے لیے متعدد بے بہا تجاویز فراہم کرکے اپنے ادبی و مدیرانہ فریضے کو بخوبی انجام دیا ہے۔اس شمارے میں مضامین کے معیار کی افراط و فراوانی استعجاب آمیز ثابت ہوئی ہے۔

شمیم طارق صاحب نے مرزا غالب کی شاعری کے حقیقی محاسن کو نشان زد کیا ہے۔اسی مقالے میں چند الفاظ کی تشریح و تفہیم بھی کرائی گئی ہے۔سوامی رام تیرتھ اور اقبال کے فلسفۂ حیات کا پہلی بار تجزیاتی خلاصہ گردانا جاسکتا ہے۔

جناب ابرار اجراوی نے استاد شاعر تاجور نجیب آبادی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔

فیضان الحق صاحب نے اپنے مقالے کے تحت شاعر انور عظیم و اختر الایمان ان دونوں کی شاعری کے اہم اوصاف کی بخوبی خط کشی کی ہے۔ایک خاص بات یہ ہے کہ 'اختر الایمان' کے نام کی ترکیب غلط کی گئی تھی، کیونکہ صحیح نام 'اختر ایمان' ہی درکار تھا۔موقر جریدہ 'ایوانِ اردو' کے اپریل ماہ سنہ 2017 کے شمارے میں شامل 'گرامی نامے' کے عنوان کے تحت ایک عالم و فاضل مراسلہ نگار نے صفحہ 34 پر اپنے مراسلے میں یہ صحیح درج کیا تھا کہ 'اختر' فارسی لفظ اور 'ایمان' عربی لفظ ہے۔ فارسی اور اردو میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔'اختر' اور 'ایمان' کے ساتھ فارسی اضافت 'اختر ایمان' تو درست ہے، لیکن اختر الایمان' خلافِ قواعد ہے۔ہاں البتہ 'نجم الایمان' ضرور کہا جاسکتا ہے کیونکہ 'نجم' اور 'ایمان' یہ دونوں الفاظ عربی زبان کے ہیں۔''

ایک خاص بات یہ ہے کہ میرے ذریعے بار بار نوٹس میں لاتے رہنے کے باوصف' کی وجوہات' جیسے غلط الفاظ کا اعادہ تقریباً ہر ایک شمارے میں دیکھا جاسکتا ہے، اس بار بھی ص 28 پر اول سوال میں ہی درج ان غلط الفاظ کی بجائے' کے وجوہ' صحیح الفاظ ہر ایک شمارے میں درج کیا کریں۔برائے مہربانی طلبا وغیرہ کے لیے ایک لسانی مثال مانے جانے والے اس جریدے کے معیار کے مدِنظر یہ اصلاح کرنے کی جلد از جلد زحمت فرمائیں۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک** : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر K-18-A-201، پٹیالہ (پنجاب)

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی کا شمارہ مارچ 2021 نظر نواز ہوا۔اس کے تمام مشمولات قابل قدر ہیں۔ پروفیسر حنیف کیفی پر گوشہ شائع کرکے آپ نے اچھا کیا۔حنیف کیفی صاحب اردو کے ایک اہم نقاد، محقق اور شاعر تھے۔اُن کی خاموش طبعی اور تنہائی پسندی نے انھیں عوام میں اتنی شہرت عطا نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے لیکن خواص کی وہ پہلی پسند تھے۔ان کے سارے علمی کام لائق تحسین ہیں۔حنیف کیفی صاحب دلجمعی، دل سوزی، جگر کاوی اور وقت پسندی سے زندگی بھر کام کرتے رہے۔ شہرت سے کوسوں دور خلوت پسندی کو اپنا شعار بنایا۔ وہ مجلسی ادیب نہیں تھے۔شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ پروفیسر کوثر مظہری نے ان کی پوری شخصیت اور ادبی خدمات کا احاطہ نہایت موثر انداز سے کیا ہے۔حنیف کیفی کی شاعری پر اظہر ابرار صاحب کا مضمون بھی قابل قدر ہے۔محمد اکرام نے حنیف کیفی کے کوائف کو پیش کرکے تحقیقی کام کرنے والے طلبا کے لیے بڑی آسانی پیدا کردی ہے۔اس شمارے میں عبدالحق صاحب کا مضمون امیر خسرو کی مثنوی 'مطلع الانوار' ایک علمی و تحقیقی کارنامہ ہے۔ رؤف خیر صاحب نے مختار شمیم

اور عبد الغنی صاحب نے زبیر الحسن غافل پر عمدہ مضمون لکھا ہے۔ قیوم بدر کا مضمون 'ساحر کی ساحرانہ شاعری' دلچسپ ہے۔ اسلم جمشید پوری نے سال گزشتہ کے فکشن اور فکشن تنقید کا عمدہ جائزہ لیا ہے۔

آپ کا اداریہ فکر انگیز ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ اردو میں تدریس کے لیے سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا اس دور کی اہم ضرورت ہے اور پھر یہ کہ ترجمہ نگاری کے ذریعے مغربی ممالک کے ترقی یافتہ سائنسی اور ٹیکنالوجی کے علوم کو اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیے، جس کے لیے ادارہ جاتی سطح پر منصوبہ بندی بہت ضروری ہے۔ میں آپ کے فکر و خیال کے ساتھ ہوں۔ یہ وسیع کام کوئی اہم ادارہ ہی انجام دے سکتا ہے، مگر اس کے لیے بہت غور و خوض کی ضرورت ہے۔ ماضی میں یہ کام ہوئے ہیں۔ مختلف اداروں کو یہ ذمے داری بھی دی گئی مگر اس کا ہوا کیا؟ اس تعلق سے ہمیں مل بیٹھ کر سوچنا چاہیے اور عملی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

آپ کی نگرانی میں رسالہ 'اردو دنیا' روز افزوں خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔ پوری اردو دنیا میں آپ کا اور ہم سبھوں کا مقبول رسالہ ماہنامہ ''اردو دنیا'' بے حد ذوق و شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کے ہر شمارے کا سبھوں کو شدت سے انتظار رہتا ہے۔ میری نیک خواہشات قومی اردو کونسل اور اس رسالے کے ساتھ ہیں۔

پروفیسر شہزاد انجم: صدر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو دنیا کا مارچ 2021 کا شمارہ موصول ہوا۔ دیکھ کر خوشی ہوئی اور آنکھیں بھر آئیں۔ ادارہ نے والد محترم پروفیسر محمد حنیف کیفی کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے جس کے لیے میں اپنے اہل خانہ کی طرف سے شکر گذار ہوں کہ بہت کم مدت میں تین مضامین یکجا کر کے شائع کر دیے۔ تینوں مصنفین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے والد محترم کے ادبی اور شخصی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کر کے ان سے عقیدت کا حق ادا کر دیا۔

پروفیسر کوثر مظہری کا مضمون 'حنیف کیفی' عالمانہ تحریر کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے والد صاحب کی تصانیف کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ والد صاحب کو پرکھا اور سمجھا بھی ہے۔ ان کی عالمانہ بصیرت اردو ادب پر ظاہر ہے۔ میں بہترین مضمون کے لیے دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دوسرا مضمون جو مجھے بہت پسند آیا وہ محمد اکرام صاحب کا 'حنیف کیفی: کوائف و کیفیات' ہے۔ اکرام صاحب سے والد صاحب کے گھریلو مراسم تھے۔ والد صاحب ان پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ اس مضمون میں جس طرح اکرام صاحب نے والد صاحب کی شخصیت کو ابھارا ہے اور جو باتیں خوبصورت انداز میں رقم کی ہیں وہ باتیں میں بھی نہیں لکھ سکوں گا۔ خوشی اس وقت دوبالا ہوگئی جب اکرام صاحب نے بتایا کہ یہ ان کا پہلا مضمون تھا۔ میں ان کا صمیم قلب سے شکر گذار ہوں۔

تیسرا مضمون ڈاکٹر اظہر ابرار احمد کا 'حنیف کیفی کی شاعری میں درد انسانیت' ہے۔ میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر والد صاحب کی شاعری پر مضمون لکھا جس کے لیے وہ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان کے مضمون کے سلسلے میں مجھے چند باتیں کہنا ہیں۔ ان کا مضمون اچھا ہے لیکن والد صاحب کے اشعار جو انھوں نے حوالے کے طور پر اس مضمون میں شامل کیے ہیں۔ ان میں بہت سی غلطیاں در آئی ہیں۔

محمد قمر سلیم: ایسوسی ایٹ پروفیسر، انجمن اسلام اکبر پیر بھائی کالج آف ایجوکیشن، نوی ممبئی

میں اکثر استوتی اگروال کے ذریعے بھیجی گئی pdfs سے قومی کونسل کے معیاری پرچے 'اردو دنیا'، 'فکر و تحقیق'، 'بچوں کی دنیا' اور 'خواتین دنیا' پڑھتا رہتا ہوں۔ ہندوستان میں قومی کونسل اردو کے فروغ کے لیے جو کچھ بھی کر رہی ہے اس کا اندازہ چاروں پرچوں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ مارچ 2021 کے 'اردو دنیا' میں رؤف خیر کا مضمون ڈاکٹر مختار شمیم کے حوالے سے معلوماتی ہے اور محمودہ قریشی کا 'شہر آگرہ کا ادبی تعارف' پڑھ کر بہت سے نئے پہلو سامنے آئے۔ استوتی اگروال کا سیفی سرونجی سے لیا گیا انٹرویو اس شمارے کی جان ہے۔ اس انٹرویو کا مقصد قارئین کو سیفی سرونجی کے علمی و ادبی کارناموں سے روشناس کروانا ہے۔ سیفی سرونجی صاحب کے ساتھ مجھے براہ راست ملاقات کا موقع تو نہ ملا، لیکن میں انھیں اکثر پاکستانی رسائل میں پڑھتا رہا ہوں اور اس انٹرویو کو پڑھ کر ان کی مکمل شخصیت مجھ پر روشن ہوئی ہے۔ اس انٹرویو کے مطالعے کے بعد میں نے اُن کی آپ بیتی 'یہ تو سچا قصہ ہے' کا مطالعہ بھی شروع کر دیا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے نانا ڈاکو تھے، گھر میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا آج وہ 75 کتابوں کا مصنف ہے۔ سیفی سرونجی دوران انٹرویو استوتی اگروال کو اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق آگاہ کرتے ہیں، فلمی گانے سننا بچپن کا سوق تھا، اسی عمر میں ریڈیو خریدا، طالب علمی میں ہی بیڑی کا رخانے میں بیڑی بنانے لگے۔ سیفی سرونجی کا ادب سے لگاؤ ادبی مجلّہ 'انتساب عالمی' کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں جو 39 برسوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اُن کا یہ جملہ بے حد متاثر کرتا ہے، 'رسالہ نکالنے کے لیے سرمایہ سے زیادہ ہمت اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' سیفی سرونجی نے زندگی کا سفر ایک موہوم نقطہ سے کیا، مسلسل جد و جہد اور ان تھک محنت کے بل بوتے پر آج بھی چمک رہے ہیں۔ 'اردو دنیا' کے اس بہترین شمارے کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مخدوم عرفان طاہر: جھنگ، پاکستان

کوئی آدھی صدی سے زیادہ وقت سے اردو اور ہندی ادب میں افسانہ، ناول، ڈراما اور شاعری سے وابستگی ہے۔ اس دوران اب تک میں نے 'اردو دنیا' کا ہم پلہ کوئی ایک بھی رسالہ نہیں دیکھا جو اس قدر پابندیِ وقت کے ساتھ نکلتا ہو۔ وہ بھی اس قدر آن بان اور شان کے ساتھ۔ پورا ماہنامہ آرٹ پیپر پر اور رنگین، دیدہ زیب، گیٹ اَپ اور شاندار پیش کش، معیاری مضامین، قابل مطالعہ، جدید ترین ٹکنالوجی سے آگہی۔ اردو دنیا کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کی خبریں، سبحان اللہ۔ پہلے فاروقی صاحب کی رحلت فرماتے ہی ان پر مضامین اور اب مارچ کے شمارے میں اسی طرز پر حنیف کیفی صاحب کے جاتے ہی ان پر تین مضامین اس قدر مستعدی کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آتی۔ تاہم ایک بڑی خلا کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یہ بات آپ کے علم میں بھی ہوگی کہ تخلیقی ادب کے بغیر 'اردو دنیا' نامکمل ہے، تو؟

حبیب کیفی: لالہ لاجپت رائے کالونی، پانچویں چوپاسنی روڈ، عیدگاہ، جودھپور، راجستھان

نئی تعلیمی پالیسی

شریف احمد قریشی

(ہندوستانی زبانوں، علوم و فنون، تہذیب اور قومی یک جہتی کے تحفظ و فروغ کے تناظر میں)

سرزمینِ ہند میں اقوامِ عالم کے فراق
کارواں آتے گئے ، ہندوستاں بنتا گیا

اُردو کے مشہور و مقبول شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری کا یہ شعر ہندوستان کی تعمیر، ہندوستانیت اور مشترکہ تہذیب کا بہترین عکاس ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی پوری تاریخ کو اپنے دو مصرعوں میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان کسی ایک یا خاص مذہب ، دھرم ، فرقہ ، سمپر دائے ، ذات اور گروہ کی میراث نہیں ہے بلکہ مختلف مذاہب اور مشترکہ تہذیب کی رنگارنگ ہندوستانیت کا گہوارہ ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی قوم اور ملک کی ہمہ جہت ترقی کا انحصار اس قوم یا ملک کے تعلیمی نظام ہی پر بڑی حد تک ہوتا ہے۔ جس ملک کے نظامِ تعلیم کی نوعیت جس قسم کی ہوگی وہاں کے باشندوں کی شخصیت پر اس کا اُسی طرح کا اثر پڑنا لازمی ہے۔ تعمیری ، سودمند اور مثبت بنیاد پر استوار تعلیمی نظام قوم و ملک کو عروج و ترقی سے بھی ہم کنار کراتا ہے اور نئی نسل کے ساتھ وہاں کے شہریوں کی شخصیت میں نکھار بھی پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم یا رائج نظامِ تعلیم میں جدت و اختراع کے ساتھ قومی یا ملکی ضروریات اور عصرِ حاضر کے جدید مسائل و تقاضات کی رعایت کو ضروری خیال کیا جانے لگا ہے۔ پُرخلوص طور پر عصبیت سے پاک و صاف اور اعلیٰ انسانی اقدار سے معمور نظامِ تعلیم ہی سے سودمند اور خوش گوار تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

ایک طویل عرصے کے بعد 2035 تک کے لیے تیار کی گئی نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ہر ملک کی حکومت کی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک کے ماحول و مسائل کے مدِّ نظر تعلیمی نظام میں وقتاً فوقتاً ایسی اختراع کرتی رہے جو وہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبودی اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لحاظ سے سودمند ہو۔

نئی تعلیمی پالیسی کا نفاذ فوری طور پر یا جنگی پیمانے پر نہیں کیا جائے گا بلکہ حالات اور موقع و محل کی مناسبت سے اس کے نفاذ کی مدّت دس سال مقرر کی گئی ہے۔ ایک طویل منصوبہ بند طریقے یا ایک حکمتِ عملی کے تحت اسے 2030 تک ہر حال میں نافذ کر دیا جائے گا۔ اس نئی تعلیمی پالیسی کے تحت ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ درجات تک کے نصاب میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ابھی تک پانچ سال کی عمر تک کے بچّوں کی تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ اب اسکولی تعلیم میں تین سے چھ سال کی عمر تک کے بچّوں کی تعلیم کی طرف بھی باقاعدہ طور پر توجہ دی جائے گی۔ رائج نصاب تین سے آٹھ سال ، آٹھ سے گیارہ سال ، گیارہ سے چودہ سال اور چودہ سے اٹھارہ سال کی عمر کے طالب علموں کے لیے ہوگا۔ یہ حکمتِ عملی تین سے چھ سال کی عمر کے بچّوں کی ذہنی نشو و نما کے لیے نہایت کارگر اور سودمند ثابت ہوگی۔ نئے تعلیمی نصاب کے ذریعے ابتدائی درجات ہی سے بچّوں کو مختلف زبانوں اور تہذیبوں کی طرف متوجہ کرنے سے خوش گوار نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جا رہی ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی میں درجہ پانچ تک کے طالب علموں کو مادری زبان ، خانگی زبان ، مقامی زبان یا علاقائی زبان میں تعلیم دینے کی سفارش کی گئی ہے اور یہ بھی تجویز ہے کہ اسے درجہ آٹھ یا اس کے بعد کے درجات تک بھی بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ مادری ، مقامی یا علاقائی زبان کو نصاب میں ایک مضمون کی حیثیت سے اختیار کرنے کے بجائے میڈیم یا ذریعۂ تعلیم کی بات کہی گئی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کسی بھی زبان کو کسی بھی طالب علم پر تھوپا نہیں جائے گا ، جب کہ اب تک کی بیشتر تعلیمی پالیسیوں کے تحت محض زبان یا کسی مضمون کو بڑی حد تک لازمی قرار دے کر اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا ہے اور طالب علموں کی مرضی ، دل چسپی یا پسند و ناپسند کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

روایتی طریقۂ تدریس اور ایک عرصہ سے رائج نصاب میں اسکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں میں کشش و دل چسپی کا فقدان ہو جاتا ہے۔ اس لیے نئی تعلیمی پالیسی میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ نصاب کے علاوہ ایسے پروگراموں کا بھی انعقاد کیا جانا چاہیے جن کے ذریعے طلبا کو دل چسپی کا سامان بھی فراہم ہوتا رہے نیز جواُن کی شخصیت اور ملک کی فلاح و بہبودی کے لیے بھی کارآمد ہو۔

پالی ، فارسی اور پراکرت بھاشاؤں کے ساتھ تمام ہندوستانی زبانوں جیسے پنجابی ، گجراتی ، بنگلہ ، مراٹھی ، تیلگو ، تمل ، کنڑ ، ملیالم وغیرہ کے تحفظ اور فروغ کے لیے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ انٹر پری ٹیشن (آئی آئی ٹی آئی) نامی قومی سطح کے ادارے کا قیام ایک نہایت اہم اور لائقِ ستائش قدم ہے۔ اس طرح کے ادارے کے قیام سے محض چند برسوں میں ہندوستان کی تصویر قابلِ دید اور لائقِ رشک ہو سکتی ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں سے بیشتر زبانیں اپنے بولے جانے والے صوبے ، حلقے یا علاقے تک ہی محدود ہیں۔ ان زبانوں کو عام ہندوستانی باشندے بولنے یا سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس ادارے کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ تمام ہندوستانی زبانوں کے ادب ، فنون ، معاشرت ، تکنیک اور دیگر موضوعات سے متعلق لٹریچر کو تراجم اور تشریح و توضیح کے ذریعے ایک دوسرے تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔

ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جس کی قومی زبان تو ہندی ہے مگر ملک کے دیگر حصّوں میں مختلف زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ زبان یا بھاشا کے علاوہ ہر علاقے کی معاشرت ، تہذیب اور دیگر فنون ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور کسی خطے یا علاقے کے تو بالکل جداگانہ ہیں۔ تیلگو ، تمل ، ملیالم ، کنڑ جیسی زبانوں ، ان کے لٹریچر اور ان کے فنون کو شمالی ہند کے باشندے سمجھ نہیں سکتے۔ اسی طرح دکنی ہند کے باشندے شمالی ہند کی تہذیب و معاشرت اور ادب و فنون سے بڑی حد تک ناآشنا ہیں۔ یہ تو ان زبانوں کی بات ہے جو مخصوص علاقوں اور صوبوں

میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک کی قومی زبان ہندی سے بھی دکن کے کئی صوبوں کے بیشتر باشندے نا آشنا ہیں۔نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اعلیٰ تعلیمی اداروں کے طلبا وطالبات ملک کے مختلف علاقوں کی تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے دور دراز کے علاقوں کا دورہ بھی کریں گے جس کے ذریعے سیاست کو بھی فروغ حاصل ہوگا اور قومی ہم آہنگی کو بھی جلا ملے گی۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ انٹر پری ٹیشن جیسے اداروں کا قیام زبان، فنون اور تہذیبی بیگانگی کو دور کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ اُردو اور ہندی کے ادب وفنون کے علاوہ بنگلہ، مراٹھی، گجراتی جیسی زبانوں کے ادب بھی بہ اعتبار مقدار اور بہ لحاظ افادیت نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔اس لیے ذاتی کوششوں کے علاوہ باقاعدہ سرکاری سطح پر بھی آئی آئی ٹی آئی جیسے اداروں یا دارالترجمہ کے ذریعے باقاعدہ طور پر ہر زبان کے فنون وادب اور دیگر مضامین سے متعلق لٹریچر کو ہر ہندوستانی تک پہنچانے کی اشد ضرورت ہے۔

ترجمہ اور انٹر پری ٹیشن کی حکمتِ عملی سے تمام ہندوستانی ایک دوسرے کی زبان، کلچر اور فنون سے نہ صرف واقف ہوسکیں گے بلکہ تہذیب وفنون اور زبانوں کا تحفظ وفروغ بھی ہوگا۔ ان کے علاوہ تعصب ونفرت اور مغائرت جیسی لعنتوں کو ختم کرکے قومی ہم آہنگی اور حب الوطنی کے جذبات کو بھی تقویت پہنچائی جاسکتی ہے۔ یہی اس نئی تعلیمی پالیسی کے اہم اور بنیادی مقاصد ہیں۔

ہم سب واقف ہیں کہ جب ہمارے ملک میں برطانیہ کا اقتدار تھا اور ہم ہندوستانی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، اس وقت ایک طویل عرصے تک تمام ہندوستانیوں نے مذہب وملت اور فرقہ ونسل سے بالاتر ہوکر آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدّ وجہد کی تھی۔ یہ حب الوطنی کے جذبے ہی کی سرشاری تھی کہ بے شمار جان ومال کی قربانی دینے کے بعد آزادی کے متوالے ملک کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے۔ میرے نزدیک راشٹر پریم یا حب الوطنی کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک جذبہ فطری ہوتا ہے۔ ہم جہاں پیدا ہوتے ہیں، جہاں کی آب وہوا میں ہماری پرورش و پرداخت ہوتی ہے، اس سرزمین سے لگاؤ اور انسیت ہونا فطری بات ہے۔ ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم ہے کہ ماں اور وطن جنت سے بھی پیارے ہوتے ہیں۔ جنت میں جب وشنو بھگوان کی سواری گرُن (गरुण) نامی پرندہ کو اپنے وطن کی یاد شدید طور پر ستانے لگتی ہے تو وہ بھگوان وشنو سے اجازت لے کر اس ویران مقام پر آکر مسرت سے شرابور

اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ہندوستانی زبانوں، علوم وفنون اور تہذیب و معاشرت کے مطالعے کے لیے وظائف اور ہر زبان کے فروغ و تحفّظ کے لیے اکیڈمیوں کے قیام کی تجاویز بھی لائق ستائش ہیں۔ ویب سائٹ اور وکی پیڈیا کے توسط سے بھی ہندوستانی زبانوں، علوم و فنون، تہذیب و معاشرت اور حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے۔

ہو جاتا ہے جو ان کا وطنِ عزیز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان تو کیا جانوروں اور پرندوں کو بھی اپنے ملک اور وطن سے اٹوٹ لگاؤ اور انسیت ہوتی ہے۔ آزادی، وطنی لگاؤ اور ملک پر آنچ آنے کے سبب ہمارے دلوں میں حب الوطن کا جو جذبہ بیدار ہوتا ہے وہی اصل میں حب الوطنی ہے۔ میرے نزدیک حب وطن کی آسان اور عام فہم تعریف فطری طور پر اپنے وطنِ عزیز کے باشندوں اور اپنے ملک کی ہر چیز سے محبت کرنا ہے نہ کہ نفرت وتعصب کو ہوا دینا یا ایک دوسرے سے نفرت کرنا۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت حب وطن کے اسی فطری جذبے سے دلوں کو مزیّن کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کے تحت درجہ پانچ تک کے طالب علموں کو ان کی مادری، مقامی یا علاقائی زبانوں کے توسط یا وسیلے سے تعلیم دینے کی تجویز ہے۔ اگر عملی طور پر یہ ممکن ہوا تو ثانوی اور اعلیٰ درجات کے طالب علم بھی اس سے متاثر ہوں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی دیہات، قصبے یا شہر میں میڈیم کے لحاظ سے اسکولوں کی تعداد کتنی ہوگی یا کتنے ٹیچروں کی تقرری کی جائے گی۔ کیا ایک اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کی مادری زبان ایک ہی ہوگی؟ اگر ان کی مادری زبان مختلف ہوئی اور علاقے یا خطے کی مقامی زبانیں الگ الگ ہوئیں تو مقامی یا علاقائی زبانوں میں تعلیم کا بندوبست کیسے ممکن ہو سکے گا؟ میڈیم کے اعتبار سے کتبِ لغات، ڈکشنریز کی تدوین، ہر مضمون کا نصاب تیار کرانا، کتابوں کی چھپائی اور فراہمی کے علاوہ امتحان اور امتحان کے نتائج تک کے مراحل آسان نہیں ہیں۔ اگر کسی طرح یہ حکمتِ عملی کارگر ہوگئی تو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ درجہ چھ اور اس سے آگے کے درجات کے طالب علم پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔ وہ اس لیے کہ درجہ پانچ کے بعد بیشتر طالب علموں کی تعلیم کا میڈیم تبدیل ہونے کا خدشہ برقرار رہے گا اور پھر ہم اُسی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے جس سے اب تک دوچار ہوتے رہے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں اور علوم و فنون کے فروغ کے علاوہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کی ترقی وترویج کی تجاویز قابلِ قدر ضرور ہیں مگر عہدِ حاضر میں مختلف خطوں، علاقوں، صوبوں کے باشندوں اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی زبانیں، بولیاں اور تہذیبیں جدا جدا ہیں۔ اس لیے سبھی کی زبانوں اور تہذیبوں یا کلچر کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔

پروفیشنل، ٹیکنکل اور سائنس کے میدان میں زبان اور کلچر کا وہ رول نہیں ہوتا جس کی ہم یہاں بات کر رہے ہیں البتہ ابتدائی درجات میں مفید اور سبق آموز کہانیوں، کہاوتوں، حکایتوں، اقوال، ملفوظات وغیرہ کے ذریعے زبان وتہذیب کا تحفظ بھی کیا جا سکتا ہے اور فروغ بھی۔ ہماری زبان جو رفتہ رفتہ کتابی زبان ہوتی جارہی ہے اس میں کہاوتوں محاوروں اور روزمرّہ کے ذریعے نکھار بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ہندوستانی زبانوں، علوم وفنون اور تہذیب و معاشرت کے مطالعے کے لیے وظائف اور ہر زبان کے فروغ وتحفظ کے لیے اکیڈمیوں کے قیام کی تجاویز بھی لائق ستائش ہیں۔ ویب سائٹ اور وکی پیڈیا کے توسط سے بھی ہندوستانی زبانوں، علوم وفنون، تہذیب ومعاشرت اور حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ تخلیقی ادب اور تقابلی مطالعے کے ذریعے بھی موسیقی، فلاسفی اور دیگر علوم وفنون کے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرنے سے بھی زبان وادب اور تہذیب ومعاشرت کو بے شبہ مزید تقویت حاصل ہوگی۔

ہمیں اس طرف بھی توجہ دینا ہوگی کہ عدالتوں کی کارروائیاں ہوں، فیصلے ہوں، تحقیقی وتفتیشی رپورٹس ہوں یا تمام دفتری یا غیر دفتری کام کاج ہوں، جب تک انھیں صرف انگریزی زبان میں تحریر کرنے کا رواج برقرار رہے گا اس وقت تک ہم ہندوستانی زبانوں، علوم وفنون اور تہذیب ومعاشرت سے پوری طرح آشنا نہیں ہو سکتے۔ انھیں دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی تحریر کیا جانا چاہیے۔ میرے نزدیک اعلیٰ درجات، پروفیشنل کورسیز، سائنس اور تکنیکی تعلیم کے شعبوں میں کم از کم ایک ایسے مضمون کی شمولیت ضروری ہے جس کے ذریعے مقامی یا علاقائی زبانوں اور ہندوستانی تہذیب یا بھارتیہ سنسکرتی سے طالب علموں کو آشنا کرایا جائے اور ہم فخر سے کہہ سکیں ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا''

■

DrS hareef Ahmad Quraishi
Jain Mandir Street, Phoota Mahal
Rampur - 244901 (UP)
Mob.: 7906937665

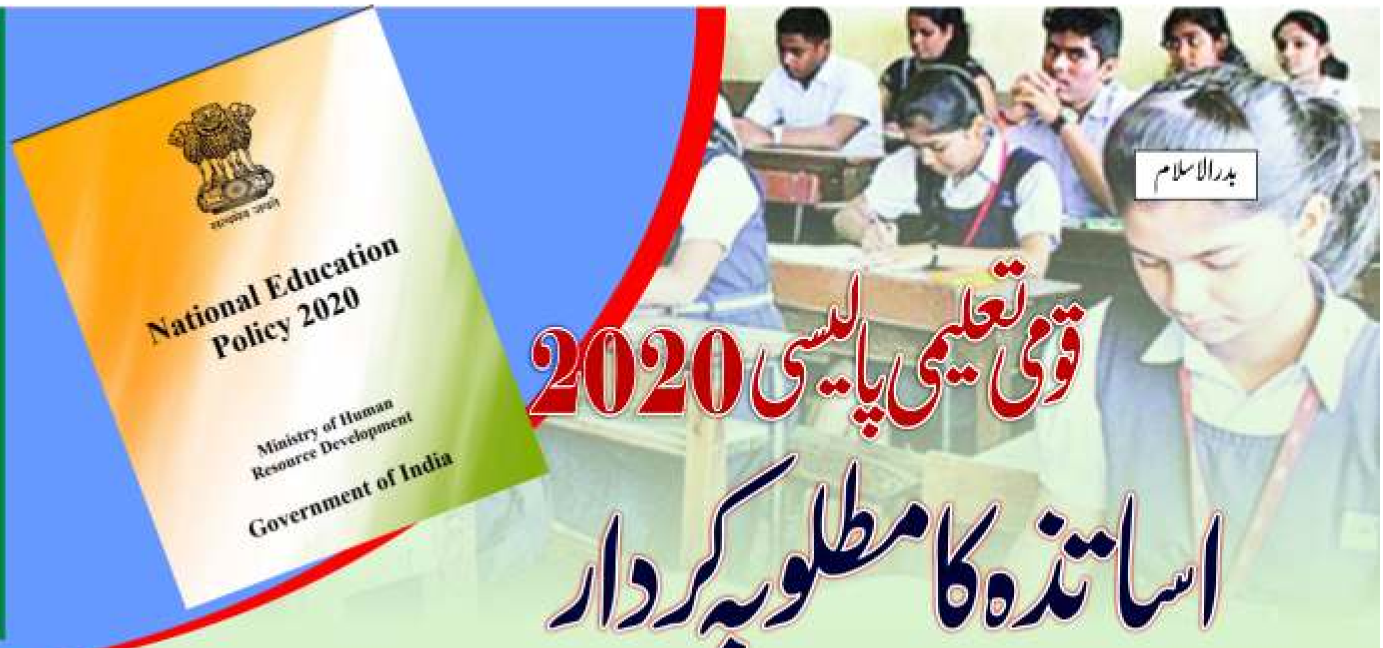

بدرالاسلام

قومی تعلیمی پالیسی 2020
اساتذہ کا مطلوبہ کردار

کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن نے اپنی رپورٹ کی ابتدا ایک بہت ہی معنی خیز جملے سے کی تھی۔ وہ اس طرح سے ہے کہ ''بھارت کا مستقبل اس کے کمرہ جماعت میں تشکیل پارہا ہے''۔ کمیشن آگے کہتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں ''تعلیم ہی قوموں کی خوشحالی بہبود اور تحفظ کی ضمانت دیتی ہے ملک کی تعمیر نو اس بات پر منحصر ہوگی کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں سے کس معیار اور کس تعداد میں افراد باہر آتے ہیں۔''[1]

اساتذہ کے مرکزی کردار کو واضح کرنے کے لیے اس سے بہتر بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ''معیار تعلیم اور قومی ترقی کو متاثر کرنے والے مختلف عوامل میں سب سے اہم ترین عامل معلم کا معیار اس کی اہلیت، صلاحیت واستعداد اور کردار ہے۔[2]

قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے بھی اساتذہ کی حیثیت کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور تحریر کیا ہے کہ ''حقیقت میں اساتذہ ہمارے بچوں کا مستقبل سنوارتے ہیں، اسی لیے وہ قوم کے مستقبل کو بھی بنانے والے ہوتے ہیں۔[3]

قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے اپنے ابتدائیہ میں ہی اس بات کا واضح اعلان کیا کہ اساتذہ کو ہمارے تعلیمی نظام میں بنیادی اصلاحات کا مرکز ہونا چاہیے۔

یہ پالیسی اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ اس کے ذریعے اساتذہ کے وقار اور عزت میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ وہ سماج میں ہر سطح پر عزت واحترام پاسکیں۔ کیونکہ وہ ہماری آنے والی نسلوں کے معمار ہیں۔ ہمیں ہر ممکن طریقے سے اساتذہ کو بااختیار بنانا ہوگا تاکہ وہ اپنے فرائض بہ حسن وخوبی ادا کرسکیں۔ اس لیے کہا گیا کہ پالیسی کے ذریعے کوشش کی جائے کہ ہمارے سماج میں بہترین اور قابل ترین افراد پیشہ تدریس سے وابستہ ہوں اساتذہ کے معیار نگرانی کے ساتھ ان کے احتساب وجائزے کا بھی نظام متعارف کرایا جائے گا۔[4]

ڈاکٹر لادان ثاری ہونے کتنی اہم بات کہی کہ ''کوئی بھی قوم کا معیار اس کے اساتذہ کے معیار سے بلند نہیں ہوسکتا'' ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قوم کے معیار کا راست تعلق اساتذہ کے معیار سے ہے اگر ہم قوم کے معیار کو بلند کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے اساتذہ کے معیار کو بلند ترین سطح پر لے جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ اساتذہ کے رول (کردار) کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہر سماج انھیں بڑا مقام ومرتبہ دیتا ہے۔ تاریخ انسانی اس بات کی شاہد ہے کہ جب جب اساتذہ کو اونچا مقام ملا، انھوں نے ایک بہترین سماج کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیا اور جب اساتذہ کی ناقدری ہوئی تو اس پیشے سے اعلیٰ قابلیت وصلاحیت کے افراد نے منہ موڑا، اور پورے سماج کو اس کی سزا بھگتنی پڑی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اساتذہ کے مقام ومرتبے کا پورا لحاظ رکھا گیا اور اُن کے حالات میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں لانے کی سفارشات کی گئی ہیں۔ دوسری جانب بجا طور پر یہ پالیسی اپنے اساتذہ سے بہت ہی بلند توقعات بھی وابستہ کرتی ہے۔ پالیسی اپنے اصولوں میں اس بات کا ذکر تی ہے کہ ''ہم اس نظام تعلیم کے ذریعے ایک ایسے فرد کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں جو منطقی سوچ اور عمل کا حامل ہو، جو انسانیت کا ہمدرد ہو، دردمند ہو ہم آہنگی کے ساتھ جرات اور حوصلے کا پیکر ہو۔ لچکدار شخصیت کا مالک ہو اور سائنسی طرز عمل کے ساتھ تخلیقیت کے قابل ہو، ان سب کے ساتھ وہ اخلاقی اقدار کا حامل بھی ہو۔ ایک ایسا شہری وجود میں آئے جو اپنے سماج اور معاشرے کو مثبت طریقے سے مالا مال کرے، تاکہ ہم اپنے دستور کی راہ نمائی میں ایک مبنی بر مساوات، شمولیت سے پر اور تکثیری سماج کی تعمیر کرسکیں۔

ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کی توقع بجا طور پر اساتذہ جنھیں پالیسی بجا طور پر ''نظام تعلیم میں بنیادی اصلاحات کا مرکز'' قرار دیتی ہے اُن ہی سے کی جائے گی۔ اس پس منظر میں ہم اساتذہ سے وابستہ نئی توقعات کا جائزہ لیں گے:

(1) کثیر الجہت علوم کا اکتساب (Mulitdisciplinary Learning) اس سے مراد ایسا طرز اکتساب ہے جس میں کئی علوم یا پیشہ ورانہ مہارتوں کو یکجا کرکے زیر بحث امر یا مسئلے کو سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی تیز رفتار ترقی اور درپیش مسائل اور ان مسائل کی مختلف جہات نے اب اس طریقہ اکتساب کو ضروری بنا دیا ہے۔ مثلاً ماحولیاتی مسائل، بڑھتی ہوئی آلودگی، قدرتی وسائل کا تیزی سے ختم ہونا، روز افزوں توانائی کا استعمال، دنیا کی آبادی کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کا کسی ایک شعبہ علم سے تعلق نہیں رہ گیا۔ بلکہ ہر مسئلہ اپنے اندر سائنس، ٹیکنالوجی، اخلاقیات حیاتیات، ماحولیات، معاشیات، وغیرہ کئی جہات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس لیے اُس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کسی ایک شعبہ علم سے مدد نہیں مل سکتی۔ ہمیں بیک وقت کئی علوم سے استفادہ کرنا ہوگا اس لیے اب کثیر الجہت علوم کا سیکھنا بہت بڑی ضرورت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس تبدیلی کے دور رس اثرات اساتذہ کی قبل از ملازمت اور موجودہ اساتذہ کے دوران ملازمت تربیت پر واقع ہوں گے۔ اب اساتذہ کو اپنا ذہنی افق بہت وسیع کرنا ہوگا، اور اس طریقہ اکتساب کے لوازمات سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا ہوگا اس کے لیے انھیں علمی (academic) اور پیشہ ورانہ سطح پر کافی محنت کرنی ہوگی۔

(2) صرف سیکھنا (اکتساب) ہی نہیں بلکہ کیسے سیکھنا (سیکھنے یا اکتساب کے طریقے) علمی دھما کہ کے اس دور میں اب طالب علم سے صرف علوم سیکھنے کی توقع نہیں کی جارہی ہے بلکہ اُسے اب سیکھنے کے طریقے (how to learn) سے واقف کرانا بھی مقاصد تعلیم میں شامل ہو چکا ہے۔

اب طالب علم حصول علم کے لیے پوری طرح معلم پر منحصر نہیں رہ سکتا۔ معلم کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے طلبا کو اس طرح سے تعلیم دے کہ وہ سیکھنے یا اکتساب کا سلیقہ وطریقہ سیکھ لیں۔ تاکہ بعد میں بھی اُن کے حصول علم میں مدد ہو۔ اور وہ جدید ترین تحقیقات اور جدید ترین علوم تک رسائی حاصل کرتے رہیں۔ تاکہ وہ اپنے وجود، کو اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو رفتار زمانہ سے ہم آہنگ رکھ سکیں۔ اور خود کو تاریخ کے کوڑے دان میں جانے سے بچا سکیں۔ اور ''علم حاصل کرو گود سے گور تک'' اس محاورے پر واقعتاً عمل کر سکیں۔ اس کا بہتر واضح اشارہ عالمی قابل بقاء ترقی اہداف 2030 کے ایجنڈے نمبر 4 میں ہے جس میں کہا گیا کہ اب تعلیم کو دیگر خصوصیات کے ساتھ عمر بھر سیکھنے (Lifelong Learning) کے ہدف کو حاصل کرنا ہے۔

(3) تنقیدی سوچ منطقی ذہن اور تخلیقیت: ہمیں ایسے طلبا تیار کرنے ہیں جو لکیر کے فقیر نہ ہوں۔ ہمیں اپنے طلبا میں تدریس کے ذریعے منطقی سوچ، تنقیدی فکر اور تخلیقیت پیدا کرنا ہے۔ آنے والے دنوں میں مواد سے زیادہ ان صلاحیتوں کی ضرورت ہوگی۔ منطقی سوچ سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے ہم درپیش صورت حال کا تجزیہ کرکے ایک معقول حل تلاش کرتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں طلبا میں مسائل کو سمجھنے کے لیے وجوہات جاننے کے عمل / رویے کو پروان چڑھانا ہوگا۔ تاکہ وہ زیر بحث مسئلے کا معروضی جائزہ لے سکیں، اور عقل کو مطمئن کرنے والے نتیجے پر پہنچ سکیں۔ جب ہم مسئلے کے حل کے لیے موجود حقائق کا استعمال کرتے ہیں گویا ہم منطقی عمل کو اختیار کرتے ہیں۔

تنقیدی فکر: اس عمل میں ہم موضوع یا مسئلے کو حقائق کے تجزیے کی روشنی میں سمجھتے ہیں۔ اس کے عام طور پر ذیل کے مراحل ہوتے ہیں

(1) **مشاہدہ**: مسئلے کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اس کی وجوہات جاننا۔

(2) **تجزیہ**: تحقیق کے ذریعے زیر بحث مسئلے پر معلومات اور ڈاٹا جمع کرنا۔ حاصل شدہ ڈاٹا اور معلومات کو سلیقے سے ترتیب دینا اور نتائج اخذ کرنا۔

(3) **پیشن گوئی**: مسئلے کے ممکنہ حل کے بارے میں پیشن گوئی کرنا۔

(4) **حل سے آگاہ کرنا**: حل کو معلوم کرنا اور اُس کو نافذ کرنا۔ اس بات کا تجزیہ کرنا کہ کون سا حل مناسب رہا۔

مسئلہ کا حل: وہ راستے اختیار کرنا جس سے حل کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔[5]

تخلیقیت: کسی نے کیا خوب کہا ہے'' جانور بنے، بنائے راستے پر چلتے ہیں انسان اپنا راستہ خود بناتا ہے'' موجودہ دور میں پرانے گھسے پٹے راستوں پر کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اکثر ہم سنتے رہتے ہیں کہ باکس کے باہر جاکر سوچیے۔ روز افزوں بڑھتی ہوئی مقابلہ آرائی میں اگر ہمارے طلبہ کو باقی رہنا ہے، اور ترقی کرنا ہے، تو اُس کے لیے ضروری ہوگا کہ تخلیقی ذہن کے ساتھ کام کریں۔ نئی چیزوں، نئے راستوں کو متعارف کرائیں۔ اب طلبا کا صرف سابقہ علم ہی ان کے کام نہیں آئے گا۔ اس کے لیے بحیثیت معلم ہمیں درج ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

- طلبا کو نئے خیالات اور نئی چیزوں کی تخلیق کے لیے مستعد رکھیں۔ اس سلسلے میں اُن کو حوصلہ افزائی کریں۔
- اپنے نصاب میں اور تدریس میں اُن کے ذہن وعقل کو مسابقت یعنی چیلنج کے مواقع فراہم کریں۔ مثلاً کسی مسئلے کا حل معلوم کرنا۔
- اپنے طلبا کے سامنے کئی متبادلات رکھیں تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ لینے کے عادی بنیں۔
- ٹاسک پارٹی: مختلف قسم کی اشیا فراہم کرکے انھیں اُس سے نئی شے بنانے کا موقع فراہم کریں۔
- طلبا کی ناکامیوں پر انھیں مایوس نہ ہونے دیں۔ بلکہ حوصلہ دلا کر دیے ہوئے ٹاسک کو پورا کرائیں۔ کیونکہ ہنری مائیس کا کہنا ہے کہ ''تخلیقیت حوصلہ چاہتی ہے''
- طلبا کے تجسس کی قدر کیجیے، اور اُسے بڑھانے کی کوشش کریں۔
- طلبا کے ساتھ اُن کے ذریعے کیے گئے کاموں کا جائزہ لیجیے اور مناسب باز رسی (فیڈ بیک) دیجیے۔
- اس طریقہ کار کو اپنا کر طلبا 'مسئلہ حل' کرنے کی کامیاب کوشش کرسکتے ہیں۔[6]

(5) **ہم آہنگی اور حالات سے مطابقت پیدا کرنا**: اب وہ شخص کامیاب ہوگا جو تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کرتے ہوئے نئی، نئی معلومات اور ٹیکنالوجی سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرے گا۔ اب ضروری نہیں ہے کہ ہم نے کالج یا یونیورسٹی میں جو علم حاصل کیا وہ ہمیں پوری زندگی کام آجائے۔ اسے آپ مختلف میدانوں میں دیکھ سکتے ہیں مثلاً مواصلاتی انقلاب، کمپیوٹر ہارڈ ویر اور سافٹ ویر کی ہوش ربا ترقیاں وغیرہ۔

(6) **تجربی اکتساب**: اس سے مراد تجربے سے ماخوذ اکتساب ہے۔ اس میں ہم اپنے اعمال کا جائزہ لے کر سیکھتے ہیں۔ تجربی اکتساب ہمارے مروجہ اکتساب، جس میں صرف اور صرف حافظے پر زور ہوتا ہے اور جس میں ہم بغیر سمجھے صرف رٹنے پر زور دیتے ہیں، اُس سے قطعی مختلف ہے۔ اس عمل میں معلم کی راہ نمائی میں طالب علم خود عملاً سیکھنے کے عمل کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ تجربات کے ذریعے سیکھتا ہے۔ اور اپنے اعمال کا مستقل جائزہ لے کر کمزوریوں کو دور کرتا رہتا ہے۔ اس کا تعلق اُس کے اعلیٰ ذہنی اعمال سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے تجربات مہیا کرنا معلم کے لیے بہت مشقت طلب ہوتا ہے۔

یہ نفسیات کے مسلمہ اصول'' کرکے سیکھنے'' (Learning by doing) کی عملی تعبیر ہے۔

(7) **طالب علم مرکوز رویہ**: یہ بات عرصہ دراز سے پڑھائی جارہی ہے کہ ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو طالب علم مرکوز بنانا ہے۔ اب استاد کا رول صرف لیکچر دینا، یا سبق پڑھا دینا ہی نہیں جس میں وہ خود بولتا رہے اور طلباء صرف سنتے رہیں بلکہ اب معلم ایک صلاح کار، سہولت کار اور راہ نما ہوگا طلبا اب مرکز توجہ ہوں گے۔

(8) **بحث ومباحثہ**: اب معلم سے یک طرفہ لیکچر/تقریر کے بجائے اکتسابی عمل میں طلبا کی زیادہ سے زیادہ شمولیت کو یقینی بنانا مطلوب ہے۔ اس کا ایک اہم ذریعہ موضوع سے متعلق طلبا کے ساتھ بحث ومباحثے کا انداز ہے۔ طلبا موضوع پر ممکنہ تیاری کریں اور استاد کی راہ نمائی میں مباحثہ ہو۔

(9) **لچک دار اور دلچسپ تدریس**: ٹیکنالوجی کے بڑھتے اثرات اور معلومات کا عام ہونا (انٹرنیٹ کے ذریعے سے) اس بات کا متقاضی ہے کہ معلم اپنی تدریس کو لچک دار بنائے۔ اب 'چاک اینڈ ٹاک' کا دور ختم ہوگیا۔ اب نئی نسلوں کی دسترس میں جو ٹیکنالوجی ہے، اُس نے اساتذہ کے کام کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اُن کی دلچسپی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ''کاش کہ اسکول کی پڑھائی بھی ٹی وی سیریل کی طرح دلچسپ ہوتی۔'' یہ ایک نہم کے طالب کا جملہ ہے جو ہماری موجودہ روش پر ایک بھرپور تبصرہ ہے۔ اور اساتذہ کے لیے لمحہ فکریہ۔

(10) **اجتماعی اکتساب**: اب کلاس میں جاکر لیکچر دینے سے کام نہیں چلے گا۔ جس میں صرف معلم فعال ہے اور طلبا غیر فعال بیٹھ کر سن رہے ہیں۔ اب اجتماعی اکتساب کے طریقے کو اپنانا ہے، جس میں ہر فرد کے وسائل اور مہارتوں سے پوری جماعت فائدہ اُٹھاتی ہے۔ اس کے ذریعے طلبا کی اعلیٰ ذہنی تربیت کا سامان ہوگا۔ اُن کے ابلاغ و ترسیل کی صلاحیت پروان چڑھے گی۔

قائدانہ صلاحیتوں کی پرورش ہوگی۔ اس طریقے کے ذریعے طلبا میں احساس ذمے داری بڑھے گی۔ اُن کی خود نمائی کے اظہار کا مناسب موقع فراہم ہوگا، اور انھیں تعلیمی سلسلے سے جڑے رہنے میں مدد ہوگی۔ آپ غور کریں تو ہمیں اب ان ساری صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے اجتماعی اکتساب کے ذریعے ہم کئی سارے فوائد حاصل کرسکتے ہیں۔

(11) **سوالات کی حوصلہ افزائی:** طلبا کو خاموش بیٹھا کر انھیں لیکچر سنا دینا آسان ہوتا ہے۔ اکثر اساتذہ طلبا کو سوالات سے باز رکھتے ہیں۔ بلکہ اسے خلاف ادب قرار دیتے ہیں۔ اس سے طلبا کی ذہنی نشو ونما میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ طلبا کے سوالات کا سامنا کرنے سے اساتذہ خوف کھاتے ہیں، یا انھیں اس کے لیے بہت زیادہ تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ وجہ جو بھی ہو، اب سے بات بننے والی نہیں ہے۔ اب طلبا کے سوالات پر نہ صرف حوصلہ افزائی کرنی ہے، بلکہ انھیں سوالات کرنے کے لیے اکسانا ہے۔

(12) **کردار سازی:** طلبا کی کردار سازی زمانہ قدیم سے تعلیم کا ایک اہم مقصد رہا ہے۔ کتابوں کی حد تک یہ آج بھی برقرار ہے۔ مگر عملا اس پر ضروری توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ جس کا نتیجہ ہم آنکھوں سے آج پورے سماج میں دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم پیشے میں ماہر افراد (Professionals) تو پیدا کر رہا ہے مگر 'اچھے انسان' بنانے میں بری طرح ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے لیے اساتذہ کو خود سب سے پہلے رول ماڈل بننا ہوگا۔ اور تعلیم کے اس نظر انداز پہلو پر بھر پور توجہ دینی ہوگی۔

- قومی تعلیمی پالیسی 2020 اس سلسلے میں واضح طور پر کہتی ہے کہ ''تعلیم کو لازماً کردار سازی کرنی ہوگی۔ طلبا کو اعلیٰ پسندیدہ اخلاقیات سے آراستہ کرنا ہوگا۔ انھیں عقلیت پسند بنانے کے ساتھ اُن کے اندر انسانیت کے تئیں ہمدردانہ جذبہ بیدار کرنا ہوگا''

(13) **مناسب اور مطمئن کرنے والی معاشی مصروفیت:** اساتذہ سے اب اس پہلو سے توقع کی جارہی ہے کہ وہ اس طرح تعلیم دیں کہ طالب علم فراغت کے بعد ایسی معاشی مصروفیت اختیار کر سکے جس سے اُسے اطمینان بھی ہو اور اُس کی صلاحیت کا بھر پور استعمال بھی۔ اس وقت ہمارے ملک میں ملازمت سے متعلق جو سروے ہیں وہ بڑے تشویش ناک ہیں۔ 10 تا 12 سال کی اسکولی تعلیم اور 3 تا 5 سال کی اعلیٰ تعلیم کے بعد بھی طالب علم کا کسی ملازمت کے قابل نہ بن پانا، ہمارے تعلیمی نظام کے لیے سوالیہ نشان ہے۔

(14) **تصورات (Concepts) کی فہم پر زور:** اس سے مراد اس قسم کی تدریس ہے جس کے ذریعے معلم طالب علم کو کسی مضمون یا پیشے کا ایسا مجموعی فہم دے جس کے ذریعے وہ اُس مضمون کے تمام اجزا اور اُس کی خصوصیات اور ان کے درمیان رشتوں کو سمجھ کر انھیں ایک اکائی سمجھے۔ تصورات کی فہم جتنی واضح ہوگی اتنا ہی طالب علم اُس مضمون میں ترقی کرے گا۔ ہمارے موجودہ رٹنے اور صرف امتحان کی تیاری کے لیے پڑھنے کے رواج کو بالکل ختم کرنا ہوگا۔ اس کے لیے اساتذہ کو خود نفس مضمون پر خوب محنت کرنی ہوگی اور سب سے پہلے اپنے تصورات کو درست کرنا ہوگا۔[7]

(15) **دستوری و انسانی اقدار کا فروغ:** طلبا میں بحیثیت معلم ہمیں درج ذیل انسانی و دستوری قدروں کو فروغ دینا ہے۔ مثلاً کامل ذہنی ہم آہنگی، تاکہ معروضی ادراک و احساس کا حق ادا ہو سکے۔ دوسروں کی ذات، مذہب، زبان اور تہذیب کا احترام، صفائی،

خوش اخلاقی، جمہوری طرز زندگی، خدمت کا جذبہ، عوامی پراپرٹی کی حفاظت، سائنسی طرز فکر، آزادی، حریت، ذمے داری کا ادا کرنا اور بھارت کی تکثیریت، مختلف ثقافتی اکائیوں کی انفرادیت کا احترام انصاف اور مساوات وغیرہ۔

(16) **کثیر لسانی کلچر کا فروغ اور زبانوں کی طاقت کا احساس** کرنا اور نظام تعلیم کے ذریعے اس کو حاصل کرنا اس کے لیے معلم کو سب سے پہلے خود ایک سے زائد زبانوں میں ضروری مہارت پیدا کرنی ہوگی۔

مادری زبان کی اہمیت یقیناً اپنی جگہ پر اس کے ساتھ بین الاقوامی مسابقت کے لیے ہمیں اپنے طلبا میں ایک سے زائد زبانوں میں مہارت پیدا کرنی ہوگی۔ ہائی اسکول کی سطح سے مادری زبان اور انگریزی کے استعمال کو بڑھاوا دینا پیش نظر ہے۔ وہیں اعلیٰ تعلیم کو مادری زبان/ بھارتی زبانوں میں فراہم کرنے کا بھی پروگرام ہے۔

(17) **زندگی کی مہارتیں:** قومی درسیاتی خاکہ 2005 کے بعد اس پر توجہ دی گئی مگر ہنوز بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔

بین الاقوامی سطح پر UNESCO بھی اس سلسلے میں سرگرم ہے۔

(18) **طالب علم کی انفرادیت کا احترام اور اُسے اُس کی مخصوص صلاحیتوں میں ترقی دینا:** ہمارا نظام تعلیم جہاں طالب علم مرکوز ہوگا وہیں ہر طالب علم کی انفرادیت کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ تاکہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار، لاکر اپنی ذات اور سماج اور انسانیت کے لیے مفید تر ثابت ہو سکے۔

(19) **طلبا کی جذباتی اخلاق** اور سماجی نشو و نما پر بھی اساتذہ سے خصوصی توجہ مطلوب ہے۔

(20) **طلبا کی جانچ اور تعین قدر میں انقلابی تبدیلیاں** متوقع ہیں۔ تشکیلی اور مجموعہ جانچ سے آگے بڑھ کر اب امتحانات میں رٹے ہوئے سوالات کے جوابات کی بجائے تنقیدی سوچ اور تصورات کے فہم پر مبنی سوالات ہوں گے۔ اب جانچ اکتساب کے لیے ہوگی۔ طلبا کا رپورٹ کارڈ کثیر المقاصد اور کثیر الجہت ہوگا۔

(21) **بین الاقوامی شہری بنانا:** طلبا کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر درپیش مسائل سے آگاہ کرنا اور اس کے حل کے لیے انھیں تیار کرنا تاکہ وہ ایک بہتر بین الاقوامی شہری بن سکیں اور اُن میں وسعت نظر پیدا کی جا سکے۔

مندرجہ بالا امور کے علاوہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اساتذہ سے ذیل کے کاموں کی انجام دہی کی توقع کی گئی ہے۔

- تعلیمی رضا کار (Educational Voluntrees) سے ربط اور تعاون کرنا۔
- تعلیمی صلاح کار سے معاونت کرنا۔
- قومی بنیادی تعلیمی قابلیت کے مشن میں شرکت۔
- ذہین طلبا پر خصوصی توجہ اور انھیں ان کی دلچسپی کے میدان میں ممکنہ حد تک ترقی دینا۔ اس کے لیے انھیں اُس میدان کے وسائل اور معلومات فراہم کرنا۔ ذہین طلبا کے لیے قومی سطح کے رہائشی گرمائی کیمپ/ اولمپیاڈ میں ہر طرح سے تعاون کرنا۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے واضح کیا ہے کہ اب تعلیمی عمل کے ماحصل پر بہت زیادہ توجہ دی جائے گی۔

اساتذہ سے وابستہ ان توقعات کو پورا کرنے کے لیے بجا طور پر بہت قابل باصلاحیت اور ڈائنامک اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے پالیسی یہ بھی کہتی ہے کہ اب صرف بہت زیادہ بہترین اور قابل ترین افراد ہی کو پیشہ تدریس میں داخل ہونے کی اجازت ہوگی اور اُن کے مستقل پیشہ ورانہ ارتقا کی کوشش ہوگی۔ اور بجا طور پر ایسے اساتذہ جو کہ معماران قوم ہوں گے اُن کو سماج میں ہر سطح پر اہمیت اور عزت اور احترام کا مقام دیا جائے گا۔ اُن کی تمام ضرورتوں کا بھر پور ادراک کیا جائے گا۔ ملازمت کو بہتر کیا جائے گا ان اساتذہ کو ہر طرح سے بااختیار بنایا جائے گا۔ انھیں ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے درکار آزادی دی جائے گی اور بجا طور پر ان سے مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے باز پرس کی جائے گی۔

حوالہ جات

1 کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن رپورٹ شائع کردہ این سی ای آر ٹی 1970 ص2
2 ایضاً ص74
3 قومی تعلیمی پالیسی 2020 شائع کردہ وزرات فروغ انسانی وسائل 2020، ص20
4 ایضاً ص4
5 www.indeed.com
6 www.theartofeducation.edu
7 www.sciencedirect.com

■

Dr. Badrul Islam
Asst. Prof., Maulana Azad National Urdu University, College of Teacher Education
D R P Education/ Mahmoodpur, Roza Bagh
Aurangabad - 431001
Mob.: 9860954935

تعلیمی دائرے میں وسعت کا رجحان

محمد فیروز عالم

تعلیم ہر قوم کی بنیاد ہوتی ہے، جو قوم کو دولت، معاشرتی استحکام اور سیاسی قابلیت دیتی ہے۔ تعلیم لوگوں کو ملازمت کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ایک اچھا انسان بننے میں بھی مدد دیتی ہے۔ تعلیم یافتہ ہونا کسی بھی ملک کی ترقی و استحکام کے لیے ضروری ہے۔ تعلیم میں سرمایہ کاری بہتر اور پڑھی لکھی لیبر فورس، پیداواری صلاحیتوں اور ہنرمند ورکرز میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ ترقی یافتہ ممالک میں معاشی و معاشرتی ترقی کی بنیاد ہے۔ تعلیم حکومت اور عوام دونوں کو برابر کا نفع دیتی ہے۔

آزادی سے پہلے ہمارے ملک میں تعلیم اعلیٰ طبقے تک محدود تھی نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے ہر ایک شعبے میں اعلیٰ طبقے کا دبدبہ بڑھتا گیا اور کمزور طبقے کے فرد مزید پچھڑتے گئے اور اونچ نیچ کا فرق بڑھتا گیا۔ حالانکہ جمہوریت اس طرح کی سماجی اور معاشی تفریق کی مخالف ہے۔ اس تفریق کو ختم کرنے اور سبھی طبقوں کے بچوں اور نوجوانوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے یکساں مواقع اور سہولتیں مہیا کرانا ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں یکساں مواقع پر سب سے پہلے کوٹھاری کمیشن (1964-66) نے غور و خوض کیا۔ کمیشن نے مشورہ دیا کہ یکساں مواقع کی عام سہولتیں فراہم کرنے کے لیے سب سے پہلے 6 سے 14 سال کی عمر کے بچوں کی درجہ 1 سے درجہ 8 تک کی تعلیم لازمی اور مفت دی جائے اور کسی بھی طبقے کے بچوں کی تعلیم حاصل کرنے میں آنے والی مشکلات دور کی جائیں۔ ساتھ ہی ملک کے سبھی طبقے کے بچوں، نوجوانوں کے لیے ان کی دلچسپی، رجحان، اہلیت اور ضرورت کے مطابق اس سے آگے کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور کسی بھی طبقے کے بچوں، نوجوانوں کو اس تعلیم کو حاصل کرنے میں آنے والی پریشانیوں کو دور کیا جائے۔ بس یہیں سے ہمارے ملک میں تعلیم کے یکساں مواقع کا ایک نیا معنیٰ شروع ہوا۔ اسے درج ذیل طریقے سے بھی کہہ سکتے ہیں۔ تعلیمی مواقع کی یکسانیت کا معنیٰ ہے حکومت ملک کی طرف سے سبھی بچوں کے لیے مقام، ذات، مذہب یا جنس وغیرہ کسی بھی بنیاد پر تفریق کیے بغیر ایک متعین سطح تک کی تعلیم لازمی اور مفت مہیا کرانا اور ان کو اس تعلیم حاصل کرنے میں آنے والی رکاوٹ کو دور کرنا ساتھ ہی ملک کے بھی بچوں اور جوانوں کو اس سے آگے کی تعلیم ان کی دلچسپی، رجحان، اہلیت اور ضرورت کے مطابق فراہم کرانا اور ان کی اس تعلیم کو حاصل کرنے میں آنے والی پریشانیوں سے نجات حاصل کرانا۔

تعلیمی مواقع میں یکسانیت کی ضرورت

آج پوری دنیا انسانی حقوق کے تئیں سنجیدہ ہے۔ دنیا کے سبھی ممالک میں تعلیم کو انسان کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ کسی بھی ملک میں سبھی کو تعلیم حاصل کرنے کی یکساں سہولت ہونی چاہیے۔ جمہوری ممالک میں تو یہ اور بھی لازمی ہے، بغیر اس کے جمہوریت بے معنیٰ ہے۔ ہمارے جمہوری ملک میں تو اس کی اور زیادہ ضرورت ہے۔

جمہوریت کے تحفظ کے لیے: جمہوریت کی کامیابی اس کے شہریوں پر منحصر کرتی ہے۔ اس کے شہریوں کی اہلیت اور قابلیت تعلیم پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لیے ملک کے ہر ایک شہری کو تعلیم یافتہ بنانا لازمی ہے اور اس شعبہ میں ہمارے ملک کی صورت بڑی چیلنجنگ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی آبادی بہت زیادہ ہے اور وسائل بہت کم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملک کے آدھے سے زیادہ لوگ غریب ہیں، اپنے بچوں کی تعلیم کو پورا کرنے میں نااہل ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس کی زیادہ تر آبادی گاؤں میں رہتی ہے، ریگستانی اور پہاڑی علاقوں، جنگلوں میں رہنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ اس لیے ضروری یہ ہے کہ غریب اور دور دراز میں رہنے والوں کو تعلیمی سہولتیں فراہم ہوں، انھیں جمہوری اقدار کے بارے میں معلومات فراہم کرائی جائیں اور ان میں سوچنے سمجھنے اور فیصلہ لینے کی صلاحیت کو فروغ دیا جائے۔

فرد کی شخصیت کے فروغ کے لیے: جمہوریت شخص کی شخصیت کا احترام کرتی ہے اور ہر ایک شخص کو اپنے فروغ کے لیے آزاد مواقع فراہم کرتی ہے اور ہمارے ملک کی صورت یہ ہے کہ اس کی آدھے سے زیادہ آبادی پسماندہ ہے، غریب ہے، اچھی تعلیم سے محروم ہے۔ اگر ہم واقعی اپنے ملک کے ہر ایک فرد کے لیے فروغ کے مواقع فراہم کرانا چاہتے ہیں تو پہلی ضرورت یہ ہے کہ سبھی کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع اور سہولیتیں فراہم کریں۔

تفریق کو ختم کرنے کے لیے: طبقاتی تفریق کو ختم کرنے کے لیے سبھی طبقوں کے بچوں اور نوجوانوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے یکساں مواقع اور سہولیتیں فراہم کرانا لازمی ہے۔ ہمارے آئین میں صاف طور پر یہ کہا گیا ہے کہ حکومت کے ذریعہ مالی امداد حاصل شدہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں کسی بھی شہری کو مذہب اور خاندان یا ذات کی بنیاد پر داخلے سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

سماج کے فروغ کے لیے: جمہوریت سماجی تفریق کی مخالف ہے، وہ پورے قوم کو ایک سماج مانتی ہے اور

اسے مہذب اور شائستہ سماج کے طور پر فروغ دینے میں یقین رکھتی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ملک کے ہر ایک شہری کو تعلیم یافتہ نہیں بنایا جاتا۔ اس کے لیے ہمارے ملک میں تعلیمی مواقع کی یکسانیت کی بہت ضرورت ہے۔

ملک کے معاشی فروغ کے لیے: کسی بھی ملک کی معاشی ترقی دو چیزوں پر منحصر ہوتی ہے۔ قدرتی وسائل اور انسانی وسائل۔ جہاں تک قدرتی وسائل کی بات ہے یہ قدرت کی دین ہے، لیکن انسانی وسائل کا فروغ تعلیم کے ذریعے ہوتا ہے اور جس ملک میں جتنی زیادہ اور اعلیٰ قسم کی تعلیم کی سہولیتیں ہوتی ہیں۔ وہ ملک اتنا ہی تیزی سے معاشی ترقی کرتا ہے۔ اس لیے لازمی ہے کہ جن تک تعلیم نہیں پہنچ پارہی ہے ان تک تعلیم پہنچے اور ان کے تعلیم حاصل کرنے کی راہ میں جو دشواریاں آئیں انھیں دور کیا جائے۔ یہی تعلیمی مواقع کی یکسانیت کا معنیٰ ہے۔

یہ تعلیم ہی ہے جو 'دوسروں کی مدد کرنے' دوسروں کی خدمت کرنے اور کسی کو دوسرے کا حصہ نہ چھیننے دینے جیسی اعلیٰ انسانی قدروں کو پروان چڑھاتی ہے۔ یہ علم اور تفہیم ہے جو تعلیم و تعلم سے آتی ہے اور جو انسان کو اس کا شعور دیتی ہے کہ مہاتما گاندھی صحیح تھے۔ جب انھوں نے کہا کہ ''فطرت ہر آدمی کی ضروریات پوری کرسکتی ہے مگر کسی کی لالچ کو پورا نہیں کرسکتی''۔ جب کروڑوں لوگ بھوکے سوتے ہوں، بیمار ہوں اور ہر طرح کی محرومی کا شکار ہوں اور ایسے میں دنیا کے اندر ایسے لوگ بھی ہوں جن کا لائف اسٹائل ایسا ہے کہ اگر اس کو سب لوگ اختیار کرلیں تو ایسی پانچ اور زمینوں کی ضرورت پڑ جائے۔ تو کیا ان کو یہ اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ دنیا کے مستقبل کا فیصلہ کریں۔

صرف تعلیمی بیداری ہی لوگوں کو ان تبدیلیوں کے اثرات سے آگاہ کرسکتی ہے جو گلوبلائزیشن کے نام پر لائی جارہی ہیں۔ تعلیم ہمیشہ تبدیلیوں کے اسباب و محرکات کو بتاتی ہے۔ ان کا جائزہ لیتی ہے اور معاشرہ اور قوم کے لیے اس کی دلالتوں کا ادراک کرتی ہے۔ علم و تعلم اور زندگی میں قوم کو آگے بڑھنا سکھاتی ہے۔ تعلیم اس لیے نہیں دی جاتی کہ حالتِ موجودہ کو برقرار رکھنا سکھائے۔ یہ متحرک زاویہ اس طرح بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ مدارس کی ایک بڑی تعداد ہے جو دینی تعلیم کے ساتھ سیکولر تعلیم دینے کے لیے بھی تیار ہوگئی ہے۔ وہ مدرسے جو صرف مذہبی تعلیم دیتے ہیں ان کو بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ تمام مذاہب برابر ہیں اور اس حقیقت کے برخلاف کوئی نظریہ رکھنے والوں کے لیے دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں اور کہیں بھی مذہبی ہم آہنگی اور سماجی بھائی چارہ کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ملے گی۔

اب شدت کے ساتھ یہ احساس ہورہا ہے کہ جب ہندوستان آزاد ہوا تو تعلیم کو عام کرنے، اس کی تشہیر و تبلیغ کرنے کی جگہ اسے عام کرنے کے دیسی وسائل و ذرائع سے اعراض برتا گیا۔ اگر اعراض نہ کیا جاتا تو یقیناً ہر قوم میں تعلیم کے لیے زیادہ سازگار ماحول پیدا ہوتا۔ عملاً ہر ملک میں جدید تعلیم مذہبی تعلیم کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اس کے لیے پہلے دیسی تعلیم ہوتی تھی پھر جدید تعلیم۔ مدرسے کے نصاب کا جائزہ لیا جاسکتا ہے کہ کیا اس میں دیسی تعلیم کی تفصیلات آجاتی ہیں یا نہیں خاص کر سائنس اور ریاضی میں جو کہ اسلامی تہذیب کی خاص دین ہے۔ مذہبی تعلیم اور سیکولر تعلیم کے مابین رابطے استوار کرنے کے لیے ایک کام یہ ہوسکتا ہے کہ تھنک ٹینک قائم کیے جائیں، سروے کیے جائیں، مطالعات کیے جائیں اور بیداری لانے کے لیے لٹریچر اور تحقیق کے نتائج شائع کیے جائیں۔ اس قسم کی سرگرمیاں مختلف جگہوں پر کی جائیں۔ روشن خیال مسلمانوں کی جانب سے اعلیٰ و ادنیٰ طبقات میں سے ہر ایک کو یہ بتانے کی شدید ضرورت ہے کہ جدید تعلیم کتنی اہم ہے اور قوم کو اس سے کیا فائدے حاصل ہوں گے۔

یہ تعلیم ہی ہے جو 'دوسروں کی مدد کرنے' دوسروں کی خدمت کرنے اور کسی کو دوسرے کا حصہ نہ چھیننے دینے جیسی اعلیٰ انسانی قدروں کو پروان چڑھاتی ہے۔ یہ علم اور تفہیم ہے جو تعلیم و تعلم سے آتی ہے اور جو انسان کو اس کا شعور دیتی ہے کہ مہاتماگاندھی صحیح تھے۔ جب انہوں نے کہا کہ ''فطرت ہر آدمی کی ضروریات پوری کرسکتی ہے مگر کسی کی لالچ کو پورا نہیں کرسکتی''۔

مذکورہ پہلو سماج کے مختلف طبقات کے ساتھ گفتگو اور تعامل کے نتیجے میں سامنے آئے۔ اس میں کئی قابل لحاظ اختلافات ہوسکتے ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ان میں سے کئی اختلاف ہوسکتا ہے کہ تعلیمی ترقیاں، قوم کی توقعات اور امیدیں کیا ہیں۔ کون سے میدانوں میں زیادہ خلا ہے وہ ممکنہ اقدامات اور سرگرمی کیا ہوسکتی ہے جو مثبت سمت میں ٹھوس تبدیلی لائے اور سماج کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کرسکے۔ یہ یاد کرنا بھی مناسب ہوگا کہ قوم کے اندر ان دانشوروں کے درمیان فکر کی لہر کیوں کر بدلی جن کی فہم، ارادے اور نظریے پر سوال نہیں اٹھائے جاسکتے۔ یہ بہت اچھی طرح سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کا ہر طبقہ دینی تعلیم کو اہمیت دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی مانتا ہے کہ جدید تعلیم کی اہمیت و افادیت کیا ہے۔ البتہ ہوسکتا ہے کہ بعض طبقے بے شعوری کے باعث اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے سلسلے میں مشکوک ہوں وہ سمجھتے ہوں کہ مستقبل میں یہ تعلیم ان کو خراب کردے گی۔ یہ بات عجیب وغریب لگے گی لیکن بعض مخصوص حالات میں واقعی ایسا ہوسکتا ہے کہ بعض جگہ مذہبی مقامی اثرات جدید تعلیم کے حق میں نہ ہوں، اس لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ صرف کمیونٹی کے کچھ خاص طبقات کی بجائے مسلم علما کے درمیان جدید تعلیم کی اہمیت وضرورت کا احساس عام کیا جائے۔

اس کے لیے ضرورت ہوگی کہ مسلسل رضا کارانہ محنت کی جائے اور اس میں روشن خیال افراد جن میں منتخب نمائندے بھی ہوں، رائے بنانے والے لوگ بھی ہوں اور مذہبی افراد بھی ہوں۔ ان علاقوں میں جہاں مخلوط مسائل ہوں اسی طرح کا اقدام آسان ہے۔ لیکن جہاں خالص مسلم آبادیاں ہیں وہاں زائد محنت کی ضرورت ہوگی۔ استاد، دانشور اور مقامی معززین پورے منظرنامے کو چند مہینوں میں بدل سکتے ہیں۔ اس کو عملاً بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ کی مدد حاصل ہو اور وہ چلنے والے اسکول قائم کرے جن میں کافی تعداد میں استاد اور سہولیات ہوں۔ مزید یہ کہ اسکول کو لوگوں سے تعارف لینے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ یہ تعاون انفرااسٹرکچر کا بھی ہوسکتا ہے۔ استادوں کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے اور مہارتیں لے کر بھی ہوسکتا ہے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ اس ملک کے ساتھ بعض چیزیں مخصوص ہیں۔ یہ شروع سے ہی دوسروں کو قبول کرنے والا ملک رہا ہے جس کی تعلیم تمام مذاہب اور عقائد میں دی گئی ہے۔ اس طرح یہ بہت ضروری ہے کہ سبھی کو سب مذاہب کی بنیادی تعلیمات کا علم ہو۔ اس سے سماجی بھائی چارہ اور مذہبی ملاپ کو تقویت ملے گی۔ اس سے ہر مذہب کے لیے احترام بڑھے گا اور سب ایک دوسرے کو مساوی سمجھیں گے۔ ان قدروں کو آگے بڑھانے کا سب سے بڑا ذریعہ تعلیم اور تعلم کا منہاج ہے۔ اس میں مادی تعلیم بھی شامل ہے اور روحانی بھی اور روحانیت کے عظیم پہلوؤں کی فہم بھی۔ ہر مذہب میں ان دونوں کو ہی اہمیت دی گئی ہے۔ اس لیے نوجوانوں کو مذہبی تعلیم بھی دی جانی چاہیے۔ ایک بڑے سیکولرسٹ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر نے اس بارے میں کہا ہے۔

''میں یقین رکھتا ہوں کہ مذہب انسانوں کے لیے بہت ضروری ہے، مذہب ختم ہوا تو سماج بھی ختم ہوجائے گا۔''

مذہب اور نظریہ جتنا انسان کو ڈسپلن دے سکتا ہے اتنا کوئی حکومت نہیں دے سکتی۔ بعض لوگ تو یہاں تک

آج کل نالج کے میدان میں سیکولرزم کے معنی ہیں کہ حقیقی نالج یا سائنس کو مشاہدہ، تجربہ اور ذہانت پر مبنی کیا جائے۔ اس کو مذہب و عقیدہ کی مداخلت سے آزاد رکھا جائے۔ تعلیم میں سیکولرزم کا مطلب ہے ایسا تعلیمی نظام جو عقلیت، تجربیت اور سائنسی روح کے ساتھ مرتب کیا جائے۔سیکولر ایجوکیشن پبلک تعلیم کا وہ نظام ہے جو سیکولر ملکوں نے اختیار کیا ہے۔ جس میں مذہب اور ریاست کو الگ رکھا جاتا ہے۔ سیکولر ایجوکیشن کی ایک وسیع تعریف میں یہ بھی آتا ہے کہ ایسی کلچرل تعلیم ہو جو ایک شہری کو دی جائے اور اس سے وہ ایک مضبوط سیکولر سوسائٹی میں پروان چڑھے۔

کہتے ہیں کہ ایک سچا مذہبی انسان ہی سچا سیکولر بھی ہوسکتا ہے۔ معاصر تناظر میں اس تعبیر کو سبھی دانشوروں نے تسلیم کیا ہے،فلاسفہ اور اسکالر بار بار اس کو لوگوں کے فائدہ کے لیے بیان کرتے رہتے ہیں۔ ہر مذہب کے اپنے معتقدات ہیں۔ جو اسے دوسروں سے ممیّز کرتے ہیں جب مذہب کے روحانی پہلو پر بات ہوتی ہے تو صوفیا یکساں باتیں کرتے ہیں اور ان کے جوہر بھی بتاتے ہیں۔ان پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ہر عمر کے پڑھنے والوں کو تعلیم کے مواقع ملنے چاہئیں تا کہ سب کو پتہ چلے کہ دوسرے میں ان سے کیا کیا مشابہتیں اور کیا کیا اختلافات ہیں۔ اسی طرح بیسویں صدی کی سائنسی ایجادیں، شک اور غیر یقینی کے زمانہ نے آدمی کو اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی بھروسہ مند بنایا۔ نتیجتاً آدمی سیکولر طریقۂ کار کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگیا۔ دوسری طرف کسی قدر یہ بھی درست ہے کہ بظاہر ایک دوسرے سے جدا نظر آنے والے مذہب اور سیکولرزم حقیقت میں ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بہت مشکل ہے۔ مثال کے طور پر کھانا اور نہانا بظاہر بالکل سیکولر حرکات معلوم ہوتی ہیں لیکن اس شخص کے لیے جو ان کو مذہبی تقدس کے ساتھ انجام دیتا ہے، یہ مذہبی امور ہوں گے۔ اسی طرح نماز اور گیان دھیان خالص مذہبی امور معلوم ہوتے ہیں مگر مختلف کلچروں کے حساب سے ان کو دیکھا جائے تو یہ سیکولر امور معلوم ہوں گے۔ اسی طرح انگلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کناڈا اور جاپان میں یونیورسٹیاں اور اکثر حکومت کے ذریعے چلائے جارہے پرائمری اور سیکنڈری اسکول بھی سیکولر ہیں، کیونکہ ان کی حکومتوں نے ان کو ایسا بنایا ہے۔ ہندوستانی پس منظر میں سیکولرزم کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

زندگی کا وہ فلسفہ جس میں درج ذیل عناصر ہوں، دستوری ضمانتیں، مذہب و سیاست کی علیحدگی، برداشت و تحمل، سوشل اور کلچرل ورثے کا شعور، تمام لوگوں میں مساوات ان کے مذہب سے قطع نظر کرکے، سائنس و ٹیکنالوجی کی اقدار کا اثبات، انسانوں کی سماجی، ثقافتی مادی زندگی کو بہتر بنانا، قومیت اور حب الوطنی کی معقول بنیاد اور سب سے اوپر سائنسی رویہ۔ اس اقتباس سے سیکولر تعلیم کے فلسفے کا خلاصہ ہوجاتا ہے۔ سیکولر تعلیم کی مختلف انداز سے تعریف کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض ذیل میں دی جارہی ہیں۔

آج کل نالج کے میدان میں سیکولرزم کے معنی ہیں کہ حقیقی نالج یا سائنس کو مشاہدہ، تجربہ اور ذہانت پر مبنی کیا جائے۔ اس کو مذہب وعقیدہ کی مداخلت سے آزاد رکھا جائے۔ تعلیم میں سیکولرزم کا مطلب ہے ایسا تعلیمی نظام جو عقلیت، تجربیت اور سائنسی روح کے ساتھ مرتب کیا جائے۔سیکولر ایجوکیشن پبلک تعلیم کا وہ نظام ہے جو سیکولر ملکوں نے اختیار کیا ہے۔جس میں مذہب اور ریاست کو الگ رکھا جاتا ہے۔ سیکولر ایجوکیشن کی ایک وسیع تعریف میں یہ بھی آتا ہے کہ ایسی کلچرل تعلیم ہو جو ایک شہری کو دی جائے اور اس سے وہ ایک مضبوط سیکولر سوسائٹی میں پروان چڑھے۔

سیکولر تعلیم کا مقصد ذیل ہے:

(1) فرد کا جسمانی، ذہنی اور روحانی ارتقا

(2) سماجی اور قومی ارتقا

(3) سماجی تبدیلی

(4) سائنٹفک اینڈ ٹیکنالوجیکل ترقی کے لحاظ سے ماڈرنائزیشن، جس میں نیشنل اسپرٹ ہو یعنی نیشنلائزیشن۔ اس سے ویسٹرنائزیشن مراد نہیں ہے نہ اس کی تعبیر مغرب زدگی سے کی جائے گی۔

(5) تعلیمی، زراعتی، صنعتی اور خدمات فراہم کرنے میں تخلیقیت

(6) کمیونٹی کی شراکت

(7) اخلاقی، ثقافتی اور روحانی اقدار کا حصول جن میں تعاون، خیرسگالی، معافی، برداشت، ایمانداری، صبر، عالمی اخوت، سیکولرزم اور رجائیت کی قدریں اور غریبوں کی خدمت وغیرہ۔

امریکی مفکر جان ڈیوی کو سیکولر تھیوری آف نالج کی نظریہ سازی میں اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے 1996 میں لیبارٹری اسکول قائم کیا اور چار سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے انھوں نے سیکولر تعلیم کے اصول بنائے۔ انھوں نے تعلیمی اصلاح کی تحریک میں کرنل فرانس پارکر کے ساتھ بھی کام کیا۔ Progressive Evolution Association جان ڈیوی کے نظریات کی اشاعت کی دعوے دار ہے۔ اس نے ڈیوی کے تجربات اور نظریات پر مبنی سیکولر تعلیم کے اصول کو یوں Codify کیا ہے:

1. کمیونٹی کی سماجی ضرورتوں کے لحاظ سے بچے اپنے سلوک کو خود طے کریں گے۔
2. تمام کاموں کے لیے محرک ذاتی دلچسپی کو ہونا چاہیے۔
3. استاد بجائے ہر چیز سکھا دینے کے ایک گائیڈ کا کردار ادا کرے اور بچوں میں نالج کی طلب اور تلاش و تحقیق کا جذبہ بھر دے۔
4. ہر بچے کی ذہانت اور ارتقا کو ایک سمت دینے کے لیے اس کے جسمانی، ذہنی، سماجی اور روحانی ارتقا کا سائنسی مطالعہ ہونا چاہیے۔
5. بچے کی جسمانی ضرورتوں پر خاص توجہ دینی چاہیے جس کے لیے میدانی کاموں کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہو۔
6. اسکول اور گھر کے درمیان تعاون بچے کے ارتقا کے لیے ضروری چیزوں کی تکمیل کرے گا۔ مثلاً میوزک، رقص، کھیل اور دوسری غیر نصابی سرگرمیاں۔
7. تمام Progressive اسکول اپنے تمام کاموں کو لیباریٹری جیسا سمجھیں گے اور آزادانہ طور پر تعلیم کے کاموں چائلڈ کلچر میں اپنے تجربات کے نتائج دیں گے۔

ہندوستان کا آئین لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی آزادیاں دیتا ہے۔ مثال کے طور پر آرٹیکل 25 (1) 26 (1) 30 (1,2) اسی طرح آرٹیکل 15 (1) سرکاری نوکریوں میں مساوی مواقع (آرٹیکلز 16 (1-2) (17) تعلیمی اداروں میں عدم تفریق (آرٹیکل 29 (2) غیر فرقہ وارانہ الیکٹوریٹ (آرٹیکل 325، مذہبی مقاصد کے لیے ٹیکس سے خلاصی (آرٹیکل 27) سرکاری اسکولوں میں غیر مذہبی تعلیم (آرٹیکل 28 (1,2,3)۔ واردھا اسکیم سے لے کر آج تک ہندوستان میں تعلیم کی بہتری کے لیے متعدد پروجیکٹ شروع کیے گئے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن 1948-49 میں قائم کیا گیا جس نے بی ایڈ کے نصاب میں استادوں کی ٹریننگ کی سفارشات پیش کیں۔ 1952-53 میں ثانوی تعلیم کا کمیشن وجود پذیر ہوا۔ غالبًا سرکاری اقدام NEP 1948 ایسا پروجیکٹ تھا جس پر سب سے زیادہ بحث ومباحثہ ہوا۔ تعلیمی حقوق ایکٹ سے امید ہے کہ تعلیم کا دائرہ بڑھے گا اور ملک کی تعمیر نو میں نئی راہ ہموار کرے گا۔

■

Dr. Mohd FiroA lam
Jaitpur New Delhi-10045

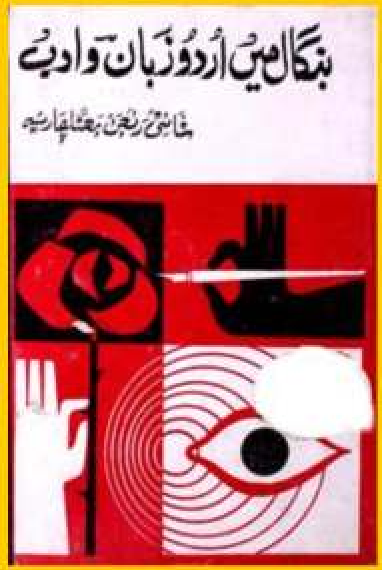

ہمایوں اشرف

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے تحقیقی و تنقیدی کارنامے

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ ان کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بیک وقت تحقیق، تنقید، تذکرہ، ترجمہ، افسانہ اور ناول جیسی صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی۔ وہ عمیق مطالعے و مشاہدے اور متنوع تجربات و احساسات کے مالک تھے۔ ان کا تعلق ایک بنگالی براہمن خاندان سے تھا اس لیے ان کی مادری زبان بنگلہ تھی۔ لیکن تعلیم و تعلم کے سلسلے میں انھوں نے اردو زبان کو ہی اختیار کیا تھا۔ اس لحاظ سے شانتی رنجن گنگا جمنی تہذیب کی اس روایت کے امین تھے جس کی پاسداری راجہ رام نارائن موزوں، دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نارائن چکبست، فراق گورکھپوری، گیان چند جین اور مالک رام وغیرہ کرتے رہے تھے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ بنگالی نژاد تھے لیکن اردو زبان سے انھیں خاص انسیت تھی۔ موصوف اردو کے بڑے بہی خواہ تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نہ صرف مغربی بنگال بلکہ ہندوستان کے وہ تمام علاقے جہاں جہاں اردو بولنے والوں کی دس فیصد آبادی ہے وہاں اردو کو ریاستی زبان کا قانونی حق ملنا چاہیے۔''

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اردو اور بنگلہ ادب میں متنوع کام کیے ہیں۔ میری نگاہ میں ان کے تحقیقی و تنقیدی کاموں کی وقعت ہے۔ وہ دراصل تحقیقی ذہن کے مالک ادیب تھے۔ بنگال میں اردو کو لے کر انھوں نے کافی سروے کیا اور اس سلسلے میں اعداد و شمار جمع کرنے میں اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ ڈاکٹر الف۔ انصاری نے ایک موقع پر ان کے بنگال کے ادب سے رغبت کے متعلق استفسار کیا تو اس ضمن میں موصوف نے جواب میں فرمایا تھا:

''بنگال میں 'بنگال کے ادب' پر جتنا اچھا کام ہو سکتا ہے اس سے بہتر کام بنگال سے باہر کے ادب پر نہیں کیا جا سکتا اور پھر بنگال میں اتنے موضوعات ہیں کہ دوسری طرف مڑ کر دیکھنے اور سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا ہے۔ اگر میں صرف بنگال کے ادب پر کام کروں تو یہاں کے ادب کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ تنہا اسے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔'' (نثر نگاران بنگالہ، مرتبہ: ڈاکٹر الف۔ انصاری، ص 449)

یہاں میرا مقصد بنگال میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے ان کے چند تحقیقی و تنقیدی کارناموں پر روشنی ڈالنا ہے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی ایک کتاب 'اردو ادب اور بنگالی کلچر' کو مغربی بنگال اردو اکادمی نے پرنٹ ویل آفسیٹ، میکلیوڈ اسٹریٹ کلکتہ سے 1982 میں شائع کر کے اکادمی کے دفتر سندری موہن ایونیو کلکتہ 14 سے جاری کیا۔ یہ کتاب مصنف نے بنگلہ دیش میں ایک خادمِ اردو جناب شعیب عظیم کے نام معنون کیا ہے۔

زیر نظر کتاب پانچ تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے مضمون میں اردو اور بنگلہ زبان کے باہمی رشتے پر

> شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اردو اور بنگلہ ادب میں متنوع کام کیے ہیں۔ میری نگاہ میں ان کے تحقیقی و تنقیدی کاموں کی وقعت ہے۔ وہ در اصل تحقیقی ذہن کے مالک ادیب تھے۔ بنگال میں اردو کو لے کر انھوں نے کافی سروے کیا اور اس سلسلے میں اعداد و شمار جمع کرنے میں اپنی پوری زندگی صرف کردی۔

تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اس مضمون میں مصنف نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو اور بنگلہ دونوں جدید زبانیں ہیں اور دونوں کا ادب بھی جدید ادب ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو اور بنگلہ میں بھی الفاظ سنسکرت، پالی، پراکرت، اپ بھرنش، عربی، فارسی، ترکی، چینی، انگریزی وغیرہ سے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر آریائی نسل کی زبانوں جیسے تلگو، تمل، کنڑ اور ملیالم وغیرہ سے بھی الفاظ ان میں شامل ہوئے ہیں۔ کچھ الفاظ آدی باسی اور قبائلی زبانوں کے بھی ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جن کی اصل (Origin) کا اب تک کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے۔ ان الفاظ میں سیکڑوں ایسے الفاظ ہیں جو خود اردو اور بنگلہ میں ہی پیدا ہوئے ہیں اور خالص اردو یا خالص بنگلہ کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک عرصے تک فارسی کے ہندوستان کی سرکاری زبان رہنے کے سبب بنگلہ اور اردو دونوں زبانوں پر عربی اور ترکی کے مقابلے میں فارسی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اگرچہ اردو کے مقابلے میں بنگلہ میں عربی اور فارسی کے الفاظ کم شامل ہوئے ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ مغلوں کے زمانے سے لے کر انگریزی دورِ اقتدار کے ابتدائی دنوں تک ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی تھی۔ لیکن جب ان کی حکومت مستحکم ہو گئی اور کچھ لوگوں نے کام چلانے کے لائق انگریزی سیکھ لی تب انگریزوں نے فارسی کو سرکاری دفاتر اور عدالت سے ہٹا کر پہلے دیسی زبانوں کو نافذ کیا اور پھر چند سالوں کے بعد 1844 میں فارسی کو پورے ملک کی عدالتی اور سرکاری کام کاج کی زبان سے ہٹا کر انگریزی کو نافذ کر دیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مغلوں کے عہد میں سرکاری کام کاج میں بنگلہ کا کوئی مقام نہیں تھا اس لیے فارسی کے جیسی بنگلہ کی ترقی نہیں ہو سکی۔ لیکن جب چند برسوں کے لیے بنگلہ کو بنگال کی عدالتوں اور دفاتر میں رائج کیا گیا تو ایسی لغت کی ضرورت پیش آئی جس میں فارسی کے عدالتی اور دفتری الفاظ کے متبادل تلاش کیے جا سکیں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر جئے گوپال ترکالنکار نے جو فارسی بنگلہ لغت تیار کی وہ 1838 میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ مصنف نے بنگلہ زبان کی موجودہ شکل وصورت پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح کیا ہے کہ گرچہ آج بنگلہ زبان کے دامن سے عربی و فارسی کے وہ سیکڑوں الفاظ جو انیسویں صدی میں رائج تھے اب خارج ہو چکے ہیں پھر بھی سیکڑوں عربی و فارسی کے الفاظ کو اس نے اپنا بھی لیا ہے۔ انھوں نے کئی ایسے الفاظ کے نمونے پیش کیے ہیں جو تھوڑی سی شکل وصورت یا تلفظ کی تبدیلی کے ساتھ اس وقت بنگلہ میں مستعمل ہیں۔ انھوں نے دونوں زبانوں کے ڈھیروں الفاظ کی فہرست پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ آج نہ صرف بنگلہ کے کتنے ہی الفاظ، محاورے اور کہاوتیں نہ صرف اردو زبان میں مستعمل ہیں بلکہ اردو کے بھی سیکڑوں الفاظ، محاورے اور کہاوتیں بنگلہ زبان میں رائج ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے مضمون میں مصنف نے اردو شاعری پر بنگلہ کلچر کے اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ بنگلہ ایک ترقی یافتہ زبان ہے جو ایک عظیم کلچر کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ یہ ادبی زبان کے علاوہ ایک علاقائی زبان بھی ہے اس لیے اس میں لوک گیت اور لوک کہانیاں بھی شامل ہیں جس کی اردو میں بے انتہا کمی ہے۔ اس کی وجہ اردو کا شہری کلچر ہے۔ لیکن دیگر زبانوں کے ساتھ اردو کے رشتے کے استحکام کے ساتھ اس کے ادب کا فروغ بھی تیزی سے ہوتا چلا گیا۔ مصنف اردو شاعری پر بنگلہ ثقافت کے اثرات کی بازیافت کے عمل میں لکھتا ہے کہ اس کی ایک وجہ تو اردو میں بنگلہ ادب کے وہ تراجم ہیں جو نند لال شیل، ناگیندر ناتھ بنرجی، پربھات چندر مکھرجی، عبدالحلیم شرر، مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، محمد یونس احمر، پرویز شاہدی، وفا راشدی، پروفیسر احسن احمد اشک وغیرہ جیسے بنگلہ اور اردو کے ادیبوں نے کیے۔ اردو پر بنگلہ تہذیب وتمدن کے اثرات کی ایک دوسری وجہ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں اردو کے شعرا و ادبا کا ہندوستان کے دیگر علاقوں سے آکر بنگال میں قیام یا مشرقی پاکستان (مشرقی بنگال) میں ہجرت کا عمل بھی کہی جا سکتی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اگر غالب اور داغ دہلوی کو مشتثنیٰ بھی سمجھ لیں جو وقتی طور پر یہاں آئے تھے تو پرویز شاہدی، جمیل مظہری اور ساجد ابروی جیسے شعرا کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے پورے انہماک اور جذبے کی صداقت کے ساتھ بنگلہ تہذیب وتمدن کے موتیوں سے اپنے شعری گلشن کو سجایا اور اردو ادب کو ٹیگور اور نذرالاسلام کی فکری وفنی عظمت سے روشناس کرایا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ ایک سرگرم محقق تھے۔ اردو اور بنگلہ کی تہذیبی روایات کے رشتے کی تلاش میں وہ کئی ذرائع سے کام لیتے ہیں۔ ان کے آبا واجداد مشرقی بنگال کی سرزمین سے ہی آکر ہندوستان کے کلکتہ اور حیدرآباد میں بس گئے تھے اس لیے نہ صرف مشرقی بنگال کے جغرافیہ کا انھیں واضح علم تھا بلکہ وہاں کی تہذیب وتمدن سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں یوپی، بہار اور مغربی بنگال سے مشرقی پاکستان جا کر آباد ہو جانے والے اردو

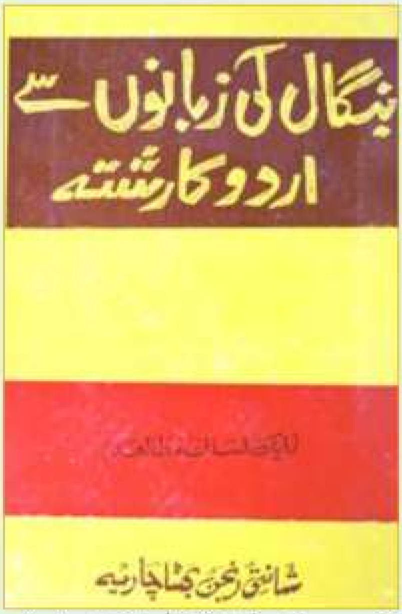

کے ادیبوں کے مسائل کا بھی علم تھا جن کا رشتہ بنگلہ تہذیب وتمدن سے ہمیشہ ہموار نہیں رہا تھا۔ تاہم وہ اردو کے ان مخلص، روشن خیال اور ترقی پسند ادبا و شعرا کی اس کاوش کو لائقِ تحسین قرار دیتے ہیں جو مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان کی بقا اور فروغ کی خاطر اسے قومی زبان کا درجہ دیے جانے کے مطالبے کو نہ صرف جائز سمجھ رہے تھے بلکہ اس کی تحریک کے جھنڈے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا۔ ڈھاکہ کے شعیب عظیم کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جب بنگلہ زبان کی تحریک چلی تو مشرقی بنگال کے اردو ادیبوں اور شاعروں نے حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی۔ بنگلہ زبان کو سرکاری زبان بنانے کی تحریک کی حمایت کی اور اس مہم کو مزید تقویت دینے کے لیے اپنے دستخط بھی کیے۔ ڈاکٹر یوسف حسین، صلاح الدین محمد، پروفیسر بانو اختر شہود، پروفیسر امِ عمارہ اور حسن سعید وغیرہ نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سلسلے میں اردو بولنے والے جیل تک گئے۔ انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان کا مرکزی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے اسی بنا پر اختلاف ہو گیا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ مرکزی انجمن سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہاں کی انجمن ترقی اردو نے اپنے لیٹر پیڈ پر بنگلہ زبان کو بھی نمایاں جگہ دی۔ انجمن ہمیشہ بنگالی اور اردو ادیبوں کو قریب سے قریب تر لانے کے لیے کوشاں رہی۔ اردو کی چند دیگر انجمنیں بھی اسی نہج پر کام کرتی رہیں جن میں دبستانِ فکر ونظر، انجمن ادب اور مجلسِ ادب وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔......جب 1958 میں مارشل لا آیا تو مغربی پاکستان سے آواز اٹھی کہ صرف اردو کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ اس وقت صلاح الدین محمد مشرقی پاکستان یونین آف جرنلسٹ کے صدر تھے

انھوں نے بیان دیا کہ دستور پاکستان 1956 کی رو سے یہ بات طے ہو چکی ہے کہ پاکستان کی دو سرکاری زبانیں ہوں گی اردو اور بنگلہ...... اگر طے شدہ مسئلے کو پھر اٹھایا گیا تو میں صرف بنگلہ زبان کا مطالبہ کروں گا۔''

(اردو ادب اور بنگالی کلچر، ص 62-61)

زیر نظر مضمون سے اس حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو شعر و ادب میں بنگلہ تہذیب و تمدن کی عکاسی عام شعرا و ادبا کے مقابلے میں اردو کے ترقی پسند ادبا و شعرا کے یہاں زیادہ نمایاں اور حقیقی نظر آتی ہے۔ مضمون نگار نے نمونے کے طور پر ایسے اردو شعرا کے کلام سے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ ان شعرا نے اپنے کلام میں مشرقی بنگال کے سماجی اور سیاسی حالات کی روشنی میں اپنے تجربات کے اظہار کے علاوہ وہاں کے قدرتی مناظر اور آب و ہوا، پھل پھول، سبزی و ترکاری، دھان، پاٹ، مچھلی، چائے، پان، رس گلے، تہوار، پوجا پاٹ، ناچ رنگ اور میلے ٹھیلے وغیرہ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

زیر نظر کتاب کا تیسرا مضمون بنگلہ دیش کا اردو ادب اور بنگالی کلچر کی تحقیق پر محیط ہے جس کا مقصد یہ دریافت کرنا رہا ہے کہ قیام پاکستان کے دنوں سے سقوط ڈھاکہ کے 24 سال کے عرصے میں مشرقی بنگال نے اردو کو کیا دیا ہے اور بنگلہ دیش کے وجود کے بعد اس نئے ملک میں اردو کا کیسا نیا ادب ابھرا ہے۔ مضمون نگار اس نئے ملک میں اردو زبان و ادب کے ساتھ بنگلہ کلچر کی جس ہم آہنگی کی باز یافت کرتا ہے وہ تضاد، تحیر اور اجنبیت کے درمیان ایک خوش گوار رشتے کے احساس سے معمور ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بنگال کی تہذیب، خاص کر دیہاتی تہذیب اردو ادب کے لیے نئی چیز رہی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اردو کے اہل قلم جب اس نئی سرزمین پر پہنچے تو یہاں کی آب و ہوا، زبان، غذا، رہن سہن، رسم و رواج اور طور طریقے انھیں اجنبی محسوس ہوئے۔ لیکن ان سے اردو ادب کو بے حد فائدہ بھی ہوا۔ نئے الفاظ نے جہاں اردو زبان کے دامن کو مالا مال کیا وہیں نئی تہذیب سے اردو ادب کی شناسائی نے اردو ادیبوں کے لیے بصیرت کے نئے دروازے کھولے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ نئے ماحول، آب و ہوا اور نئی تہذیب و تمدن سے ہم آمیزی کے سبب یہاں جو نیا اردو ادب وجود میں آیا اردو ادب کے نقادوں نے اس کا اس طرح استقبال نہیں کیا جس سے اس کی قدر و قیمت کا تعین ہو پاتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ بنگلہ ادب کے نقاد ہر نئے فن کار پر نظر رکھتے ہیں۔ بنگلہ تہذیب کے اثرات قبول کرنے کے نتیجے میں اردو ادب کی جو نئی صورت ابھری مضمون نگار اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مشرقی بنگال کے ادبا و شعرا نے بھی اردو ادب کو نئی زمین اور آسمان کی باتوں، نئی تہذیب و تمدن کی باتوں، نئی داستان، نئے اچھوتے کردار، نئے مناظر، اور بالکل ہی نئے دن رات عطا کیے ہیں۔ ہر چیز نئی ہو تو اندازِ بیان بھی بدل جاتا ہے۔ ان نئی چیزوں کا ذکر خیر کرنے کے لیے نئے الفاظ عالم وجود میں آتے ہیں۔ اس طرح اردو کے خزانۂ الفاظ میں بنگلہ زبان سے کئی الفاظ آ گئے۔ نئی علامتوں اور نئی تشبیہوں سے اردو کے فن کاروں کو کام لینا پڑا۔ ہم ان تمام نئی چیزوں کو اردو ادب میں 'رنگِ بنگالہ' کہہ سکتے ہیں اور اس ادب کو 'بنگال اسکول کا ادب' قرار دے سکتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 135)

اردو ادب میں یہ نئی تبدیلی شعر و ادب کی شعری و نثری دونوں اصناف میں ظاہر ہوئی۔ شعرا میں یہ نیا رنگ احسن احمد اشک، نوشاد نوری، اور اختر حمید خاں اختر وغیرہ کے کلام میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ نثری ادب میں اس تہذیب کا گہرا اثر فضل احمد کریم فضلی، سلیم اللہ فہمی، اظہر قادری اور حیدر صفی وغیرہ کی تخلیقات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اس نئی تہذیب کے اثرات نے مخمور اکبر آبادی کی 'مشرق تاباں' اور احسن احمد اشک کے 'جاگتے جزیرے' کی نظموں، فضلی کے ناول 'خونِ جگر ہونے تک' اور حیدر صفی کی 'مادام' کی تخلیق کو ممکن بنایا۔ ان کے علاوہ مثنوی 'سرّ الاسرار' مصنف ڈاکٹر خواجہ معین الدین جمیل، احسن احمد اشک اور یونس احمر کے ذریعے بنگالی زبان کے چند مسلم شعرا کے کلام کا اردو ترجمہ 'انتخاب کلام مسلم شعراء بنگال' کے عنوان سے، اختر حمید خاں اختر کے کلام کا مجموعہ 'چراغ اور کنول' ریاض الدین حیدر ریاض کے دو مجموعہ کلام 'بازگشت' اور 'گل بانگ' احمد احسن اشک کا 'برق و باراں'، پروفیسر حسن عظیم آبادی کی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعات کا مجموعہ 'زمستاں' اسرار پریم نگری کا مجموعہ کلام 'اجزائے پریشاں' اور 'ضیائے صبح'، شاہین غازی پوری کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ 'رگِ ساز' مخمور اکبر آبادی کی پانچ ایسی نظموں پر مشتمل مجموعہ جو خصوصی طور پر مشرقی بنگال کے حوالے سے کہی گئیں 'مشرق تاباں' اشک بنارسی کا مجموعہ کلام 'روحِ شاعر'، مشرقی بنگال کی انقلابی شاعری کا اردو ترجمہ 'آہنگِ انقلاب' اس میں 29 بنگالی شعرا کی منتخب ایک ایک نظم کا ترجمہ اور ساتھ ہی بنگلہ رسم الخط میں اصلی نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تحقیقی، تنقیدی اور ادبی تصانیف کے حوالے سے بھی اس عہد کا دامن خالی نظر نہیں آتا۔ لیکن 1971 میں بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد صورتِ حال میں نمایاں تبدیلی پائی جاتی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد زیادہ تر اردو ادبا و شعرا بدلے ہوئے حالات میں بنگلہ دیش سے یا تو پاکستان ہجرت کر گئے یا اپنے سابق وطن ہندوستان لوٹ گئے۔

کتاب کے اگلے مضمون میں مضمون نگار نے ل۔ احمد اکبر آبادی کی ادبی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ل۔ احمد اکبر آبادی کی ادبی حیثیت ہمہ جہت ہے۔ وہ بہ یک وقت افسانہ نگار، مقالہ نویس، نقاد، محقق، اور مترجم کے طور پر معروف رہے ہیں۔ انھوں نے بنگال کی تہذیبی زندگی کو اپنے افسانوں میں بخوبی پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں بنگال کی زندگی کی حقیقی عکاسی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بنگلہ زبان کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں اس سے اردو زبان و ادب کا دامن وسیع ہوا ہے۔

مصنف نے کتاب کے آخری مضمون میں بنگال کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے دو ناولوں کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان میں ایک ناول فضل احمد کریم فضلی کا ناول 'خون جگر ہونے تک' ہے اور دوسرا ناول ہے قرۃ العین حیدر کا 'آخرِ شب کے ہمسفر'۔ مصنف کا خیال ہے کہ ان دونوں ناولوں میں بنگالی کلچر کو جس حسن و خوبی سے پیش کیا گیا ہے اس کی نظیر اردو ادب میں اور کہیں پائی نہیں جاتی۔ مصنف کے خیال سے نہ صرف اتفاق لازم ہے بلکہ اس کے پیش کردہ مطالعے کا حاصل اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ مضمون نگار نے تحقیق کے ہر مرحلے میں جس ایمانداری، محنت لگن اور جانفشانی سے کام لیا ہے اس نے اس کے مطالعے کے نتائج کو قابلِ قدر بنا دیا ہے۔

> شانتی رنجن بھٹا چاریہ لسانی تحقیق سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی صحبت میں بیٹھنے کے سبب اس میدان میں ان کی دلچسپی بڑھی۔

'بنگال میں اردو زبان و ادب' شانتی رنجن بھٹا چاریہ کے نو تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ 1976 میں یہ مجموعۂ مضامین، نصرت پبلشرز، لکھنؤ کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ زیر نظر کتاب میں جو مضامین شامل ہیں، ان کے عنوانات ہیں اردو میڈیکل تصانیف کا پہلا مصنف، چند

یوروپین مصنّفین اردو اور ان کی تصانیف، بعض کمیاب اخبارات و رسائل، اردو طبی تصانیف، بنگال میں غالب کے شاگر، معتقدین اور مخالفین، تذکرۂ شاعرات، انیسویں صدی میں شائع شدہ مجموعہ ہائے کلام، اردو صحافت کے دو سو سال اور 'حجاب: ایک طوائف، ایک شاعرہ'۔ یہ تمام تحقیقی مضامین ان کی کھوج بین فطرت استدلالی اور معروضی زاویۂ نظر کے بین ثبوت ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے اپنی تحقیق کو مدلل اور معروضی انداز میں مستند حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اردو میڈیکل تصانیف کا پہلا مصنف، چند یوروپین مصنّفین اردو اور ان کی تصانیف، بعض کمیاب اخبارات و رسائل، اردو طبی تصانیف، بنگال میں غالب کے شاگر، معتقدین اور مخالفین، انیسویں صدی میں شائع شدہ مجموعہ ہائے کلام اور 'حجاب: ایک طوائف، ایک شاعرہ' بعض نئے مواد اور مبسوط محاکے کی وجہ سے فکر انگیز اور قابل لحاظ مضامین ہیں، جن کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

ان کی ایک اور عمدہ تحقیقی تصنیف 'بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات' ہے۔ یہ کتاب 1964 میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور ادبی حلقے میں کافی پسند کی گئی۔ شانتی جی کی اس کتاب پر سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی چند تعریفی کلمات تحریر کیے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس قابل قدر تحقیقی کتاب پر شانتی رنجن بھٹا چاریہ کو رابندر ناتھ ٹیگور ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ زیر نظر کتاب میں محقق نے ان بنگالی ہندو ادبا و شعرا کی اردو خدمات سے روشناس کرایا ہے جن کی مادری زبان تو بنگلہ تھی لیکن ان لوگوں نے اردو ادب کے فروغ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ یہ کتاب ان بنگالی دانشوروں کی اردو خدمات پر محیط ہے جو بنگال میں مختلف اوقات میں اردو کی ترقی اور ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل رہے۔ اس گراں قدر تحقیقی تصنیف کی بدولت ہی ان کی شناخت محقق کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی بعض لوگوں نے اس موضوع پر کئی تحقیقی مقالے قلم بند کیے۔ اسے یقیناً تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری نگاہ میں تو یہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔

'مختصر تاریخ ادب بنگلہ' (جلد اوّل وجلد دوم) بھی شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی وقیع تحقیقی تصنیف ہے۔ یہ کتاب 1975 میں انجمن ترقی اردو ہند، دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں بنگلہ ادب کی تاریخ کو نہایت اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بنگلہ ادب کے ارتقائی سفر کو جاننے کے لیے یہ آج بھی ایک انتہائی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

شانتی رنجن جی کی ایک اور اہم تحقیقی کاوش 'کلکتہ میں اردو کا پہلا مشاعرہ اور پرنس ولسن کا یادگار مشاعرہ' ہے۔ واضح رہے کہ آزادی سے قبل سرزمین بنگال پر اس اولین کل ہند طرحی مشاعرے کا انعقاد ہوا تھا جس میں وحشت کلکتوی، سالک لکھنوی، پرویز شاہدی، شمس عظیم آبادی، ابراہیم ہوش، نواب دہلوی، جرم محمد آبادی، رضا مظہری، نوح ناروی، محمد قاسم میکش، اسحاق لکھنوی، مضطر لکھنوی، دل لکھنوی، حیرت الٰہ آبادی، زخمی لکھنوی، سید محمود طرزی، سحر لکھنوی، واصف بنارسی، ذکی لکھنوی، بے خود دہلوی، قمر صدیقی اور عبد الباری آسی جیسے باکمال استاد شعرا مدعو کیے گئے تھے۔ اس مشاعرے کے لیے جو مصرعۂ طرح دیا گیا تھا وہ ہے۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

مصنف کی اطلاع ہے کہ اس مشاعرے کا افتتاح اے کے۔ فضل الحق کے ہاتھوں ہوا تھا اور صدارت کے فرائض خواجہ ناظم الدین نے انجام دیے تھے۔ لیکن بعض لوگوں نے شانتی جی کی اس اطلاع کو غلط قرار دیا ہے۔ بہرطور اس تاریخی مشاعرے کا انعقاد 13 جنوری 1941 کو پرنس ولسن کی رہائش گاہ پر ہوا تھا۔

شانتی رنجن نے اپنی ایک اہم کتاب 'غالب اور بنگال' میں مرزا غالب کے سفر کلکتہ اور قیام کلکتہ کی روداد کو اجمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب 1977 میں منظر عام پر آئی اور علمی و ادبی حلقوں میں بنظر استحسان دیکھی گئی۔ ان کی ایک اور تحقیقی تصنیف 'آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو' ہے، جس میں انھوں نے سرزمین بنگال سے شائع ہونے والی کتب، اخبارات اور رسائل و جرائد سے متعارف کرایا ہے۔

ان کی ایک اور وقیع کتاب 'اقبال، ٹیگور اور نذرل، تین شاعر، ایک مطالعہ' 1978 میں اشاعت پذیر ہوئی۔ شانتی رنجن نے اس میں بنگلہ زبان کے دو عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور، نذر الاسلام اور اردو کے علامہ اقبال کی شخصیت اور فن کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔

'تذکرہ شعرائے ٹالی گنج' مطبوعہ 1993 میں انھوں نے ماضی کے ایک مشہور و معروف اردو مرکز ٹالی گنج کے نامور شعرا و ادبا کے احوال و آثار اور نمونۂ کلام کے علاوہ وہاں کی تاریخی عمارات و مقامات کا خاکہ پیش کیا ہے۔

''اردو اور بنگال، آزادی کے بعد بنگال میں صحافت، خواتین بنگال کی اردو خدمات، تذکرہ تصانیف بنگلہ، رابندر ناتھ ٹھاکر: حیات و خدمات اور 'آفتاب علم و ادب ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی: حیات و خدمات' ان کی وہ تحقیقی و تنقیدی کتابیں ہیں جن پر گفتگو لازمی ہے۔ مقالے کی طوالت کے سبب فی الوقت ان سے پہلوتہی کی جاتی ہے۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے اردو، بنگلہ اور مغربی بنگال کی علمی، ادبی، صحافتی، تاریخی، سماجی اور سیاسی تناظرات کا محاسبہ اور محاکمہ کرتے ہوئے جو کتابیں تصنیف کیں ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی یہ کتابیں مستقبل کے محققین اور مؤرخین ادب کو چراغ راہ دکھاتی رہیں گی۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ لسانی تحقیق سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی صحبت میں بیٹھنے کے سبب اس میدان میں ان کی دلچسپی بڑھی۔ اس حقیقت کا اعتراف خود انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''لسانیات سے جو کچھ میری دلچسپی ہے، اس کی اصل وجہ مرحوم ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی سے میرے گہرے تعلقات تھے۔ اور مجھے اس کا شرف حاصل ہے کہ تقریباً دس سال تک ان کے قریب رہا ہوں۔ ان کی محبت نے مجھ جیسے نا لائق میں بھی لسانیات کا کچھ ذوق پیدا کر دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آج اس موضوع پر کچھ لکھنے کی ہمت کر بیٹھا۔''

شانتی رنجن نے باقاعدہ ایک کتاب تحریر کر کے ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی حیات و خدمات سے اردو والوں کو متعارف کرانے کا کارنامہ انجام دیا۔ علاوہ ازیں ان کے دس مقالات پر مشتمل کتاب 'مغربی بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ' ہے جو دراصل لسانیات پر مبنی ان کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ لسانی موضوعات پر خامہ فرسائی بہت کٹھن کام ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ شانتی رنجن اس دشوار گزار کام کو بھی پختگی اور تیقن کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے اردو، بنگلہ اور مغربی بنگال کی علمی ادبی، صحافتی، تاریخی، سماجی اور سیاسی تناظرات کا محاسبہ اور محاکمہ کرتے ہوئے جو کتابیں تصنیف کیں ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی یہ کتابیں مستقبل کے محققین اور مؤرخین ادب کو چراغ راہ دکھاتی رہیں گی۔

■

Dr.Humayun Ashraf
P.G, Department of Urdu
Vinoba Bhave University
Hazaribagh-825301(Jharkhand)
Mob:09771010715

مضطر خیرآبادی کی ہندی شاعری میں ہندوستانی تہذیب

عشرت ناہید

اردو اور ہندی زبان کے باہمی رشتے کتنے مضبوط ہیں اس بات سے ہر کوئی واقف ہے، کسی نے اسے دو بہنیں کہا تو کسی نے دو آنکھوں سے مثال دی ہے۔ دونوں زبانوں کے اس رشتے کی بنیاد دراصل کھڑی بولی ہے جس کے بطن سے یہ لسانی سوتے پھوٹے ہیں۔ اتنا ہی نہیں دونوں زبانیں بولنے والوں کا ملک بھی ایک ہے ان کے تہذیبی رشتے بھی مشترک ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ مذہب کی بنا پر زبانوں کو تقسیم کر لیا جائے۔ اردو اور ہندی والوں نے باوجود سیاسی کوششوں کے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ زبان کو منقسم کر دینا آسان نہیں، زبانیں اپنا دائرہ خود طے کرتی ہیں پھر ان دائروں کو وسیع کرتی ہیں کشادہ دلی سے دوسری زبانوں کو اپنے یہاں جگہ دیتی ہیں اور یہی فراخ دلی زبان کے دامن کو نئے نئے الفاظ اور اصناف ادب سے سجانے کا کام بھی کرتی ہے۔

تہذیب کے اصطلاحی معنوں پر بھی جب غور کیا جاتا ہے تو یہ اپنے لغوی معنی سے بالکل مختلف ہیں۔ لغت میں اس کے معنی اصلاح، پاک کرنا، صفائی و آراستگی کے ہیں، لیکن اصطلاحی معنی بڑی وسعت رکھتا ہے۔ جذبات، خیالات، عادات واطوار، زبان، رسم ورواج، علم و ادب، عقائد، غذائیں، پوشاکیں، وغیرہ یہ سب لوازمات تہذیب کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہندوستان ایک کثیر لسانی، مذہبی، ثقافتی اعتبار سے مختلف تہذیبوں کے مرکز کے طور پر پوری دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ یہاں مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں نے ایک دوسرے پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہاں بسنے والوں نے اپنی الگ الگ تہذیبی شناخت قائم کرتے ہوئے ایک دوسرے کے اثرات قبول کیے ہیں۔ زبان وادب اور دیگر علوم وفنون میں بھی یہی کچھ ملتا ہے اور جہاں تک بات اردو زبان کی ہے تو اس کی سب سے بڑی سچائی یہی ہے کہ اس زبان نے ہندوستان میں جنم لیا اور کھڑی بولی، برج بھاشا عربی فارسی ترکی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندی زبان اور مقامی بولیوں کے اثرات کو بھی قبول کیا۔

اردو زبان کا حسن یہی ہے کہ اس میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں ساتھ ہی ہندی شاعری کی مختلف اصناف بھی نظر آتی ہیں جنھوں نے ادب کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ لہٰذا اردو شعرا کے کلام پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو ابتدا ہی سے ہمیں اردو میں ہندی شاعری کا سلسلہ ملتا ہے۔ جس کا آغاز امیر خسرو سے ہوتا ہے۔ جن کے یہاں ہندوی زبان کے ساتھ ساتھ اس کی مختلف اصناف دوہا، گیت، کہہ مکرنیاں وغیرہ ملتی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ زبان میں ہندوستانی تہذیبی عناصر ہی اس کی خوبصورتی کے ضامن ہیں۔ امیر خسرو سے جاری یہ سلسلہ قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، اور پھر ولی کے ساتھ شمالی ہند کی طرف گامزن ہوتا ہے یہاں حاتم، فائز، مظہر جان جاناں، آبرو، آرزو اسے اپناتے ہیں تو نظیر اکبر آبادی عوام کے مختلف رنگوں میں ہندی کو رنگ دیتے ہیں اور 'دیکھو بہاریں ہولی کی' کہہ کر ہندوستانی تہذیب کا وہ خوشنما روپ پیش کرتے ہیں جسے گنگا جمنی تہذیب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہی سلسلہ آگے بڑھتا ہوا مضطر خیرآبادی کے یہاں اپنی پوری لطافت اور موسیقی کی ریاضت کے ساتھ جلوہ نما ملتا ہے۔ مضطر خیرآبادی نہ صرف ہندی میں شاعری کرتے ہیں بلکہ ان کے یہاں ہمیں موسیقی کی نزاکتیں بھی نظر آتی ہیں۔

ان کی ہندی شاعری کا جائزہ لینے پر ان کی کلیات خرمن میں ہوری، ٹھمری، دوہے، برہا، ملہار بسنت اور دادرا میں تہذیب کی رنگارنگی ملتی ہے۔ یہ ایک ایسا ادبی سرمایہ ہے جو اپنے عہد اور ماحول کی آئینہ داری بھی کرتا ہے اور ہندوستانی تہذیب کی ترجمانی بھی۔ مضطر کی شاعری مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔

ہولی پھاگن کے مہینے میں منایا جانے والا رنگوں کا تہوار ہے۔ جسے ہولی اور ہوری بھی کہا جاتا ہے۔ جو ہندوستان میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ منایا جاتا ہے اسے منانے کی کئی روایتیں ہیں۔ روایتی طور پر اسے دو دن منایا جاتا ہے۔ اس میں عموماً کرشن کا گوپیوں کے ساتھ ہولی کھیلنے کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تہوار کنواریوں کے من میں پیا ملن کی جوت جگاتا ہے، وہ ہولی کے تہوار کا شدت سے انتظار کرتی ہیں یہاں تک کے خواب میں بھی وہی کچھ مجسم ہو کر دکھائی دیتا ہے۔۔ مضطر ملن کی بے قراری کے لمحوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

رات سپنے میں آئے پیا موسے کھیلن ہوری
کیسر پاگ سیس پہ باندھے تا پر رنگ پڑوری
ہاتھ لیے رنگ کی پچکاری ابرا کی ڈارے جھوری
دبے پگ چوری چوری

لیکن جب یہ گوری جاگتی ہے تو حقیقت میں اسے پیا نظر نہیں آتے تو وہ اپنے خوبصورت سپنے کو یچ بتاتی ہے۔ کہتی ہے۔

سووت ماموہے چیت دلائن چوم کے انکھیاں موری
جاگ پڑوں تو کچھ نہ پاؤں کا کھئے مضطر گوری
ابھی کھیلت تھے ہوری
رات سپنے میں آئے پیا موسے کھیلن ہوری

ہولی سے متعلق ان کی شاعری میں برہا کا دکھ حاوی ہے، پیا سے دوری ہولی کی ساری خوشیوں پر اداسی پھیلا گئی ہے۔ ہولی کا آنا اور سیاں کا پردیس میں ہونا برہن کے درد میں اضافے کا سبب ہے پردیسی پیا کے ویوگ نے اسے کچھ اس طرح ویاکل کیا ہے اس کا دل ہر خوشی سے اچاٹ ہو گیا ہے۔

ہوری آئی تو سیاں سدھار گئے/ موہے سونی بجریا پہ ڈار گئے
گوئیاں چاہے نہ جی رنگ کھیلن کو/ مورا مضطر پیا من مار گئے
یا پھر یہاں جذبات کا بہاؤ دیکھیے
ایسی ہوری کے واری/ پیا سدھ لینی ہماری

مضطر خیرآبادی جب ہولی کو بیان کرتے ہیں تو یہ پوری فضا اس ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس میں پھاگن کے مہینے کا ہندوستان نظر آتا ہے۔ گلال اور رنگوں بھرا یہ تہوار کس قدر خوشیوں کو لاتا ہے یہ اس برہن کی تڑپ اور کسک سے بخوبی عیاں ہے، جذبات کا ایک سیلاب ہے جس کے پردے میں تہذیب کے رنگ بھی ہیں، جدائی کے جذبات بھی ہیں اور زبان کی چاشنی بھی۔

بسنت کی بہار پھاگن کے مہینے میں اپنے پورے جوبن پر ہوتی ہے، چاروں طرف سرسوں کے پھول اپنی چھٹا بکھیرتے ہیں اور پورے ماحول کو بسنتی بنا دیتے ہیں یہ موسم یہ مہینہ ناچ رنگ اور گانے کی فضا ہے۔ گوریاں اپنے ہاتھوں میں مہندی رچا کر

بسنت کا استقبال کرنے کو تیار ہیں۔

سب سکھیاں مل مہندی رچائیں/ لال ہیں انگلی کے پورے

بسنت آ گیا جگہ جگہ میلے لگنے لگے اور یہ میلے ہندوستانی تہذیب کا وہ نرالا رنگ سجانے لگے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر مذہب کی تفریق کہیں دور کھڑی مسکراتی ہے۔ مضطر خیر آبادی بھی اس فضا کے رنگ میں اپنے کو رنگ ڈالتے ہیں۔ وہ بسنتی چولہ پہن نذر علی شاہ کے مزار پر ستار لیے بسنت گا رہے ہیں۔

آؤ پیا پھاگن میں من مورا امنگ چلا ہے
نئے سال کو نیگ تو دے دو برس کو درس بھلا
بہت اب تو بچن ٹلا ہے

ہندوستانی تہوار بسنت، بہار، ہولی ہو یا ہندی کی مختلف کلاسیکی اصناف ان میں موسیقیت اور غنائیت ہی ان کا حسن ٹھہرتی ہے ان کے بیان میں لطف تب ہی پیدا ہوتا ہے جب انھیں موسیقی کے فنی تقاضوں کے تحت لکھا جائے۔ مضطر خیر آبادی نہ صرف موسیقی کا علم رکھتے تھے بلکہ انھوں نے باقاعدہ موسیقی کی تعلیم بھی لی تھی۔ بطور خاص وہ ستار کے تاروں پر انگلیوں کی جنبش سے ایک نیا آہنگ پیدا کر دینے میں ماہر تھے، جب وہ ستار کے ساتھ گوری کا شکوہ پیش کرتے ہیں تو یہ معصوم گلہ سیدھے دل پر اثر کرتا ہے۔

موری توری کیسے نبھے پریت/ تو تو روٹھ جات بن بات چیت
مضطر پیا سے کہیو پپیہا/ تم تو رہے سوتنیا کے میت

اردو شاعری میں پیغام اور ہندی میں سندیس پایا جاتا ہے جس کے لیے قاصد کا ہونا لازمی سا ہے۔ یہ پیامبر کبھی باد صبا ہے تو کبھی بادل تو کبھی پپیہا ہے تو کبھی گوکل کا جوگیا۔ اپنے پیا سے بے انتہا محبت کرنے والی معشوقہ مختلف سندیسے گوکل کے جوگیا کے ساتھ مختلف لوگوں کو بھیجتی ہے۔ پہلا پیغام اس نگر کو بھیجتی ہے جہاں اس کا ساجن بس گیا ہے پھر وہ اپنی سہیلی کو پیغام پہنچانے کو کہتی ہے کہ اور اس سے بھی اپنے برہا کا حال بتانے کو کہتی ہے اور یہاں تک کہ محبت کی ماری اپنی سوتن تک کو سندیسا بھیج بیٹھتی ہے۔

کہیو مورا سندیسا گوکل کے جوگیا/ پہلا سندیسا نگر سن کہیو اوون دونے بسیا
تن من مورے آگ لاگی کونا ہے بجھیا/ لگی پر چھینٹ دویا
کہیو مورا سندیسا گوکل کے جوگیا/ تیسرا سندیسا سوتن سن کہیو، او جیا کی سویا
ہمرے پیا کو دکھ نہ دیجو نسدن کچھو بلیا/ تو ہے واہی کی دہیا
کہیو مورا سندیسا گوکل کے جوگیا

یہ سندیسا دل کو چھو لینے والا ہے یہ ایک عورت کی محبت کی انتہا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی جدائی میں تڑپ رہی ہے لیکن اس کی یہ خواہش ہے کہ اس کا معشوق کہیں بھی رہے خیر و عافیت سے رہے جبکہ وہ اس کی سوتن کے پاس ہے لیکن پھر بھی وہ اس کے لیے پریشان ہے۔ اپنے محبوب کے لیے اپنی سوتن کو پیغام اور وہ بھی اس قدر جذباتی پیغام اس کی عکاسی ہندی زبان میں ہی ممکن تھی۔ جسے مضطر نے بخوبی پیش کیا ہے۔

برہا جو کہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور اسے بھوجپوری لوک گیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مضطر کی ہندی شاعری میں برہا ایک مستقل موضوع کے طور پر ملتا ہے، ان کے یہاں چھ برہا کے گیت ملتے ہیں جن میں فراق کی شدت، ہجر کی تڑپ نظر آتی ہے۔ یہ تمام گیت نسوانی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

موری بیس گئی بن شیام سندر برہا کے اس گیت میں فن گائیکی کا خاص خیال رکھا گیا ہے اس میں انترہ پر زور دیا گیا ہے۔ 'سُر'، تال اور لے میں جب کسی گیت کو پیش کیا جاتا ہے تو بہت سی فنی باریکیوں کو دھیان میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ گیت کے آغاز کے دو طریقے ہوتے ہیں ایک مکھڑا دوسرا انترہ

مکھڑا گیت کی پہلی لائن کو کہتے ہیں جبکہ انترہ بیچ میں ہوتا ہے لیکن زیادہ تر موسیقار گیت کی شروعات مکھڑے کے بجائے انترہ سے کرتے ہیں۔ انترہ میں گیت کا بند۔ عام طور پر دو یا تین اور کبھی کبھی زیادہ بھی ہوتے ہیں، پہلے اور تیسرے انترے کی لے ایک سی رکھی جاتی ہے جبکہ دوسرے کو تبدیل کر لیا جاتا ہے۔'

(تحریر و تحقیق سہیل نقش ویب پیج، موسیقار کی دنیا)

برہا کے اس گیت میں برہن اپنی قسمت سے شاکی ہے کہ جیسی قسمت اسے ملی ہے کسی کو نہ ملے۔ نجانے کون سی بدنصیب گھڑی تھی جب اس کی قسمت لکھی گئی خالص نسوانی انداز گیت کا لطف بڑھا دیتا ہے 'آگ لگے ان کرمن پر'

جیسے کرم مو پے داتا دہن ہیں، ایسے کرم کوئی میری نہ پائے
اے ری سکھی وہ کون گھڑی تھی، جن بیر یا ہم کرم لکھائے
آگ لگے ان کرمن کو
جس کا ناؤں پیا مضطر ہے جو جگ ما مضطر کہلائے
نی جینوں من چھین کے مورا بیٹھ رہے کن کے گھر جائے
کا و کروں اب جاؤں کدھر

برہا کے ان گیتوں میں بہار کا موسم، ساون کی گھٹائیں، پپیہے کی صدا، کوئل کی کوک، ڈالیوں کا جھومنا گھٹاؤں کا گھر آنا یہ سب جدائی کے لمحوں کی ٹیس کو بڑھا دیتے ہیں۔ جس کا اظہار مضطر خیر آبادی نے الگ الگ گیتوں میں موسیقی کے سر تال کے ساتھ کیا ہے۔ یہ گیت گائن کی اس کلا کا اظہار کرتی ہیں جسے کلاسیکی موسیقی کہا جاتا ہے۔

انبہ کی ڈال کوئلیہ جو کوکے آئی گھٹا جھوم جھام رے
اٹھ ری پیر جیا کی سنگھا تن بارا کر بچو تھام رے

وہ پپیہے سے بھی درد بھرے انداز میں گزارش کرتی ہے کہ تو نہ کوک۔ تیری کوک میرے درد میں اضافے کا سبب ہے۔ تیری پیہو پیہو میں مجھے پیا کا نام سنائی دیتا ہے۔

کہا مان لے پپیہارے/ نہ لے پیا کا نام
بالی عمریا کو دیکھ/ سونی سجریا کو دیکھ/ ہوک کی کوک کریجوا میں لاگے
کوک سے پھونک نہ جیارا/ نہ لے پیا کا نام

اس میں بطور انترہ 'نہ لے پیا کا نام' اس گیت کا حسن ہے۔

اسی طرح کالی گھٹا نے اس شدت سے اسے بے چین اور بے قرار کیا کہ وہ جوگن بن اپنے پیا کو پانے اور اپنے آپ کو نچھاور کر دینے کا قصد کر بیٹھتی ہے۔

کاری گھٹا کو دیکھ کر یاد آ گئے سنوریا/ لگ گئے بوندوں کے تیر
مٹ گئی سب من کی دھیر/ اُت بجری کی دیا بارت ہے
ات ڈھونڈن لاگی نجریا/ بن کے بروگن فقیر
جاؤں گی مضطر کے تیر/ جوگن سنگ ہو جوگی کا دوں گی
نچھا دوں گی ساری عمریا/ کاری گھٹا کو دیکھ کے یاد آ گئے سنوریا

اسی طرح ملہار میں بھی انھوں نے فراق کے نغمے سنائے ہیں محبوب چھوڑ کر پردیس جا بسا ہے اور گھٹائیں چھا رہی ہیں کوئل سریلی تانیں چھیڑ رہی ہے تو پپیہا بھی بھلا ایسے خوشگوار موسم میں کیسے خاموش رہتا وہ بھی موسم سے لطف اندوز ہو رہا ہے، یہ سب اس بات سے بے نیاز ہیں کہ یہ خوشیوں بھری تانیں کسی کے زخموں کو ہرا کر رہی ہیں یہ وصل کا موسم فراق کے ماروں کے لیے کس قدر مشکل ہے۔ مضطر خیر آبادی کے ملہار کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہندی اور اردو دونوں الفاظ اس خوبصورتی سے برتے گئے ہیں کہ لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

چھا رہی اودی گھٹا جیرا مورا گھبرائے ہے
سن ری کوئل باؤری تو کیوں ملہاریں گائے ہے

او پپیہا آ ادھر میں بھی سراپا درد ہوں
آم پر کیوں جم گیا میں بھی تو ویسی زرد ہوں
فرق اتنا ہے کہ اس میں رس ہے مجھ میں ہائے ہے
کیا یہ بیمار الم اس درد سے بچ پائے گا
یا کہ غم کھا کھا کے یہ فرقت ہی میں مر جائے گا
کچھ تو بولو اے مسیحا کیا تمہاری رائے ہے
چھا رہی اودی گھٹا جیرا مورا گھبرائے ہے

موسیقی کی ایک نیم کلاسیکی صنف ٹھمری ہے اس میں خصوصی توجہ نسوانی آواز کو دے کر لکھا اور گایا جاتا ہے۔ اس کے دو اجزا ہوتے ہیں (1) استھائی اور (2) انترہ۔ اس کی شروعات تو محمد شاہ رنگیلے کے دور میں ہوئی لیکن اصل فروغ اودھ میں واجد علی شاہ کے یہاں ملا۔ واجد علی شاہ کے دور میں لکھی گئی امانت کی اندر سبھا میں اور دیگر اندر سبھاؤں میں بھی ٹھمری ملتی ہے مضطر خیر آبادی کے کلام میں بھی نسوانی لب و لہجے کے ساتھ تین ٹھمریاں ملتی ہیں۔

پی کارن سگری پت کھوئی / ای چتا پر برہن روئی

دوسری ٹھمری میں نسوانی لہجہ ملاحظہ ہو۔

تج دیو ہمار سکھی نینوا نے چینوا / آ گئی برکھا بہار، پڑ گئی پی کی پکار
چھتین اور پر مونگ دلت ہے گھن گرجت دن رینوا / تج دیو ہمار سکھی نینوا نے چینوا

یا اس ٹھمری کو دیکھیے جس میں اپنے محبوب کی خیر خبر نہ لینے پر گوری کس طرح شکوہ کناں ہے کچھ خدشات سے اس کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں جن کا وہ اظہار کر رہی ہے۔

آؤ آؤ نگریا ہماری رے / تم بن سونی سجریا ہماری رے
عہد وفا کو بھول گئے کس خیال میں / کیا تم بھی پھنس گئے کسی گیسو کے جال میں
کیوں نہ لینی کھبر یا ہماری رے

اسی طرح دادرا بھی موسیقی کی ایک صنف ہے لیکن اردو میں دادرا کم لکھے گئے ہیں۔ مضطر نے اس صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

کہاں گری رام موری ماتھے کی بندیا / کہاں گئی رام موری رتین کی نندیا

دو مصرعوں میں پوری کہانی بیان کر دینا غزل کا فن ہے جس طرح سے غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح ہندی میں بھی دو ہم قافیہ مصرعوں پر مشتمل شاعری ہوتی ہے جسے ایک صنف کی شکل دی گئی ہے۔ اسے دوہا کہا جاتا ہے لیکن غزل کے شعر اور دوہے میں فرق یہ ہے کہ غزل کے اشعار کے مختلف اوزان اور بحریں ہوتی ہیں جبکہ دوہے کی دو مخصوص بحریں ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین 'ادبی اصناف' میں دوہا کی تعریف لکھتے ہیں۔

''یہ عروضی صنف ہے جو ایک شعر کے برابر ہوتی ہے اس کے ہر مصرعے میں 23 ماترائیں ہوتی ہیں۔ مصرعے کے پہلے جزو میں 13 ماترائیں ہوتی ہیں، اس کے بعد وقفہ اور دوسرے جزو میں 11، ماترائیں۔ اردو کے لحاظ سے اس کا مثالی وزن ہے
فعلن فعلن فاعلن فعلن فعلن فاع '' (اصناف ادب: ڈاکٹر گیان چند جین، ص 81,82)

دوہے کو اردو میں بھی ہندی کی طرح اختیار کیا گیا ہے اور شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے جس کا آغاز امیر خسرو کے زمانے سے ہوتا ہے۔ شعرا نے اس میں تصوف کے بڑے بڑے مسائل بڑی آسانی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

تن پایا تب من ملا من پایا تب پیو

پی مورا میں پیو کی، پی دن ہیں میں رین   جیسے نجریا ایک ہے دیکھت کے دو نین
گوکل کی سی ناگری متھرا کا سا گاؤں   تم ہو مالک برج کے کرشن تمہارا ناؤں
تن میٹے من وار دے یہی پریت کی آن   جو اپنا آپا تجے سو وا کا داسی جان

مالک ہی کے نام کی مالا پھرت لوگ   مالک میٹے تب مٹے نپٹ بپت کا روگ
جب چتا پڑ جات ہے چھوڑ دیت سب ہاتھ   دیت اندھیری رین میں کب پرچھائیں ساتھ

مضطر خیر آبادی کے یہاں ہندی دوہے تو ہیں ہی ساتھ میں فارسی اردو اور اشعار بھی ملتے ہیں۔

درشن جل کی پیاس ہے، کچھ بھی نہیں ہے چاؤ   تم جگ داتا بج رہے تو کام ہمارے آؤ
نور دیدار سے ہیں سب کی منور آنکھیں   ایک مجھی کو میرے اللہ نے دیں تر آنکھیں
ہمہ مصروف طرب از پے غمخواریٔ دل   منم و گریۂ دل، نالۂ دل، زاریٔ دل
سب کے پیا ہرا نہیں کوئی   پی کارن سگری پت کھوئی
ڈھونڈتی ہیں تجھے یار ستمگر آنکھیں   زندگی میری کیے دیتی ہیں دوبھر آنکھیں
تا کجا اے ستم ایجاد و جفا کاریٔ دل   قابل رحم شدہ حالت بیماریٔ دل
بیچ بھنور میں موری ناؤ ڈبوئی   پی کارن سگری پت کھوئی
بے دردی وہ پی ملے کہ مضطر جن کا ناؤں   من بس کر کے تج دیو آپ براجیں گاؤں
پہلے دل لے گئے دکھلا کے فسوں گر آنکھیں   اب ملاتے نہیں اللہ اکبر آنکھیں

مضطر کی کلیات 'خرمن' میں ہندی اور اردو کے امتزاج کی خوبصورت شاعری دیگر عنوان سے لکھی ملتی ہے۔

دشمن جاں زلف پیچاں کی ادائیں ہو گئیں   کیا تماشا ہے کہ پریاں بھی بلائیں ہو گئیں
درک درک چھتیاں گئیں لوٹی بھری آس   پھرک پھرک انکھیاں رہیں پیا نہ آئے پاس
سد راہ آرزو میری وفائیں ہو گئیں   دکھ سکھ دونوں ایک ہیں دکھ ہے ہمرا سکھ
سکھ کے کارن دکھ بھئے رہ گئے دکھ ہی دکھ   چرخ پر جا کر دعائیں بددعائیں ہو گئیں

مجموعی طور پر مضطر خیر آبادی کے ہندی کلام میں پورا ہندوستان رچا بسا نظر آتا ہے، چاہے تہذیبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے، چاہے لسانی قدروں کی تلاش کی جائے، یا پھر کلاسیکی موسیقی کے عناصر ڈھونڈے جائیں، ان کی اردو شاعری سے ہٹ کر صرف ہندی شاعری کے اس مختصر جائزے سے ہی یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اردو اور ہندی کے باہمی رشتے اور مزاج کو انھوں نے جس فن کاری کے ساتھ برتا ہے وہ انھیں اس روایت کا پاسدار بناتا ہے جس کا آغاز ہمیں امیر خسرو کے ہندی کلام جس میں دوہے بھی ہیں، لوک گیت بھی اور کہہ مکرنیوں کی شکل میں ملتا ہے۔

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب جسے ہم اردو کے دور اولین میں بھی دیکھتے ہیں اور دکنی ادب میں بھی پاتے ہیں جہاں ہندوستانی تہذیب و تمدن کا دامن تھامے ہندی اردو اور دکنی زبان کے اشتراک کے ساتھ، قلی قطب شاہ، وجہی، نشاطی، غواصی، ولی اورنگ آبادی کے یہاں جلوہ نما ہے۔

تہذیب کا یہی رنگ شمالی ہند میں حاتم، فائز، مرزا مظہر جان جاناں سے لے کر عصر حاضر تک پہنچتا ہے۔ ملک محمد جائسی، مبارک علی بلگرامی اور اردو کے پہلے ڈرامہ نگار سید امانت لکھنوی کے ڈرامے اندر سبھا میں نظر آتا ہے۔ مضطر کی ہندی شاعری ہندوستان کے اس صوفیانہ ماحول اور پیغامات کی بھی ترسیل کرتی ہے جو موسیقی کے رچاؤ سے فروغ پاتے ہیں، رقص اور موسیقی دونوں ہی کہیں نہ کہیں وجدانی کیفیت کے مظہر بھی ہیں، صوفیا کرام کے یہاں جو وجدان و ادراک کی منازل ملتی ہیں ان تک پہنچنے میں میں ہندوستانی رنگ با آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے اور یہی رنگ ہمیں مضطر خیر آبادی کی ہندی شاعری میں بدرجہ اتم ملتا ہے۔

■

Dr. Ishrat Naheed
504/122 Tagore Marg, Near Shabab Market
Lucknow (U.P.) 226 020
Mob 09598987727

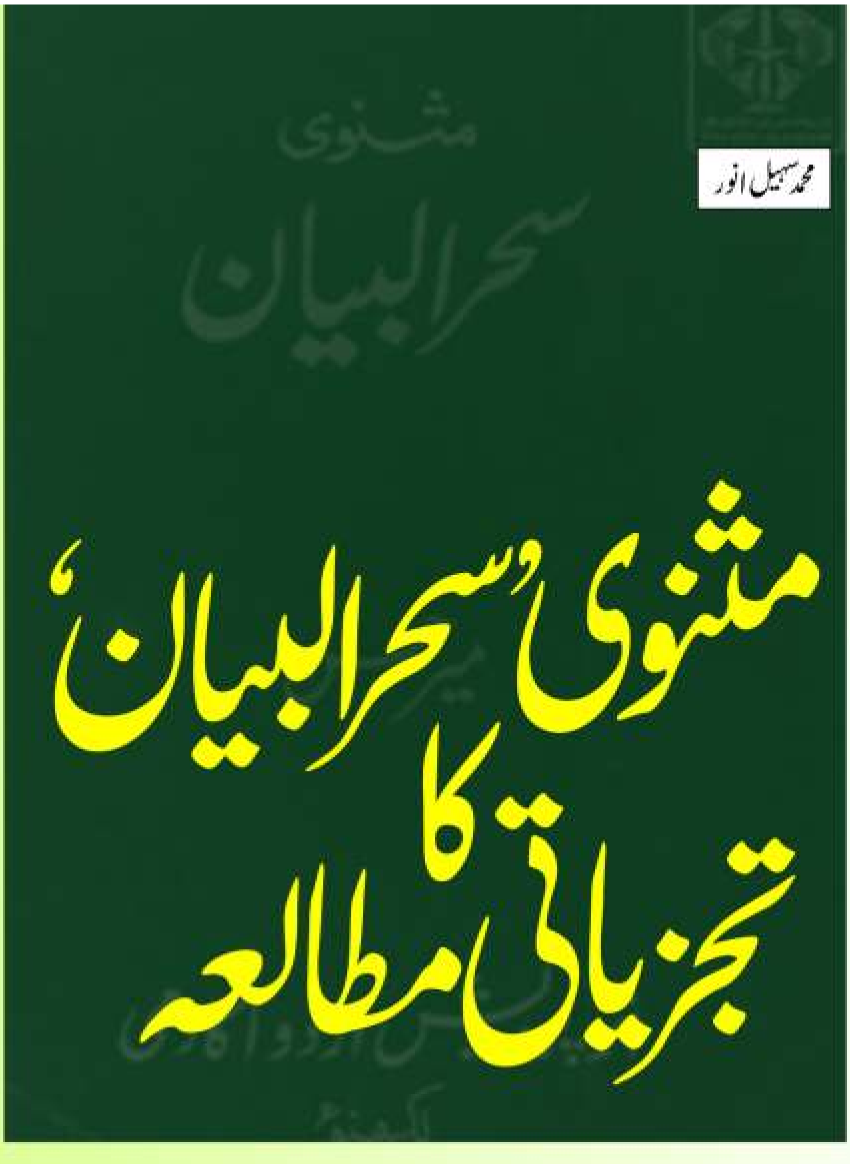

مثنوی 'سحرالبیان' کا تجزیاتی مطالعہ

محمد سہیل انور

مثنوی 'سحرالبیان' کا سنہ تصنیف 85-1784 بمطابق 1199ھ ہے اور اس کا سنہ اشاعت 1805 / 1230ھ ہے۔اس کے مصنف میر غلام حسین ضاحک کے فرزند ارجمند میر غلام حسن المعروف میر حسن ہیں اور یہ مثنوی پہلی دفعہ 1805 / 1230ھ میں ہندستانی پریس کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

نہیں مثنوی، ہے یہ اک پھلجڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان
نہیں مثنوی، ہے یہ سحرالبیاں

مذکورہ قطعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ یہ صرف مثنوی نہیں بلکہ مختلف خصوصیات کی حامل ہے۔ زیرنظر مثنوی میں ایک نئی طرز ہے اور نئی زبان بھی ہے جس کے باعث اس کو 'سحرالبیان' قرار دیا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ جب یہ سحرالبیان ہے تو لازمی ہے کہ اس کو 'سھل البیان' کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تمام تر مثنوی کو مسلسل موتی کی ایک لڑی سے تشبیہ دی گئی ہے۔موتی کا ایک دانہ بھی ادھر سے اُدھر ہوا گویا موتی کی یہ لڑی یا تسبیح کے دانے کا پورا شیرازہ ہی بکھر جائے گا جس میں الفاظ و معانی کا خزانہ ہے تو تشبیہات واستعارات کا فسانہ بھی۔

اب تصور کریں کہ مندرجہ بالا تمہید کی روشنی میں اس مثنوی کی قرات اور اس کی سحرالبیانی کی تفہیم کے مراحل کس قدر دشوار ہیں؟ لہٰذا اس کی نزاکت کو بجا طور پر اگر نہیں پرکھا گیا تو کیا ہم اس مثنوی کے صحیح اغراض و مقاصد کی تکمیل اور اس کے سیاق وسباق تک رسائی پا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہوگا! چنانچہ مثنوی سحرالبیان کو محض قدیم و پرانی داستانوں اور افسانوں پر مشتمل ایک منظوم ومنفرد لب و لہجے کی عشقیہ کہانیوں تک ہی محدود کر دینا انصاف طلب بات نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے پس پردہ مصنف کے سامنے پرانے زمانے کے اشرافیہ طبقوں مثلاً سلاطین وامراء، وزرا یا اصحاب مسند کی اولادوں کی نسل در نسل پرورش و پرداخت کے ساتھ ساتھ اصلاحی، اخلاقی، سماجی وتہذیبی طور طریقوں وسلیقوں اور حکمت عملی کا ایک نادر و نایاب نمونہ اسباق و کتابی نصاب تیار کیا جاتا تھا مزید جس کی روشنی میں صاحبزادے وصاحبزادیوں کی صحیح ومناسب سمت و رفتار میں تربیت ونشوونما اور ذہنی افتادگی کی جانچ و پرکھ ہو سکے۔

وضاحت طلب بات یہ ہے کہ کس طرح مثنوی 'سحرالبیان' کے ذریعے متعلقہ دور کی معاشرتی زندگی کا خاکہ قارئین کے سامنے منعکس ہو جاتا ہے اور کس طرح باذوق قاری وطالب علم (خواہ وہ منظومات ہو یا منثورات) اس کتاب کے مطالعے کے بعد اُس دور کی تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی وسماجی قدروں و دیگر مختلف امور سے نہ صرف بخوبی واقف ہوسکتا ہے بلکہ متعلقہ ادوار کی معاشرتی صورت حال سے روبرو بھی ہوسکتا ہے۔ غالباً اسی لیے ایک معتبر ناقد جناب شارب ردولوی نے اپنی مبسوط کتاب 'جدید اردو تنقید: اصول ونظریات' میں ایک مقام پر ممتاز نقاد ممتاز حسین کے حوالے سے ایک مقام پر ممتاز صاحب کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ شاعر و ادیب کو، مورخ سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں:

''ایک ادیب و شاعر، مورخ سے زیادہ حقیقت پسند ہوتا ہے، مورخ تو اسی بات کو دہراتا ہے جو ماضی میں رونما ہوئے ہیں، جبکہ شاعر وادیب ماضی میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات سے آگاہ تو کرتا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ، مستقبل کے خدشات سے بھی متنبہ کرتا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک ایک شاعر وادیب، مورخ سے بھی زیادہ حقیقت پسند ہوتا ہے اور معاشرے کے معاملات سے باخبر رہتا ہے۔''

(جدید اردو تنقید: اصول ونظریات از شارب ردولوی ص)

اوّل الذکر زیرنظر کتاب کے مقدمہ سے خود مصنف / مرتب کی چند عبارتیں دیکھیں اور بعد ازاں چند منظوم بندیں ملاحظہ ہوں، جس سے اس دور کی تصاویر نظروں کے سامنے منعکس ومنکشف ہوجاتی ہیں:

''سحرالبیان میں معاشرت نگاری لباس اور زیورات تک محدود نہیں پورے جاگیردارانہ ماحول کو محیط ہے۔ محل کی سجاوٹ خاصوں و کنیزوں کی چہل پہل، خواتین کا رہن سہن، امیروں کی ٹھاٹ اس کے درباری اور خدام، پالکی اور نالکی کو اُٹھانے والے کہار، شاہی جلوس میں شادیانے بجانے والے نقارچی... ارباب نشاط وغیرہ کی موجودگی، شہزادے کی تربیت کے لیے معلّم، اتالیق، منشی ادیب کی تقرری، نصاب تعلیم معانی ومنطق، بیان و ادب، علم صرف ونحو، حکمت۔۔۔وغیرہ کے رواج اور مختلف رسوم کا کم وبیش ذکر ملتا ہے۔''

(مثنوی سحرالبیان مرتبہ ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی مقدمہ ص 41-40)

مذکورہ عبارت کی وضاحت کے لیے چند منظوم

بندسے کریں تو اس دور کی تصویریں مزید واضح ہو جائیں گی۔

عمارت کی خوبی، دروں کی وہ شان
لگے جس میں زربفت کے سایبان
چقیں اور پردے بندھے زر نگار
دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا
کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا
دیے چار سو آئینے جو لگا
گیا چوگنا لطف اس میں سما
وہ مخمل کا فرش اس میں ستھرا کہ بس
بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
چھپر کھٹ مرصع کا دالان میں
چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں

مزید دیکھیں مصنف میر حسن نے کتنی خوبصورتی سے بناؤ سنگار، تزئین کاری، نازک خیالی، جزئیات نگاری کا سہارا لے کر بالخصوص متعلقہ دور کے معاشرے و ماحول اور بزم آرائیوں کی خوشنما شکل کو الفاظ و مرصع نگاری کا جامہ پہنایا ہے۔

کوئی آرسی اپنے آگے دھرے
ادا سے کہیں بیٹھی کنگھی کرے
مقابا کوئی کھول مسّی لگائے
لبوں پہ دھڑی کوئی میٹھی لگائے
کھڑی ہو کے دو گھونٹ حقے کے لے
چبا پان اور رنگ ہونٹوں کو دے
انگوٹھے کی لے سامنے آرسی
وہ صورت کی دیکھ اپنی گلزار سی
اُلٹ آرسی اور مہرئی کے چاک
نئے سرے سے انگیا کو کر ٹھیک ٹھاک
بنا کنگھی اور کر کے ابرو درست
جھٹک دامن اور ہو کے چالاک و چست
دوپٹے کو سر پہ اُلٹ اور سنبھال
یکایک وہ صف چیر آنا نکل
پکڑ کان اور گھنگھروؤں کو اُٹھا
پہن پاؤں میں اور سر سے چھوا
اِدھر اور اُدھر رکھ کے کاندھے پہ ہاتھ
چلے ناچتے آنا سنگت کے ساتھ
فتح چند کے ہاتھ کی مورت ہے اک
لجائی ہوئی چاندی صورت ہے اک
کبھی ناچنا اور گانا کبھی
رجھانا کبھی اور بتانا کبھی
خوش آوازیاں اور گانا خیال
دکھانا ہر اک دم میں اپنا خیال

مذکورہ منظوم منظر نگاری و محاکات سے اُس دور کے متعلقہ امور، تہذیب و ثقافت، رسم و رواج، سولہ سنگار، رقص و سرود کے علاوہ کئی اور محرکات سے بھی ذی شعور قاری متعارف ہو سکتا ہے۔ مثلاً فتح چند کے ہاتھ کی مورت کا ذکر اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ جس طرح ماضی بعید میں قدیم طرز پر آزر (پدر ابراہیمؑ) کی مصوری و نقاشی بامِ عروج و احتشام کے ساتھ شہرت پذیر تھی، غالباً اسی طرح میر حسن نے اپنے دور کے شہرت یافتہ مصور یا بُت تراش کا اپنی مثنوی میں اشارتاً ذکر کر کے اس دور کے تاریخی، سماجی و ثقافتی رموز سے پردہ اُٹھایا ہے یوں کہا جائے کہ متعلقہ دور کی اہم معلومات سے بہرہ ور کیا ہے تو شاید بے محل نہ ہوگا۔

یہاں ایک نکتے کا ذکر کرنا ناگزیر ہے کہ بعد کے دور میں عربی، فارسی اور اردو میں فرداً فرداً ہر صنف میں برملا اظہار تھا لیکن میر حسن کی مثنوی یا اس قبیل کی دوسری اصناف کا مطالعہ کریں تو ایسا گمان گزرتا ہے کہ اس دور کے مصنف و تخلیق کار مختلف اصناف پر بیک وقت عبور و مہارت رکھتے تھے لہٰذا مثنوی یا عشقیہ داستانوں پر طبع آزمائی سے قبل حمد، نعت، منقبت، مناجات یا دیگر اہم امور پر منظوم کلام پیش کرنے کو ترجیح دیتے تھے بعد ازاں مدعا یا زیرِ بحث موضوع پر زور آزمائی ہوتی تھی۔ زیرِ نظر اشعار بطور نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

حمد و ثنا:

نہ بھول اپنے خالق کو اے دل نہ بھول
کہ یاد اس کی ہے دونوں جہاں کا حصول
اسی کو مددگار اپنا سمجھ
اسی کو فقط یار اپنا سمجھ
زباں تیری گویا رہے جب تلک
اور امکان سخن کار ہے جب تلک
کیا کر ثنائے جہاں آفریں
سخن کوئی بس اس سے بہتر نہیں

نعت و منقبت:

بھروسا کسی کا نہیں اک ذرا
ہے ان کا ہی ہم کو فقط آسرا
نبیؐ و علیؓ اپنے ہیں پیشوا
نبی و علی اپنے ہیں رہنما
انھیں سے ہے کونین میں ہم کو کام
وے مولا ہیں میرے، میں ان کا غلام
درود ان پر اور ان کی اولاد پر
بہ دل بھیجتا ہوں میں شام و سحر

صرف اتنا ہی نہیں کہ مصنف کو منظوم پیرائے میں حمد، نعت، منقبت، مناجات پیش کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا بلکہ منظوم مثنوی کے متن کا مطالعہ کرنے کے دوران ایسا گمان گزرتا ہے کہ تخلیق کار نے کس مہارت سے محاورے، ضرب المثل، الفاظ و بیان کی چابکدستی وغیرہ سے مثنوی کو سچی حکایات و کہانیوں سے مزیّن و آراستہ کر دیا ہے۔ متن کے مطالعے کے دوران ایسا سان و گمان میں بھی نہیں گزرتا کہ قاری، مافوق الفطری عناصر یا پری، شہزادہ، شہزادی یا پری زادیوں کی عکسی و فرضی داستانوں کی سیر کر رہا ہے بلکہ اگر ذی شعور قاری متون کے اصول و ضوابط سے، صرف و نحو، الفاظ و معانی اور مناظر و محاکات سے بخوبی واقف ہے تو اُس کو حقیقی داستانوں و کہانیوں کا لطف ملتا ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ یہ مثنوی نہیں بلکہ اہلِ نظر و اہلِ ذوق کے دلوں کو بہلانے و لبھانے کے لیے ایک 'موہنی منتر' کے مترادف ہے، جس سے قاری نہ صرف محظوظ و مسرور ہوتا ہے بلکہ عبرت آموز و فکر انگیز کہانیوں کی سیر کرتے کرتے مقامِ عبرت سے بھی دو چار ہوتا ہے۔ جس طرح، شیکسپیئر کے ڈرامے 'میکبیتھ' میں مختلف ایکٹ اور پلیز سے یکساں نہیں بلکہ منفرد طور پر محظوظ ہوتے ہیں۔ من و عن مثنوی سحر البیان کی ہر داستان میں سحر انگیزی کا وہ دفتر وا ہوتا ہے کہ مصنف کی طبع آزمائی اور ذہنی افتادگی پر کلمہ تحسین یا واہ! کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُسی طرح مثنوی سحر البیاں، بظاہر عشقیہ داستان ہے لیکن اس میں بھی ڈرامے کے مناظر کا گماں دورانِ مطالعہ گذرتا ہے۔ حالانکہ اس مثنوی میں بھی فصاحت و بلاغت کا دریا رواں دواں ہے اور آج کے تکنکی و ڈیجیٹل دور میں ہر کس و ناکس یا یوں کہیں کہ باذوق قاریوں و کتب بینوں کا فقدان ہے نتیجتاً پرانے دور کی اس قدر مقبول و مرغوب صنف کو پڑھنے کی کس کو فرصت ہے؟ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آج کے زرق و برق، تیز رو اور ڈیجیٹل دور میں اول اور امتیازی مقام حاصل کرنے کی للک میں ذہنی ورزش و ذہنی ادراک سے بھی ہم دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ غالباً اسی لیے بے باک ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک موقع پر اردو کی داستانوں و اُن میں موجود مافوق الفطری عناصر و مقفّٰی و مسجع عبارت کی گراں باری کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ:

''جو انسومنیا (nsomnia) کا مریض ہو وہ فسانۂ عجائب پڑھے، اسے نیند آ جائے گی۔''

(اردو داستانوں پر ایک نظر از کلیم الدین احمد ص)

گو کہ عبارتوں و تحریروں میں مقفّٰی و مسجع عبارت یا فصاحت و بلاغت کی ترکیب بھی آج کے ڈیجیٹل دور میں ذہنی ٹانک کا کام کر سکتی ہے کیونکہ اس تیز رفتار دور میں

سبقت و فوقیت حاصل کرنے کی ہوڑ مچی ہے جس کے باعث انسان مختلف اقسام کے ذہنی امراض مثلاً انسومنیا، احساسِ کمتری، خودغرضی، شکست خوردگی، ناکامی و نامرادی اور بالآخر عدم توازن کے احساسات کے تلے دبا جا رہا ہے تو لازم ہے کہ ان امور سے بخوبی نجات پانے کے لیے ذی شعور و حساس قاری و افراد کو فرحت و انبساط پہنچانے کی غرض سے اس قسم کی مثنویاں و داستانیں یقیناً ذہنی ٹانک کا کام کریں گی کیونکہ آج کا بشر، برقی، تکنیکی و ڈیجیٹل آلات کے کثرت الاستعمال کے سبب اُس کے مضر اثرات کا مرتکب بھی ہوتا جا رہا ہے اور جلد ہی تھکا دینے والے اس فعل و عمل سے نجات کے لیے کتب بینی کا ذوق ہی ان اقسام کے مسائل کا سدِّ باب ہو سکتا ہے کیونکہ بقول عربی مقولہ 'و خیرُ جلیسٌ فی الزّمان کتابٌ' (ہر زمانہ میں کتاب یا شغلِ کتب بینی بہترین دوست ہے۔) ہی شاید اس قسم کے مسائل کا واحد و موثر حل ہو سکتا ہے۔

انسان کے ذریعے ایجاد و اختراع کیے گئے آلات و برقی و تکنیکی اشیا فوری طور پر تفریحِ طبع کے سامان بہم پہنچا سکتے ہیں لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ انسان ان آلات سے جز وقتی ہی سہی اُکتانے یا مضطرب ہونے لگتا ہے ان حالات میں مافوق الفطری عناصر (Super natural elements) یا داستانوی قصے کہانیاں اس خلا کو پُر کرتی ہیں اور سنجیدہ قاری اپنی زندگی کی ناکامیوں، اُکتاہٹ اور مایوسی سے نکلنے کے لیے مثنویوں، خیالی داستانوں سے خود کو مسرت و شادمانی بہم پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ مثنوی سحر البیان کا مطالعہ آج ڈیجیٹل دور میں بھی انسان و افراد کی جز وقتی پریشانیوں، تنہائیوں کو دور کرنے کا محرک ثابت ہو سکتا ہے۔

دراصل 'مثنوی سحر البیان' کی معرفت سے ہم میر حسن کی فنی خوبیوں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ اُن کی متعدد خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مثنوی میں منظر نگاری کے محرکات کو خوبصورتی سے برتنے یا تلاش کرنے میں اس حد تک کامیاب نظر آتے ہیں یا مہارت رکھتے ہیں کہ سنجیدہ قاری الفاظ و معانی، تشبیہ و استعارے کی ترکیبوں اور برمحل استعمال سے منظوم متون کے مطالعے میں اس قدر غرق ہو جاتا ہے اور اس خیال سے بے نیاز ہو جاتا ہے کہ وہ خیالی عشقیہ داستانوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے یا پھر ڈراموں کی مانند اسٹیج کی دنیا سے متعارف ہو رہا ہے۔ دراصل اسی میں ایک عمدہ مثنوی کی دلکشی، دلفریبی کا راز بھی مضمر ہے۔ مصنف منظر نگاری کے ذریعے وہ سماں باندھتے ہیں کہ تخلیق کار کی فنی خوبیوں کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ حالانکہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی پوشیدہ ہوتی ہیں لیکن سرِ دست خوبیوں کی بہتات میں قلیل خامیاں بھی نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ طوالت کے خوف کے باعث اب اس موضوع پر کسی اور موقع پر بحث ہوگی۔ خوبیوں کا عالم تو یہ ہے کہ منظر نگاری، زبان شستہ، طرزِ بیان کی دلکشی اور غزل کا لب ولہجہ، مثنوی کی انفرادیت میں چار چاند لگا دیتا ہے اور ہم طویل بندوں اور منظوم خیالوں سے مضطرب نہیں ہوتے ہیں۔ بطور نمونہ کلام چند بندیں ملاحظہ ہو۔

گلوں کا لب نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں منھ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

اور یہاں دیکھیں منظر نگاری، نہ صرف قابلِ دید ہے بلکہ قابلِ ستائش بھی۔

گلابی سا ہو جانا دیوار و در
درختوں سے آنا شفق کا نظر
وہ چادر کا چھٹنا وہ پانی کا زور
ہر اک جانور کا درختوں پر شور
وہ سروِ سہی اور وہ آبِ رواں
وہ مستی سے پانی کا پھرنا وہاں
وہ اُڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا
کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ
وہ رقصِ بتاں وہ ستھری الاپ
وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ

حالانکہ آج کے ڈیجیٹل، زرق و برق اور تکنیکی و سائنسی دور میں اس قسم کی تزئین کاری کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے کیونکہ کمپیوٹر اسٹیج میں اور برقی آلات کے وافر تعداد میں مہیا ہونے کے سبب شب و روز دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے لیکن زائد از دو صدی قبل میر حسن کی ذہنی افتادگی اور پھر الفاظ و تشبیہات کی کثرت میں برمحل استعمال اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مصنف کو فطری و قدرتی عناصر سے کس قدر وابستگی تھی کہ انہوں نے الفاظ کی تراکیب کا سہارا لے کر کس قدر پُر اثر انداز میں فضا، سہانے مناظر و سماں، مختلف اقسام کی رنگارنگی، شفق، آفتاب کی سرخی و تمازت، مہتاب کا نور، ستاروں کا جھرمٹ، بادِ صبا کا سرسرانا، ریت و ریگستان کی خاموشی و سناٹے کو الفاظ و معانی کا جامہ پہنایا ہے اور تشبیہات و استعارات کو موتیوں کی لڑی کی مانند پرو کر رکھ دیا ہے۔ میر حسن نے اس منظر نگاری، محاکات و سماں کو گاہے بہ گاہے اپنی اس مثنوی میں پیش کرنے میں اپنی مہارت کا اس قدر خیال رکھا ہے کہ یہ مثنوی اسم بامسمّی یعنی 'سحر البیان' اور 'موتیوں کی ایک لڑی' سے تشبیہ دے ڈالی جو حق بہ جانب ہے۔

غرض کہ یہ کہنے یا لکھنے میں تامل نہیں اور اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں ہو سکتا کہ پرانے قصے کہانیوں و داستانوں کے مطالعے میں آئی کمی و فقدان کے سبب ہی آج معاشرے و سماج میں یکسانیت، رواداری، اخلاقی بلندیاں و ذمے داریوں و حصے داریوں میں پستی، کج روی و تنگ نظری کے عناصر کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ان خود غرضیوں و تنگی و تنفر والے معاشرے میں قدغن لگانا مقصود ہو تو اس قسم کی داستانوں و کہانیوں کو از سرِ نو ایام طفلی و کم سنی میں بچوں کو لائق و فائق استادوں کے ذریعے یا اُن کی نگرانی میں درس دینا ناگزیر ہو جانا چاہیے تاکہ سنِ بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے ان بچوں کو، جو اب بالغ النظر ہیں، اپنی ذمے داریوں اور ساتھ ساتھ سماج و معاشرہ کی ذمے داریوں کا بروقت احساس ہو جائے تو یہ نہ صرف متعلقہ خاندان، سماج و معاشرہ بلکہ ملک و قوم کے لیے ایک صحت مند شہری کے فرائض انجام دینے والے افراد کے لیے ایک نعمت ہوگی۔ جن اصولوں، تہذیبوں اور اخلاقی قدروں کی موجودگی صحت مند سماج و معاشرے کی تہذیب و ثقافت کو مثبت شکل دینے اور بلندیوں تک پہنچانے میں اہم رول ادا کر سکتی ہیں اور اسے استحکام بہم پہنچانے میں اہم رکن ثابت ہو سکتی ہیں۔ آج کے اس کمپیوٹر دور میں اور ڈیجیٹل کی فراوانی میں ہمارے سماج و معاشرے میں جس قسم کی بے راہ روی، بداخلاقی، سماجی و تہذیبی زوال دیکھنے کو مل رہے ہیں، شاید اس قسم کی داستانوں، مثنویوں کے صحیح اغراض و مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے درس و تدریس کی پیش رفت کی جائے تو وہ دن دور نہیں کہ معاشرے سے بہت ساری چھوٹی چھوٹی برائیاں نہ صرف دور ہوں گی بلکہ ایک صحتمند معاشرہ بھی معرضِ وجود میں آ سکتا ہے بشرطیکہ ہم مندرجہ بالا امور پر صدقِ دل سے اور دیانت داری و ایمانداری کے اصول و تقاضوں پر عمل پیرا ہو کر کوئی حکمتِ عملی اپنائیں۔ غالباً ماضی میں اس مثنوی یا اس قبیل کی دوسری داستانوں و کہانیوں کے تخلیق پانے کے پسِ پردہ بھی یہی عوامل و محرکات کارفرما رہے ہوں گے۔

■

Mohd Suhail Anwar
Asst. Prof. Urdu Department
Magadh Mahila College
Patna-800001 (Bihar)

ریحان حسن

شکیل الرحمٰن کی گورونانک شناسی

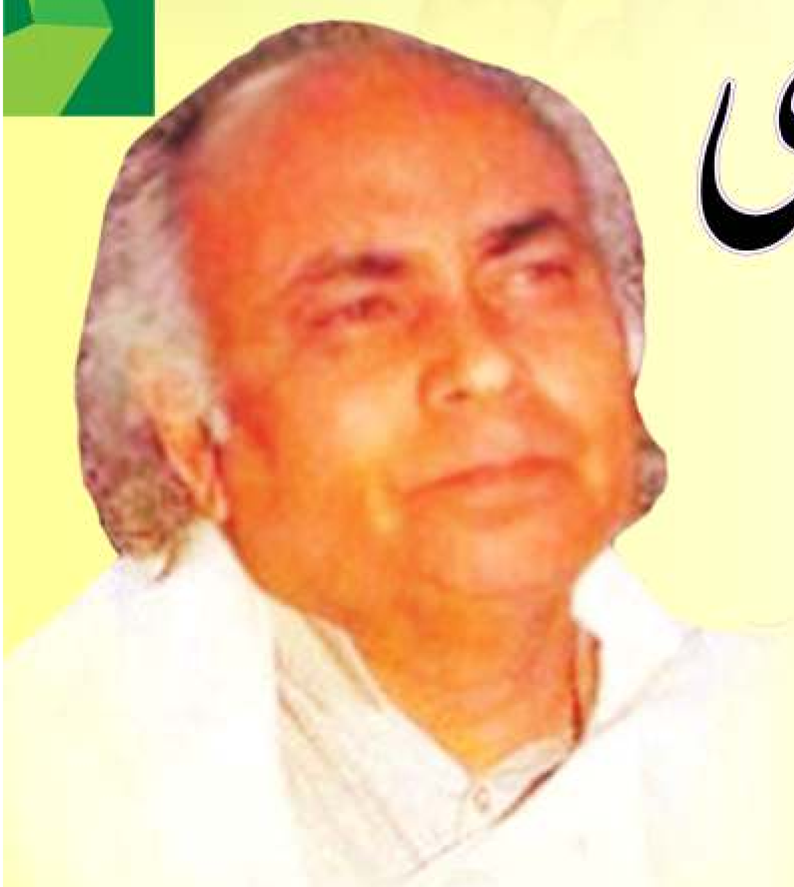

پندرھویں صدی میں بابا گورو نانک دنیا میں وحدانیت کا نغمہ سنانے کے لیے آئے اور انھوں نے اپنے فرمودات اور پیغامات کے ذریعے خواب غفلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو بیدار کیا۔ بابا نانک نے اپنے ارشادات اور فرمودات میں روحانیت اور معرفت پروردگار کا جو لازوال درس دیا ہے اس پر ہر صاحب فکر و نظر نے مدح وثنا کے ڈونگرے برسائے ہیں۔ یوں تو ان کے تمام اقوال واعمال سے وحدانیت کا بہشتی نغمہ ہی پھوٹتا ہے لیکن ''جپ جی صاحب'' میں معرفت پروردگار کا جس انداز سے انھوں نے درس دیا ہے وہ بے مثال ہے۔

دراصل جپ جی صاحب گورو گرنتھ صاحب کی پہلی بانی ہے جس میں 38 پوڑیاں اور 2 اشلوک ہیں ایک اشلوک ابتدا میں درج ہے اور دوسرا سب سے آخر میں، جپ جی صاحب کے پہلے حصے کا آغاز مول منتر ''ایک اونکار ست نام کرتا پرکھ نربھو نروے اکال مورت اجونی سے بھنگ گر پرساد'' سے ہوتا ہے۔ سکھ روایات کا ماننا ہے کہ تمام گورو گرنتھ صاحب کی بانی جپ جی صاحب کی تشریح ہے اور جپ جی صاحب مول منتر کی توضیح۔ سکھ روایات کا یہ بھی ماننا ہے کہ تین منتر کا ورد انسان کرکے روحانی منازل طے کرسکتا ہے اور وہ منتر اس طرح ہیں بیج منتر (ایک اونکار) گرمنتر (واہ گورو) اور مول منتر، چونکہ جپ جی صاحب میں مول منتر ہے اسی لیے اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر دنیا میں بولی جانے والی بیشتر زبانوں میں اب تک تراجم ہو چکے ہیں۔ اردو زبان میں ماسٹر لال سنگھ آنند نے 'ورد حق' سردار کرتار سنگھ کیملپوری نے 'جپ جی صاحب موسوم بہ دعائے سحری' جسونت سنگھ حیات پوری نے 'جپ جی صاحب کا اردو نثری ترجمہ' اور خان بہادر خواجہ دل محمد نے جپ جی صاحب کا اردو نظم میں ترجمہ کرکے اردو داں طبقے کو بابا نانک کے تفکرات وتخیلات سے متعارف کراتے ہوئے عرفان خدا میں اضافہ کیا ہے۔ منجملہ اردو تراجم میں شکیل الرحمٰن کا ترجمہ اس اعتبار سے قابل التفات ہے کہ انھوں نے جپ جی صاحب کی ہر پوڑی کے مفاہیم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جس سے جپ جی صاحب کی افادیت اور اہمیت کا قاری کو بخوبی احساس ہوتا ہے کیونکہ اس میں جو لفظوں کا طلسم ہے وہ دلوں کو مسخر کر لیتا ہے صرف شرط یہ ہے کہ انسان لفظوں کے جادو سے آشنا ہو جس قدر لفظوں کے سحر سے آشنائی ہوگی اسی شدت سے جپ جی صاحب کی پوڑیوں کی روح تک انسان پہنچ سکے گا۔ صداقت تو یہ ہے کہ:

''جپ جی صاحب کے ذریعے بابا گورو نانک کے داخلی تجربوں کی وہ شعاعیں سامنے آئی ہیں جو ان کے باطن کی تیز روشنی کا احساس عطا کرتی ہیں۔ پہلی آواز ہی سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ بس ایک ہی سچائی کا عرفان ہے، ایک ہی سچائی ہے جسے پانے کے لیے دل ودماغ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہوئے ہیں یا یہ کہیے کہ اس سچائی کا تقاضا تھا کہ دل ودماغ ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں۔''

(شکیل الرحمٰن، جپ جی صاحب، اصل مع مقدمہ ومفاہیم، طبع اول عرفی پبلی کیشنز 25 نومبر 1996ء ص 7)

دراصل جپ جی صاحب کی پوڑیوں کا مطالعہ انسان کو صبح کی لطیف اور خوشگوار ہوا کا احساس دلاتا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے جپ جی صاحب کے حسن بیان پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے وہ قابل غور ہے۔ جپ جی صاحب کے متعلق ان کا یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے:

> شکیل الرحمن نے خدا کی سچائیوں سے جس انداز سے ہمیں متعارف کرایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بابا نانک کے فرمان کو غورو فکر کے ساتھ پڑھا اور جو نتیجہ اخذ کیا اسے قاری کے حوالے کر دیا۔انہوں نے گورو نانک جی کے فرمان کی کنہہ حقیقت سے جس انداز سے متعارف کرایا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان سے بھی واقفیت تھی۔

''جپ جی صاحب''میں بابا گرو نانک کے لفظوں کے آہنگ سے مختلف قسم کی کلیاں چٹکتی محسوس ہوتی ہیں اور مختلف قسم کے رنگوں کے پھول کھلے ملتے ہیں۔'' (ایضاً،ص 8)

ظاہر ہے کہ جپ جی صاحب میں بابا گورو نانک کے الفاظ ان کے تخیلات اور تفکرات کا ایسا اظہار ہیں کہ جس کے اسرار تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں البتہ اس طلسمی کیفیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے چنانچہ شکیل الرحمٰن کا جپ جی صاحب کے متعلق یہ کہنا ہے:

''اس کے لفظوں پر گرو نانک کی شخصیت کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور ان کے آہنگ کی کیفیت وہی ہے جو ندی کی لہروں کی ہوتی ہے، احساسات مل رہے ہیں جو بہت قیمتی ہیں، یہ بتانا کب ممکن ہے کہ ان احساسات کی حد کہاں تک ہے۔'' (ایضاً)

جپ جی صاحب سے متعلق ان کی ہر سطر حسن بیان کے اعتبار سے اس قدر پختہ ہے جس سے ان کے حسن تحریر کا ہر انسان قائل ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

شکیل الرحمٰن نے جپ جی صاحب کے خصائص پر روشنی ڈالتے ہوئے بابا گورو نانک کی شخصیت اور ان کے الفاظ کی طلسمی کیفیات پر جس خوبی سے اظہار خیال کیا ہے وہ گورو نانک شناسی کی نئی راہیں وا کرتا ہے۔ان کی نظر میں بابا گورو نانک جی اور ان کا حمد یہ کلام جپ جی صاحب دلکشی و زیبائش کا ایسا مجموعہ ہے کہ جس کی شعاعوں سے ہر شخص کو کسب فیض کرنا چاہیے کیونکہ جپ جی صاحب میں بابا گورو نانک جی نے:

''آسان، سیدھے، سادے صاف اور واضح اسلوب میں زندگی، کائنات، خالق اور مخلوق کے مفہوم کی، گہرائی کو حد درجہ محسوس بنا دیا ہے۔'' (ایضاً)

ظاہر ہے کہ گوتم بدھ ہوں یا بلھے شاہ ہوں یا کوئی صوفی سبھی نے اپنی زندگی کو لوگوں کے سامنے ایسے پیش کیا کہ جس سے لوگوں کو رہنمائی و رہبری حاصل ہو چنانچہ شکیل الرحمٰن کا یہ کہنا ہے کہ:

''گوتم، نانک بلھے شاہ اور صوفی بزرگ خود منطق ہیں۔اگر چہ وہ منطق لے کر نہیں آتے تو اپنے وجدانی رقص کا آہنگ لے کر آتے ہیں، وہ خود مغنی بھی ہیں اور نغمہ بھی۔سب ایک ہی بنیادی سچائی اور اس کی پرنور جہتوں کی باتیں کرتے ہیں لیکن یکسانیت کے باوجود ہر صاحب نظر کے یہاں بار بار نئی تازگی کا احساس ملتا ہے۔'' (ایضاً،ص 10-9)

بلا شبہ خدا کے برگزیدہ بندوں کے فرامین اور کردار کی خوبی ہی یہ ہے کہ انسان کی رہنمائی و رہبری ہوتا کہ وہ سچائی کے راستے پر چل کر کامیاب و کامران ہو سکے۔بابا گورو نانک جی کا بھی یہی ہدف تھا کہ انسان صداقت کے راستے پر چل کر نیکیوں کا مجموعہ بن جائے۔انھوں نے انسان کو ذات پروردگار سے متعارف کرانے کی سعی کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہم خدا کو کما حقہ نہیں جان سکتے بقول شکیل الرحمٰن بابا نانک نے:

''ست نام کا نغمہ خلق کیا عمر بھر اسے گایا حمد لکھی ڈوب ڈوب گیا، اس سچائی میں رقص کرتا رہا دیوانہ وار جھومتا رہا۔عجیب مستی چھائی رہی اس پر بھی وہ جانتا ہے کہ 'ست نام' اپنے تمام جلوؤں کے ساتھ اس کے سامنے نہیں ہے، جلوے اس مقام سے اور بھی آگے بہت جانے کہاں تک پھیل گئے ہیں کہ جس مقام پر وہ کھڑا ہے۔'' (ایضاً،ص 14)

ظاہر ہے کہ ذات پروردگار لامحدود ہے نہ اس کی حدوں کو بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی حمد مکمل طور پر کی جا سکتی ہے۔اس کی قدرت وعظمت اور اس کی حکمت کو بیان کرنا کسی کے قبضۂ قدرت میں نہیں اسی لیے گورو نانک جی بھی پوری حیات خدا کا نغمہ جھوم جھوم کر گاتے رہے اور ذات پروردگار کی قدرت وعظمت سے لوگوں کو متعارف کراتے رہے۔شکیل الرحمٰن کا یہ بھی کہنا ہے کہ بابا گورو نانک نے ست نام کا نغمہ خلق کر کے انسانوں کو خدا سے جس انداز سے متعارف کرایا ہے اگر انسان غور کرے تو اس میں ایسا کیف محسوس کرے گا کہ اس کی خماری تا حیات ختم نہ ہوگی۔

شکیل الرحمٰن نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے جپ جی صاحب کا ترجمہ نہیں کیا کیونکہ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہر پوڑی کے مفاہیم کو اس طرح لکھ سکیں جیسا انھوں نے محسوس کیا تھا پھر بھی شکیل الرحمٰن نے جپ جی صاحب کے مفاہیم کو جس خوبی سے بیان کیا ہے اس سے گورو نانک جی کی عظمت سے واقفیت کے ساتھ ساتھ بابا نانک کے پیغام کی کنہہ حقیقت تک رسائی آسانی سے ہوتی ہے۔انھوں نے جپ جی صاحب کی پانچویں پوڑی کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا:

''اللہ سب وصفوں کا گنجینہ ہے، اس کی عبادت اس سے قربت ہے، وہ تو اس دنیا سے بالاتر ہے وہ خود پیدا ہوا کسی نے اسے جنم نہیں دیا، آپ ہی نرنجن ہے، اس کی تعریف کرو اور اس کی تعریف سنو اس طرح دل میں محبت کی خوشبو پھیل جائے گی، اس کی حمد سے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔'' (ایضاً،ص 15)

دراصل اس پوڑی کے مفاہیم کو بیان کر کے انھوں نے خدا تک پہونچنے کے راستے کی نشاندہی کی ہے اور اس کی حمد کے کیف کا احساس بھی دلایا ہے۔چونکہ ان کی نظر میں قرآن کریم کی آیات بھی تھیں (جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے 'الحمد للہ رب العالمین' تمام تعریفیں اس خدا کے لیے کہ جو عالمین کا پروردگار ہے دوسری جگہ ارشاد خالق کائنات ہے 'لم یلد و لم یولد ولم یکن لہ کفوا احد' نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ ہی اسے کسی نے پیدا کیا ہے اور اس کا کوئی کفو نہیں ہے۔) جس کا فائدہ یہ ہوا کہ پوڑیوں کے مفاہیم کی روح تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی اور انھوں نے آسان زبان میں جپ جی صاحب کی پوڑیوں کے مفہوم کو منتقل کر کے جپ جی صاحب کے ترجمے کی تاریخ میں ایک مثال قائم کرتے ہوئے حمد خدا کے شوق کو مہمیز کیا اور اس کی محبت کی خوشبو کو محسوس کرایا۔صداقت تو یہ ہے کہ جپ جی صاحب کی پوڑیوں کے مفاہیم کے بیان میں پروفیسر شکیل الرحمٰن نے جس طرح حسن بیان کی جلوہ گری دکھائی ہے وہ قابل غور ہے۔انھوں نے پوڑیوں کے مفاہیم کو صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرتے ہوئے انسان کی زندگی کے اصل ہدف کی نشاندہی جس انداز سے کی ہے وہ ہماری رہبری و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

شکیل الرحمٰن نے خدا کی سچائیوں سے جس انداز سے ہمیں متعارف کرایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بابا نانک کے فرمان کو غور و فکر کے ساتھ پڑھا اور جو نتیجہ اخذ کیا اسے قاری کے حوالے کر دیا۔انھوں نے گورو نانک جی کے فرمان کی کنہہ حقیقت سے جس انداز سے متعارف کرایا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان سے بھی واقفیت تھی۔سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے جپ جی صاحب کی پوڑیوں کے مفاہیم کے بیان میں جس اسلوب کو اختیار کیا وہ بہت ہی سادہ و سلیس ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ قاری کو بابا نانک کے فرمان کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی ثبوت

کے طور پر جپ جی صاحب کی پہلی پوڑی کا مفہوم وترجمہ شکیل الرحمٰن کی زبان میں ملاحظہ ہو

وہ سچ ہے اونکار ہے
بسیط ہے حد درجہ پھیلا ہوا، جانے کہاں تک
جانے کہاں تک!
انسانی فکر اس کی وسعتوں تک نہیں جاسکتی
سوچ کی گرفت میں بھلا یہ وسعت کس طرح سماسکتی ہے؟
اسے پانے کے لیے
من بے چین رہتا ہے
لیکن من ڈوب کر مسلسل سوچتے رہنے سے بھی وہ سوچ میں سمانہیں سکتا!
گم سم رہنے چپ رہنے، من میں ڈوب جانے، خاموشی میں دھیان لگائے رہنے سے بھی وہ سوچ اور دھیان میں نہیں آتا
دنیا کو باندھ لائیں پھر بھی
بھوکے پیاسے رہیں پھر بھی
ہوشیاری اور چالاکی دکھائیں پھر بھی
اس کی ایک کرن بھی گرفت میں نہیں آتی!
لہٰذا حکم رضا (حکم رجائی) پر چلنا اور اس سے لذت اور آسودگی پانا
بس یہی زندگی کا تقاضہ ہے!!

(شکیل الرحمٰن، جپ جی صاحب، اصل مع مقدمہ ومفاہیم، طبع اول عرفی پبلی کیشنز 25 نومبر 1996، ص 33)

اردو زبان میں جپ جی صاحب کا نثر میں ترجمہ ہونے کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی ترجمہ ہوا ہے جس میں ایک اہم نام خاں بہادر خواجہ دل محمد کا بھی ہے کہ جنھوں نے جپ جی صاحب کا ترجمہ آسان زبان اور مترنم بحر میں کیا ہے ان کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے جپ جی صاحب کی ہر پوڑی کی اصل کے سامنے ترجمہ درج کیا ہے جس سے فائدہ یہ ہوا کہ جپ جی صاحب پڑھتے وقت قاری کو سہولت ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ معانی ومطالب سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ خواجہ دل محمد پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کی زبان میں جپ جی صاحب کی دوسری پوڑی کا ترجمہ ملاحظہ ہو

حکم سے بن بن جائیں شکلیں — حکم کے بھید نہ کھولے جائیں
حکم سے تن میں روحیں آئیں — حکم سے شان بڑائی پائیں
حکم سے عزت حکم سے ذلت — حکم کا لکھا سکھ دکھ پائیں
حکم سے اک پر بخشش ہو اک — حکم سے چکر کھاتے جائیں
حکم خدا میں دنیا ساری — حکم سے باہر کوئی نہ جائے
حکم خدا جو سمجھے نانک — اپنی 'ہوں میں' آپ مٹائے

(خواجہ دل محمد، جپ جی اور سکھ منی صاحب اصل مع ترجمہ آسان اردو نظم میں، طبع خواجہ بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور، ص 13)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس عہد میں خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ منصۂ شہود پر آیا اس وقت عام لوگوں میں گرمکھی کا چلن نہیں تھا بلکہ اس عہد میں تعلیمی زبان فارسی اور اردو تھی لہذا اس عہد کے تعلیم یافتہ افراد خواجہ دل محمد جان کے اصل ترجمے سے ہی جپ جی صاحب کی روحانی برکت حاصل کرتے تھے اور ایسا اس لیے بھی تھا کہ جپ جی صاحب کو نظم کرنے میں انھوں نے حسن بیان کی خوب جلوہ گری کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حسن بیان نثر میں ممکن نہیں پھر بھی شکیل الرحمٰن نے اپنے اسلوب نثر کا لوہا منوالیا ہے جس کے ثبوت میں جپ جی صاحب کی دوسری پوڑی کا مفہوم حاضر خدمت ہے۔

ہر صورت کا خالق
وہ حاکم ہے!
جو صورتیں وجود میں آئیں ہیں وہ تمام اسی کی خلق کی ہوئی ہیں
اور جتنی صورتیں وجود میں آئیں گی
اسی کی خلق کی ہوئی ہوں گی
اس کے حکم کے رموز کون جانے
کوئی اسرار تک پہنچ نہ سکا!
کائنات کے تمام عناصر واشیاء، کائنات کی تمام صورتیں راز ہیں
ان کی تخلیق کے حسن اور ان کی تخلیق کے اسباب کا بھید کسی کو معلوم نہیں
اسی کا حکم ہے کہ جس سے جسم میں روحیں پر اسرار انداز سے سرایت کر جاتی ہیں
اسی کا حکم ہے کہ جس سے وجود کی عظمت قائم رہتی ہے اور اعلی ترین جمال کا معیار قائم ہوتا ہے
اسی کے حکم سے انسان کو عزت اور ذلت دکھ سکھ سب حاصل ہوتا ہے
روحوں یا آتماؤں کا پر اسرار سفر اسی کے حکم سے ہوتا ہے
خدا کے حکم کے اندر ہی کائنات کی گردش قائم ہے
بھلا کوئی ستارہ، کوئی سیارہ، کوئی بھی عنصر اس کے حکم سے باہر رقص کر سکتا ہے؟
یہ حکم خدا ہی ہے کہ انانیت سے بہت دور
نانک خود اپنی ہستی میں گم ہوتا جا رہا ہے!!

(شکیل الرحمٰن، جپ جی صاحب، اصل مع مقدمہ ومفاہیم، طبع اول عرفی پبلی کیشنز 25 نومبر 1996، ص 35)

شکیل الرحمٰن نے گورو جی کی پوڑی کے مفاہیم کو جس خوبی سے بیان کیا ہے اس سے عبد ومعبود کے رشتے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ انھوں نے آسان زبان میں جپ جی صاحب کے مفاہیم کو بیان کر کے ترجمہ نگاروں کی رہنمائی جس انداز سے کی ہے وہ قابل استحسان ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ترجمے کو پڑھ کر خدا سے محبت کا جذبہ ابھرتا ہے اور جب انسان کو خدا سے سچی محبت ہوگی تو سرور کی ایسی ہی کیفیت پیدا ہوگی کہ پروردگار کی خود ہی حمد پڑھو اور خود ہی سنو کیونکہ تعریف کرنے والا بھی وہی ہے اور سننے والا بھی وہی ہے چنانچہ جپ جی صاحب کے متعلق ان کا یہ اعتراف ہے:

''بابا نانک کے بیان میں ایک عجیب سرمستی ہے، یہاں شاعر دانشور ہے اور نہ دانشور شاعر، محبت میں ڈوبا ہوا دل ہے، الفاظ زبان سے بے اختیار نکلتے جا رہے ہیں، باتوں کی تکرار بھی ہو رہی ہے، گم صم وجود ہو تو یہی کیفیت ہوتی ہے۔ نشے کی کیفیت، بابا نانک نے ہر لمحہ آزادی کا احساس دیا ہے۔ جپ جی صاحب میں آزادی کے سچے احساس، مایا کے دلفریب اور پیارے تصور اور آنند حاصل کرتے رہنے کے مسلسل روحانی عمل کی وجہ سے بڑی کشش پیدا ہوگئی ہے۔ بابا نانک نے شاعری نہیں کی عام لفظوں میں احساسات پیش کر دیے ہیں۔''

(شکیل الرحمٰن، جپ جی صاحب، اصل مع مقدمہ ومفاہیم، طبع اوّل عرفی پبلی کیشنز، 25 نومبر 1996، ص 20)

بابا نانک کے متعلق ان کے یہ افکار وتخیلات اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ گورو نانک جی سے متاثر بھی ہیں اور ان کے عقیدت مند بھی، بابا نانک کے متعلق مذکورہ بالا خیالات سے واضح ہے کہ انسان ان احساسات کو مختلف صورتوں میں محسوس کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ ان شکلوں کو گورو نانک جی نے لکھا نہیں بلکہ زبان مبارک سے اس طرح ادا کیا ہے کہ انسان خدا کا عرفان حاصل کر سکے بقول شکیل الرحمٰن بابا نانک نے انسان کی ایغو یعنی کہ میں سب کچھ ہوں کوئی کچھ بھی نہیں کو:

''اس طرح خاموشی سے شکست کر کے سرمابنادیا کہ 'جپ جی صاحب' میں اسے کہیں محسوس ہی نہیں کرتے۔اسی طرح خوف کے جذبے کوختم کردیا،فرد اور خالق کائنات کے رشتے میں صرف محبت ہی کا درس ہے یہی وجہ ہے کہ خاموشی کی ایک دلکش آواز سنائی دیتی رہتی ہے اور خاموشی کی دلکش اور دلفریب آواز ہی میں ''جپ جی صاحب'' کے الفاظ ابھرتے رہتے ہیں۔'' (ایضاً ص 21)

یقیناً خدا اپنے بندے سے جس طرح محبت کرتا ہے اس کی مثال نہیں لائی جاسکتی شکیل الرحمٰن کی نظر میں:

''بابا گورونانک معلم نہیں ہیں،کوئی درس نہیں دے رہے ہیں، نصیحتیں نہیں کر رہے ہیں وہ تو صفات الٰہی کے بیان میں خود بے بس اور بے کس نظر آرہے ہیں وہ مالک کی تمام صفات کو بیان ہی نہیں کرسکتے۔'' (ایضاً)

یہ صداقت ہے کہ پروردگار کی صفات کا شمار ناممکن ہے اس کی بے پایاں رحمتوں میں جو گہرائی وگیرائی ہے اس تک پہنچنا کسی کے بس میں نہیں پروفیسر شکیل الرحمٰن کے نزدیک:

''جپ جی صاحب میں 'مایا' کا ایک انتہائی پیارا تصور ملتا ہے۔'مایا' فریب یا التباس نہیں ہے،یہ تمثیل الٰہی ہے۔'' (ایضاً)

بابا نانک کی وجدانی بصیرت کی ایک بہت بڑی تخلیق ہے ,باطنی تجربوں کے ارتعاشات غیر معمولی مسحور کن صباحت لیے ہوئے ہیں,انتہائی خوبصورت جو حیرت انگیز بصیرت کی دین ہے, 'جپ جی صاحب' کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسے لگا کہ خدا ہے اس لیے جہنم نہیں ہے ,خدا ہے اس لیے ہر مقام پر بہشت ہے ,ہر شے ہر عنصر بہشتی ہے.خدا ہے اس لیے یہ زندگی اتنی خوبصورت اور دلفریب ہے ,حسن کے اعلی ترین معیار کو لیے ایک تمثیل پیش ہوئی ہے ,یہ تمثیل نغمہ و نور کی ہے ,تلاش و جستجو اور تحرک کی ہے.اپنی توانائی یا انرجی کے سر چشمے تک پہونچنے کی آرزو ہے .

خدا نے دنیا میں جتنی چیزیں بھی خلق کی ہیں ان میں اس قدر جذب وکشش اورخوبصورتی ہے کہ جس سے لطف اندوز ہونے سے اشتیاق میں کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے اس کے مظاہر اور جلووں سے گریزاں نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس کے جلووں کو اس حسن کے درمیان رہ کر ہی پہچانا جاسکتا ہے زندگی کے جمال سے دور رہ کر انسان معبود کے حسن کو محسوس نہیں کرسکتا چنانچہ شکیل الرحمٰن کا یہ کہنا ہے کہ پروردگار بابا نانک کی نظر میں:

''وہ ہے اور وہی رہے گا،وہی ایک سچائی ہے،وہ 'ست نام' ہے اسی نے مایا کو خلق کیا ہے،مختلف قسم کے جذبے عطا کیے ہیں اور ہر جذبے کو ایک الگ رنگ بخشا ہے 'ست نام' مایا خلق کر کے اپنی خلق شدہ تمثیل کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔اس میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے،اس کے حسن میں اضافہ کر کے زیادہ وقار اور عظمت بخشتا ہے'' (ایضاً ص 22)

دراصل پروردگار نے رنگا رنگ محفل سجائی ہے کہ جس کا کما حقہ عرفان کسی انسان سے ممکن نہیں البتہ انسان اس کے ہر نغمے میں شامل ہو کر فلاح و بہبودی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے کیونکہ اس کے تخلیق کردہ ہر نغمے میں وہ جذب وکشش ہے کہ جس کی طرف اگر متوجہ انسان ہوجائے تو دنیا کی ہر قید وبند سے اسے نجات حاصل ہوجائے کیونکہ:

''مایا،جو مالک کی سب سے خوبصورت تخلیق ہے جمال و جلال کا معیار ہے۔نرنکار نے مذہب دھرم کے اصولوں کو شعور بخشا ہے،اسی مایا میں گیان کی منزل ہے،رحمتوں کے سائے ہیں،مایا کے حسن سے لطف وانبساط حاصل کرتا ہوا،رقص کرتا ہوا انسان خالق کے دروازے تک پہونچ جاتا ہے۔'' (ایضاً ص 25)

درحقیقت مایا کے جلووں پر اگر غور وفکر کیا جائے تو خالق کے بکھرے ہوئے رنگ اور لعل وجواہر کو انسان شمار نہیں کرسکتا۔پروفیسر شکیل الرحمٰن نے گورونانک جی کے فرمان کے پیش نظر مایا جال کی تشریح وتوضیح جس انداز سے کی ہے اس سے بابا نانک کے نغمے کے حسن کی دلکشی کا علم ہوتا ہے شکیل الرحمٰن کے نزدیک جپ جی صاحب:

بابا نانک کی وجدانی بصیرت کی ایک بہت بڑی تخلیق ہے،باطنی تجربوں کے ارتعاشات غیر معمولی مسحور کن صباحت لیے ہوئے ہیں،انتہائی خوبصورت جو حیرت انگیز بصیرت کی دین ہے،'جپ جی صاحب' کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسے لگا کہ خدا ہے اس لیے جہنم نہیں ہے،خدا ہے اس لیے ہر مقام پر بہشت ہے،ہر شے ہر عنصر بہشتی ہے۔خدا ہے اس لیے یہ زندگی اتنی خوبصورت اور دلفریب ہے،حسن کے اعلیٰ ترین معیار کو لیے ایک تمثیل پیش ہوئی ہے،یہ تمثیل نغمہ ونور کی ہے،تلاش وجستجو اور تحرک کی ہے۔اپنی توانائی یا انرجی کے سرچشمے تک پہونچنے کی آرزو ہے۔'' (ایضاً ص 28-27)

بلاشبہ پروردگار عالم ہر شے پر قادر اور ہر جگہ موجود ہے کائنات کے ذرہ ذرہ میں اسی کا پرتو اور ہر قطرے میں اسی کی حکمت پوشیدہ ہے جس کا ادراک کرنے سے عقل انسانی عاجز ہے۔صداقت یہ ہے کہ اس کے حسن اور نور تک رسائی انسان کے اختیار سے بالاتر ہے اگر اس کے حسن اور کرشمات کا ادنی سا بھی عرفان حاصل ہوجائے تو کامیابی و کامرانی انسان کے قدم چومے گی اور شکیل الرحمٰن نے جپ جی صاحب کے اس ترجمے کے ذریعے خدا کی انھیں بے پایاں حکمتوں کی طرف ملتفت کرتے ہوئے اس سے کسب فیض کرنے کے لیے ہمیں آمادہ کیا ہے۔

جپ جی صاحب کے مذکورہ تراجم پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ترجمہ نگاروں میں سے کسی نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا تو کسی نے ترجمے میں روحانیت کا خصوصی خیال رکھا اور کسی نے معاشرتی اصلاح کے نقطۂ نظر پر توجہ دی بعض ترجمہ نگاروں نے اخلاقیات پر بھی زور دیا لیکن شکیل الرحمٰن نے صوفیانہ (Mystical) طرز اور تخلیقیت (Creative) کو ملا کر جپ جی صاحب کے ترجمہ ومفاہیم کو پیش کرنے کی سعی کی جس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی تشریح میں صوفیانہ اور تخلیقی خوبیاں بھرپور انداز میں مجتمع ہو گئیں جن سے مفاہیم میں وسعت اور لطف زبان میں بھی بیش بہا اضافہ ہوا۔جپ جی صاحب کے اس ترجمے سے یہ واضح ہے کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن کی نظر میں بابا گورونانک جی عرفان خدا کے لیے ایسا سرچشمہ تھے کہ جنھوں نے خدا کی ہر تخلیق کی رنگا رنگ تصویر اس انداز سے مخلوق خدا کے سامنے پیش کی کہ جس میں انسانوں کے لیے خیر ہی خیر ہو جنھیں ہر انسان محسوس تو کرتا ہے لیکن اس کے اقوال وافعال سے اظہار نہیں ہوتا لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان خدا کی اس بیش بہا دولت کا اعتراف اپنے ہر عمل سے کرے اور جس طرح ذات پروردگار نے اپنی بے شمار نعمتوں کے ذریعے انسانوں پر رحم وکرم فرمایا ہے وہ بھی مخلوق خدا کے ساتھ رحم وکرم کے ساتھ پیش آئے جبھی بابا نانک کے جپ جی صاحب کے فرامین پر عمل کرنے کی عملی تصویر دنیا کے سامنے آسکے گی اور گورونانک شناسی کا ثبوت فراہم ہوسکے گا۔

■

Dr. Raihan Hasan
Dept of Urdu wa Farsi
Guru Nanak Dev University
Grand Trunk Road, Off, NH 1,
Amritsar143005 (Punjab)
Mob:8559020015
Email :drraihanhasan@gmail.com

محمد جہانگیر وارثی

اردو لسانیات کے حوالے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمات

تمہید:

سرسید کی تعلیمی تحریک انیسویں صدی کی مختلف تحریکوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستان میں عوامی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جس پر سرسید کی تحریک کا اثر نہ ہو۔ تعلیم، ادب، مذہب، فلسفہ، سیاسیات، عمرانیات، سماجیات اور صحافت غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے میں اس تحریک نے اپنے گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔ دراصل سر سید احمد خاں نے اس تحریک کی بنیاد مدرسۃ العلوم کے طور پر 1875 میں رکھی جو بہت ہی کم عرصے میں ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا 1877 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بنا اور پھر 1920 میں جدید ہندوستان کی تعلیمی، ثقافتی اور سماجی تاریخ کا سنہرا باب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں منظر عام پر آیا۔ روز اول سے ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی نظم وضبط کا ایک متنوع سلسلہ جاری وساری ہے۔

شعبہ لسانیات کی سنگ بنیاد 1968 میں رکھی گئی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کو شعبہ لسانیات کے پہلے صدر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ روز اول سے ہی یہ شعبہ لسانیاتی تحقیقات بالخصوص اردو لسانیاتی تحقیقات میں پیش پیش رہا ہے۔ جیسے جیسے اردو زبان نے زندگی کے مختلف گوشوں میں خود کو متعارف کرایا۔ شعبہ لسانیات نے اپنی ذمے داری سنبھالتے ہوئے اس کا سائنسی وتوضیحی نقطہ نظر پیش کیا نیز تعلیم اور تحقیقات کے ضمن میں ہمیشہ قابل اعتماد مواد پیش کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے عالمی شہرت یافتہ تعلیمی ادارے میں لسانیات کی تعلیم کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایک طرف جہاں اس شعبے کے طلبہ فعال اور متحرک رہے ہیں وہیں دوسری جانب اس شعبے کے اساتذۂ کرام قومی اور بین الاقوامی سطح پر انتہائی معزز اور معتبر ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

شعبۂ لسانیات ہر سال اردو کے مختلف لسانیاتی موضوعات پر کانفرنسز اور سمینار کا انعقاد کرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے زمانے کی ضروریات سے ہم آہنگ رہنے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے تعلیمی نصابات کا اعادہ بھی کرتا رہا ہے۔ اہم موضوعات پر وقتاً فوقتاً شعبہ لسانیات مختلف ورکشاپ کا بھی اہتمام کرتا رہا ہے۔ جس میں طلبہ کی کثیر تعداد شامل ہوتی ہے جس سے ان کی تعلیمی نشوونما میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس شعبے کے اساتذۂ کرام کی انتھک محنت اور جانفشانی کا نتیجہ ہے جو ہر سال طلبہ کی ایک بڑی تعداد یو۔ جی۔ سی نیٹ اور جے۔ آر۔ ایف جیسے امتحانات میں کامیابی حاصل کر رہی ہے۔ بدلتے زمانے کے ساتھ اس شعبے نے خود کو ہم آہنگ کیا ہے۔

شعبہ لسانیات نے اپنے بانی پروفیسر مسعود حسین خاں کی یاد میں ایک سوسائٹی قائم کی ہے جس کا نام "مسعود حسین خاں لنگوسٹک سوسائٹی" ہے۔ یہ سوسائٹی دراصل تحقیق کا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں ہر سال لیکچرس کے لیے دنیا کے تمام گوشے سے اسکالرس مدعو کیے جاتے ہیں۔ جن کے مختلف الانواع موضوعات سے طلبہ اور اساتذہ دونوں مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں 22/ اکتوبر 2020 کو پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے مسعود حسین خاں کی اردو لسانی خدمات پر نہایت معلوماتی لیکچر پیش کیا تھا۔

اردو لسانیات کی اہمیت:

لسانیات اگرچہ اردو میں ابھی کم سن علمی شعبہ ہے لیکن اس کے ظہور نے مختصر وقت میں اردو زبان کے حق میں وہ کر دکھایا جو روایتی علم زبان سالہا سال نہ کر سکا۔ اردو کی بنیاد، اس کی اصل، اس کی جائے وقوع، ہم سایہ زبانوں کے ساتھ اس کا رشتہ بالخصوص ہندی کے ساتھ اس کا رشتہ (بہناپا) وغیرہ۔ مرزا خلیل احمد بیگ اپنی مشہور تصنیف ''اردو کی لسانی تشکیل'' میں رقمطراز ہیں:

''اردو کے لسانی مسائل پر اظہار خیال کا سہرا یوں تو انشاء اللہ خاں انشاء اور ان کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کے سر ہے۔ لیکن اس موضوع پر جدید تحقیقی نقطہ نظر سے 1930 میں سب سے پہلے ڈاکٹر محی الدین زور نے قلم اٹھایا۔ اس سے دو سال قبل یعنی 1928 میں حافظ محمود خان شیرانی 'پنجاب میں اردو' تصنیف کر چکے تھے اور یہ ثابت کر چکے تھے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اگرچہ شیرانی کا یہ نظریہ اب باطل قرار دیا جا چکا ہے تاہم انہوں نے تحقیقی مواد اپنی مذکورہ کتاب میں یکجا کر دیا اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ محمود شیرانی اور ڈاکٹر زور کے بعد جن محققین نے اردو کے لسانی موضوعات و مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا ہے ان میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔''

(اردو کی لسانی تشکیل: مرزا خلیل احمد بیگ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2000، ص 9)

اردو لسانیات میں کیے گئے کام:

بانی شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر مسعود حسین اپنے مقالہ بعنوان 'اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر' کی شروعات میں لکھتے ہیں کہ:

''اردو زبان صحیح معنوں میں ایک مخلوط زبان ہے جیسا کہ اس کے تاریخی نام ریختہ سے بھی ظاہر ہے۔ یوں تو دنیا کی اکثر زبانیں دخیل الفاظ کی موجودگی کی وجہ سے مخلوط کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن جب کسی لسانی بنیاد پر غیر زبانوں کے اثرات اس درجہ نفوذ کر جاتے ہیں کہ اس کی ہیئت کذائی ہی بدل جائے تو وہ لسانیاتی اصطلاح میں ایک مخلوط یا ملواں زبان کہلائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اردو کی نظیر کہیں ملتی ہے تو فارسی زبان میں، جس کی ہند ایرانی بنیاد پر سامی النسل عربی کی کشیدہ کاری نے کلاسیکی فارسی کو جنم دیا۔ عربی کے اس عمل کی توسیع جب فارسی کے وسیلے سے تیرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی ایک ہند آریائی بولی، امیر خسرو کی ''زبان دہلی و پیرامنش'' پر ہوتی ہے تو اردو وجود میں آتی ہے۔ اس لسانی عمل کی توسیع کی دیگر مثالیں کشمیری، سندھی اور پنجابی ہیں لیکن زبان دہلی، کی طرح یہ کبھی بھی کل ہند حیثیت اختیار نہ کر سکیں۔''

(اردو زبان: تاریخ تشکیل، تقدیر: مسعود حسین، شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1988، ص 5)

اس کاروان تحقیق کے روح رواں جناب مسعود حسین خان تھے آپ کا شاہکار مقدمہ تاریخ زبان اردو ہے۔ جس میں آپ نے اردو زبان کی تاریخ اور اس کے آغاز و ارتقا پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اردو زبان کے آغاز کے متعدد رجحانات اور اقوال کا انھوں نے موازنہ کیا ہے اور سب پر تنقیدی بحث کی ہے۔ اس ضمن میں ان کی یہ کتاب بہت مستند مانی جاتی ہے اور اکثریت نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی تھیوری کو قبول کیا ہے۔ ان کی دوسری کتاب اردو زبان و ادب ہے جو 1954 میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ کی تصانیف میں اردو زبان کی تاریخ کا خاکہ اور اردو کا المیہ قابل ذکر ہیں۔

مرزا خلیل احمد بیگ اس شعبے کے رکن رکین ہیں 'اردو کی لسانی تشکیل' آپ کی مشہور زمانہ تصنیف ہے۔ اردو لسانیات کے حوالے سے یہ کتاب ایک اہم دستاویز ہے اس کتاب میں اردو کی تشکیل و ارتقا اردو کے آغاز، ارتقاء، اور نواح دہلی کی بولیوں اور ان کے لسانی رشتوں کے حوالے سے مفصل مضامین شامل ہیں۔ اردو کے رسم الخط، ذخیرہ الفاظ، ہند آریائی پس منظر کے حوالے سے عربی اور فارسی کا تاریخی و تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ مصنف کی مشہور تصنیف 'ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی' ہے اس کتاب میں آپ نے ان تمام اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب دیا ہے جو گیان چند جین کی کتاب ایک بھاشا دو لکھاوٹ میں پیش کیے گئے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں تیسرا بڑا نام پروفیسر اقتدار حسین خان کا ہے آپ نے اردو لسانیات کے حوالے سے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ کی کتاب لسانیات کے بنیادی اصول اردو لسانیات میں ایک گراں قدر کارنامہ ہے۔

آپ نے اس کتاب میں لسانیات کی تمام سطحوں (Levels) صوتیات، تجز صوتیات صرف اور نحو تمام کا خوش اسلوبی سے جائزہ لیا ہے۔ آخری ابواب میں آپ نے لسانیات کے جدید ترین نظریے ''تبادلی قواعد'' سے بھی قارئین کو روشناس کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کتاب اردو صرف و نحو بھی اردو لسانیات میں بیش قیمت اضافہ ہے۔

علی رفاد فتیحی کی اردو کے تعلق سے لسانیاتی خدمات ناقابل فراموش ہیں آپ کی مشہور تصنیف 'اردو لسانیات' اس ضمن میں ایک گراں قدر کاوش ہے۔ آپ نے اس کتاب میں اردو لسانیات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ابتدائی ابواب (باب ایک سے سات تک) میں اردو زبان اور اس کے صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی متعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ 8 سے 13 ابواب میں اردو زبان کی تاریخ اور اس کے لسانی رشتے کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ طالب علموں کی خاطر ہر باب کے آخر میں اس کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

راقم الحروف موجودہ صدر شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اردو لسانیات کے بالکل اچھوتے موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ تصنیف زبان و ترسیل (اردو پرنٹ

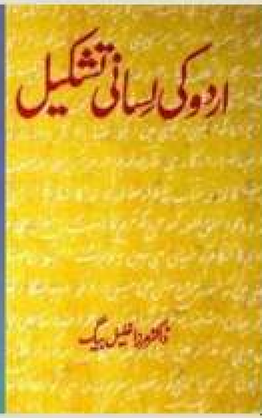

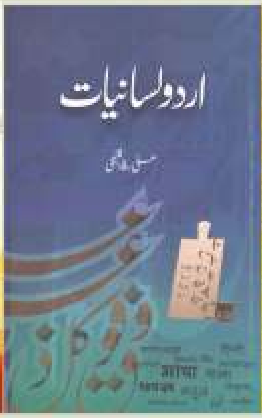

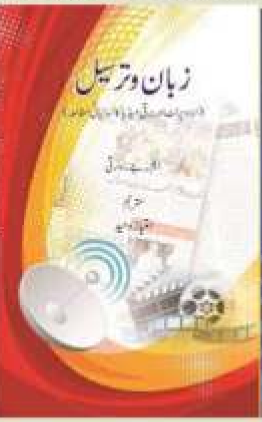

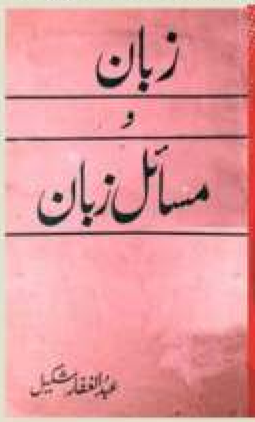

اور برقی میڈیا کا لسانیاتی مطالعہ) مترجم امتیاز وحید، اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔

اس کتاب میں لفظی ہم آہنگی اور صرفی ونحوی قواعد کے لحاظ سے اردو میں رائج الفاظ کا نئے نقطہ نظر سے جو مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

عبدالغفار شکیل نے اردو لسانیات کے تعلق سے 'زبان و مسائل زبان' اور 'لسانی تحقیقی مطالعے' دو کتابوں کو مرتب کیا ہے یہ دونوں دراصل ان کے تحقیقی مضامین اور مقالات کا مجموعہ ہیں۔ زبان و مسائل زبان میں آپ نے بعض ان لسانی حقائق اور مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی طرف کم توجہ دی گئی ہے مثلاً زبان جو روزمرہ زندگی میں ہر وقت اور ہر جگہ دخیل ہے اس کا استعمال تو ہم جانتے ہیں مگر بذات خود زبان کیا ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اور وہ کس طرح زبان کے نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ آپ کی دوسری کتاب 'لسانی تحقیقی مطالعے' میں آپ نے ان گوشوں پر بحث کی ہے جن پر اہل تحقیق نے کم توجہ دی ہے مثلاً سرسید کی اولین اور غیر مطبوعہ تصنیف جو اردو زبان کی قواعد سے متعلق وغیرہ۔

شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سپوت پروفیسر خطیب مصطفیٰ بھی ہیں اردو لسانیات کے تعلق سے آپ کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ آپ کی کتاب A Descriptive Grammar of Dakkni اردو لسانیات میں ایک قابل توجہ کام ہے آپ کا یہ کام آندھرا پردیش کے چتوڑ گڑھ ضلع کی اردو کی ایک قسم (Variety) پر ہے۔ آپ نے توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistic) کے فریم ورک (Framework) میں اس کام کو انجام دیا ہے۔ اور لسانیات کی ہر سطح (level) کا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر صباح الدین احمد کی کتاب 'اردو حرف وصوت' اور 'اردو حرف تہجی: تشکیل ورد تشکیل' بھی اردو لسانیات میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اردو حرف وصوت میں آپ نے مطالعہ زبان کے ان اہم پہلوؤں کی طرف نشان دہی کی ہے جنہیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے مثلاً تاریخی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور عملی پہلو۔ اس طرح آپ نے ''اردو حروف تہجی'' میں اردو حروف تہجی کے تعلق سے سیر حاصل بحث کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دنیا کی کسی زبان کا حروف تہجی مکمل طور پر سائنٹفک نہیں ہوتا۔ ایک صوت = ایک حرف دنیا کے کسی زبان کے حروف تہجی میں نہیں پایا جاتا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز خان کی کتاب Testing Urdu Language: A Linguistics Approach لسانیات میں ایک انوکھی کوشش ہے۔ آپ نے اس کتاب میں اردو زبان کے بعض اہم تدریسی پہلوؤں کی لسانیاتی جانچ کے تعلق سے خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ کتاب کل چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں آپ نے اردو کی چاروں مہارتوں (skills) کی جانچ کی لسانیاتی بنیادیں فراہم کی ہیں اور اخیر میں ایک جامع خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔

شعبۂ لسانیات میں اردو لسانیات کے حوالے سے لکھے گئے تحقیقی مقالوں کی فہرست درج ذیل ہے۔ یہ فہرست ابتداء سے لے کر سنہ 2020 تک محیط ہے۔

	تحقیق کا موضوع	نگراں/معاون نگراں	محقق	سال
1	اردو زبان میں انگریزی کے مستعار الفاظ کا لسانیاتی مطالعہ	پروفیسر عبدالغفار شکیل	طارق حسین	1957
2	معیاری اردو کی صوتی اور صوتیاتی ساخت	سید فراست رضوی	سید فراست رضوی	1966
3	میسور میں بولی جانے والی دکنی اردو کی صوتیات اور ساختیات	پروفیسر عبدالغفار شکیل	پروفیسر عبدالغفار شکیل	1967
4	شمالی ہندوستان میں اردو قواعد کی تاریخ (1600 سے 1800 عیسوی)	مرزا خلیل احمد بیگ	مرزا خلیل اے بیگ	1975
5	ہندی بولنے والوں کے ذریعے اردو کو اختیار کیا جانا	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	ایس جمال محمد	1987
6	چتور ضلع میں بولی جانے والی دکنی اردو کا تفصیلی مطالعہ	ڈاکٹر اقتدار حسین خان	خطیب ایس مصطفیٰ	1985
7	اردو میں فقرے کی تشکیل کا تغیراتی تجزیہ	پروفیسر عبدالغفار شکیل	ایم مشکوراللہ شیروانی	1987
8	بھوپال کی اردو کی صوتیات میں فزیالوجی اور نفسیات کا تعامل	پروفیسر عبدالعظیم	ثمینہ سورتی	1989
9	انگریزی سیکھنے کے دوران اردو ہندی بولنے والے بچوں کے ذریعے کی گئی عمومی غلطیوں کا تجزیہ	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	صباح الدین احمد	1996
10	اردو میں طفل تکلم ابتدائی اسکول کے بچوں کے لسانی فروغ کا سماجی ولسانی مطالعہ	ڈاکٹر سید امتیاز حسنین	فرح بانو	1990
11	جامع مسجد کے اطراف میں بولی جانے والی دہلوی اردو کے یک صوت دکنی الفاظ کی صوتیات: ایک ترسیلی زاویہ نظر	پروفیسر عبدالعظیم	ضیا رؤف	1990
12	اردو بولنے والے طبقے میں عمر اور سماجی ومعاشی درجہ کی رو سے خواتین کی زبان کا سماجی ولسانی تجزیہ: علی گڑھ کے حوالے سے	ڈاکٹر سید امتیاز حسنین	ہما اسلام	1992
13	کامن کور اور اردو اور ہندی صوتیات کی امتیازی خصوصیات	مبین احمد خان	مبین احمد خان	1993
14	جدید معیاری اردو اور برج بھاشا کی تخالفی صوتیات (ایٹہ ضلع میں بولی جانے والی زبان کے حوالے سے)	ڈاکٹر مبین احمد خان	ذاکر حسین	1994
15	تشریحی صوتیات کے اصولوں کی جانچ: لکھنؤ میں بولی جانے والی اردو کے حوالے سے	ڈاکٹر مبین احمد خان	شبانہ حمید	1994
16	معیاری اردو کا تخالفی صرف	پروفیسر اقتدار حسین خان	اعجاز النبی	1995
17	اردو زبان کی صلاحیتوں کی جانچ کا لسانی طریقہ	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	عبدالعزیز خان	1996
18	ترسیلی انتظام کے نفسیاتی و لسانی مطالب: اردو میں زبانی و تحریری ترسیلی نظام کے حوالے سے	ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	محمد جہانگیر وارثی	1997
19	بہار میں رائج اردو کی صوتیات میں لہجے کا دخل (گیا اور اس کے اطراف میں بولی جانے والی اردو کے حوالے سے)	پروفیسر عبدالعظیم	شازی شاہ جبیں	1998
20	اردو نیوز میڈیا میں پیغام رسانی کی اثر پذیری پر لغوی تنوع کے اثرات: ایک نفسیاتی ولسانی جائزہ	ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	اعجاز احمد شیخ	1998

21	بچوں کے لسانی فروغ اور تکلمی خرابی کی نفسیاتی ولسانی جانچ: اردو ہندی بولنے والے بچوں کے حوالے سے	ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	سعدیہ حسنی حسن	2007
22	زبان میں فرق کا سماجی ولسانی مطالعہ: شمالی ہندوستان میں بولی جانے والی اردو کی علاقائی، سماجی اور نسلی شکلوں کا جائزہ	پروفیسر سید امتیاز حسنین	محمد مطیع الرحمان	2008
23	جدید معیاری اردو کا ساختیاتی تجزیہ	مسعود علی بیگ	عطیہ پروین	2008
24	زبان پر تجارتی اثرات اردو لغات کے خصوصی حوالے سے	مسعود علی بیگ	صومانہ فاطمہ	2008
25	جدید اردو شاعری میں لغوی تنوع اور اسلوبیاتی تغیر: ابن انشاء کی شاعری میں ہندوی عناصر کے استعمال کا لسانی مطالعہ	مسعود علی بیگ	ارم صابر	2010
26	علی گڑھ کے اردو میڈیم اسکولوں کے درجہ پنجم سے ہفتم تک کے بچوں کی تحریروں میں املے کی غلطیوں کا لسانی مطالعہ	ڈاکٹر ثمینہ سورتی	پیکر فاطمہ	2011
27	علی گڑھ میں درجہ پنجم کے اردو بولنے والے بچوں کی بنیادی اردو لفظیات کا لسانی مطالعہ	ڈاکٹر ثمینہ سورتی	تبسم خان	2012
28	ہندوستان کے شہری خطوں میں ہندی اردو کے تعلق سے رویے میں تبدیلی	پروفیسر علی رفاد فتیحی	رشدی ادریس خان	2012
29	اردو اور انگریزی زبان میں تھیٹا تھیوری کے اطلاق کا تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر ثمینہ سورتی پروفیسر انجنی کمار سنہا	شمیم فاطمہ	2012
30	مرادآباد میں استعمال ہونے والی تکنیکی اصطلاحات کا سماجی وتاریخی مطالعہ	ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	محمد شارق	2012
31	اردو میں الفاظ کی تشکیل: تخلیقیت کا لسانی مطالعہ	ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	محسن خان	2013
32	اردو اور پنجابی کے صوفیانہ ادب میں علامات کے اختلاط اور طرز نگارش کی روداد	ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	رابعہ ناصر	2013
33	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اردو بولنے والے طلبا کی انگریزی کی غلطیوں کا لسانی تجزیہ	ڈاکٹر شبانہ حمید	فخر ثمرین	2014
34	حبیب تنویر کے ڈرامہ 'آگرہ بازار' میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے حوالے سے تھیٹر مرکوز الفاظ کی اختراع کی ہیئت اور مواد	ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	محمد اسرار انصاری	2016
35	بانگ درا میں اقبال کی چندہ نظموں کا حقیقت پسندانہ مطالعہ	مسعود علی بیگ	شائلہ عثمانی	2017
36	اردو میں عربی عناصر کے معنیاتی تغیر کا مطالعہ	مسعود علی بیگ	فرحین انوار	2017
37	اردو میں حالات کی تفویض/ سپردگی	ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی	نعمان طاہر	2019
38	ترجمہ کے اسالیب: قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا کا اسلوبیاتی جائزہ	ڈاکٹر عبدالعزیز خان	اویبہ زیدی	2019
39	تشریحی صوتیات کے اصولوں کی جانچ کا خلاصہ: بریلی اور اس کے اطراف میں بولی جانے والی اردو کے حوالے سے	پروفیسر شبانہ حمید	مہوش محسن	2020
40	بلند شہر میں بولی جانے والی اردو کا تفصیلی مطالعہ	ڈاکٹر سعدیہ حسن	برہان عباسی	2020
41	نیوز ٹاک: اردو ہندی نیوز میڈیا کی زبان کا جائزہ	ڈاکٹر سعدیہ حسن ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	دانش رحیم	2020
42	شیشے کے کارخانوں میں استعمال ہونے والے اردو الفاظ کے تعلق سے تفہیم میں لفظ کا اطلاق: ایک معنیاتی تطابق ماڈل	ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	حرا ارشاد	2020
43	اردو میں انگریزی کے مستعار الفاظ کا سماجی تفصیلی مطالعہ: مابعد آزادی عہد کے خصوصی حوالے سے	مسعود علی بیگ	الیاس خان	2020
44	اردو بیانیے پر عربی کے اثرات: خطیبانہ وسائل اور ان کے مصادر اردو شاعری کے حوالے سے	مسعود علی بیگ	زبیر احمد	2020
45	اردو میں مستعار الفاظ کا مطالعہ: عمدگی کے نظریے کی رو سے	پروفیسر شبانہ حمید	مریم عثمانی	رجسٹرڈ پی ایچ ڈی
46	رامپور میں بولی جانے والی اردو کی مختلف اقسام کا سماجی ولسانیاتی مطالعہ	پروفیسر شبانہ حمید	نازش ملک	2020
47	ابتدائی لغوی فروغ: اردو بولنے والے ابتدائی اسکول کے بچوں کی الفاظ کا اکتساب: ایک نفسیاتی و لسانیاتی جائزہ	ڈاکٹر سعدیہ حسن	شاہین پروین	رجسٹرڈ پی ایچ ڈی
48	نیوز میڈیا میں اردو الفاظ کی صرفی اور لغوی انحرافات کا مطالعہ	مسٹر مسعود علی بیگ	الماس نظامی	2020

حوالہ جات

1 مقدمہ تاریخ زبان اردو: مسعود حسین خان، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، بارہویں اشاعت: 1999
2 اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر: مسعود حسین خان، شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1988
3 اردو کی لسانی تشکیل: مرزا خلیل احمد بیگ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2000
4 زبان وترسیل (اردو پرنٹ اور برقی میڈیا کا لسانیاتی مطالعہ) ایم۔ جے۔ وارثی، مترجم: امتیاز وحید، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2015
5 تحقیقی ولسانی مطالعے: عبدالغفار شکیل، سلسلہ مطبوعات شعبۂ لسانیات، علی گڑھ، ایڈیشن اول، 1975
6 اردو حرف وصوت: صباح الدین احمد، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 1995

■

Prof. M J Warsi
Chairman, Department of Linguistics
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:9068771999
Email.: warsimj@gmail.com

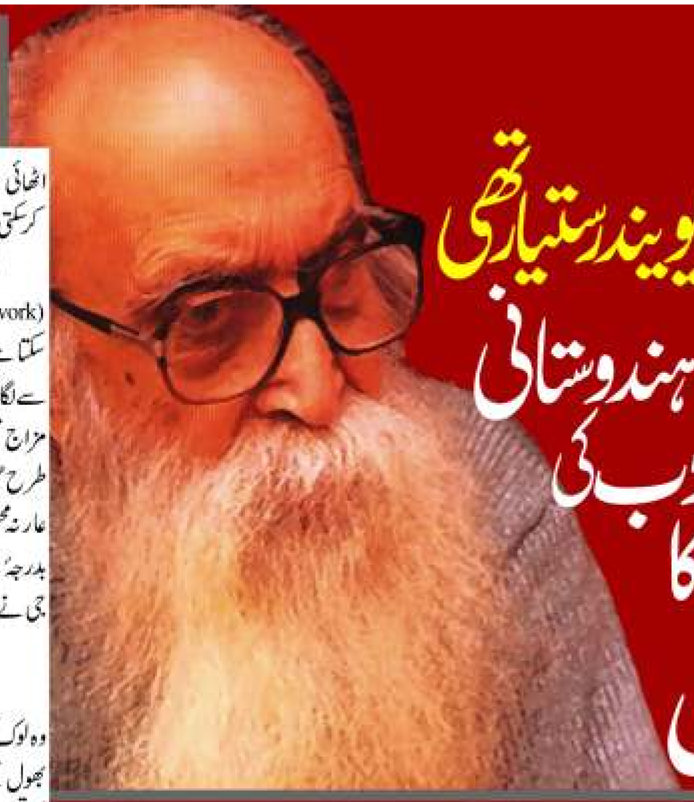

دیویندر ستیارتھی
ہندوستانی لوک ادب کی دنیا کا کولمبس

حیات افتخار

دیویندر ستیارتھی اردو ادب کی تاریخ کا ایک ایسا نام ہے جس کی شہرت کے ڈنکے برصغیر (ہند و پاک) میں آزادی سے قبل اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک بجتے رہے۔ لوک ادب پر ان کے مضامین اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں شائع ہو کر جہاں ایک طرف ان کی شہرت میں چار چاند لگا رہے تھے وہیں دوسری طرف اپنے انوکھے مشاہدات اور تجربات پر مبنی کہانیوں کی وجہ سے انھیں اردو افسانوی ادب میں بھی اپنا منفرد مقام عطا کر چکے تھے۔ اس زمانے کے اعلیٰ معیاری ادبی رسائل جیسے ماہنامہ ادب لطیف لاہور ان کے افسانوں کی اشاعت پر معاوضہ بھی پیش کرتے تھے۔

ایک ایسے ہمہ لسانی اردو ادیب تھے جنھیں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی جیسے شہرۂ آفاق ادیبوں کا ہمعصر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ معاصرانہ چشمک کی وجہ سے انھیں کوئی فراڈ کہتا تھا (منٹو) تو کوئی مہابور (کرشن چندر) البتہ بعضوں نے انھیں عوامی فنکار (راجندر سنگھ بیدی) ادبی رشی (پرکاش پنڈت) اور تخلیقی (Creative) آوارہ (بلراج مین را) قرار دیا۔ گاندھی جی نے ان کے کام کو 'بھارت ماتا کا کام' کہہ کر سراہا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ان کے کام سے خوش ہو کر انھیں اپنے شانتی نکیتن میں جگہ دی۔ ان کے کارناموں کے اعتراف میں حکومت ہند نے انھیں پدم شری (1977) کے اعزاز سے نوازا۔

دیویندر ستیارتھی نے لوک ادب کو اردو میں روشناس کرانے اور مختلف صوبوں میں بکھرے ہوئے نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کے لوک گیتوں کے انمول خزانے سے اردو زبان کو متعارف کرانے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں لیکن انھیں ہم نے یکسر فراموش کر دیا۔ یہ اردو والوں کی ناسپاسی نہیں تو کیا ہے کہ جس جوکھم بھرے کام کا اردو والے تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ ایسے کام کو سرانجام دینے والا کا ذکر نہ اردو کے کسی نصابی کتب میں ہے اور نہ ہی ان پر تحقیقی کام کرنے کا خاطر خواہ حق ادا کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔

لوک ادب سے ہماری یہ بے اعتنائی نہیں تو اور کیا ہے۔ لوک ادب کے ساتھ اسی بے توجہی کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس نے بجا طور پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔

''جو بات حیرت کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ آج جمہوری دور میں بھی اردو والے عوامی ادب کے اس سرمایے کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سرمایہ کو ملک کی دوسری زبانیں اپنے تصرف میں لا کر اپنے آپ کو مالا مال کر رہی ہیں اور اپنی ادبی تاریخ کی حدوں کو وسیع تر بنا رہی ہیں۔'' (اردو میں لوک ادب، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، پیش لفظ، ص 4)

دیویندر ستیارتھی کے ایک ہم عصر ادیب اور ان کے رفیق پرکاش پنڈت نے ماہنامہ 'نقوش' لاہور کے شخصیات نمبر میں ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس نے اردو ادب کو ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں کے لوک گیتوں سے روشناس کرایا۔ لوک گیتوں کو ادب کا ایک حصہ بنانے اور ان کے ذریعے مختلف قوموں کے کلچر کو ایک لڑی میں پرونے کا جو نمایاں کام ستیارتھی نے سرانجام دیا ہے اور اس کے لیے جو صعوبتیں اٹھائی ہیں اردو ادب کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔'' (ماہنامہ 'نقوش' لاہور، شخصیات نمبر 1955، ص 438)

لوک گیتوں کو جمع کرنے کا کام فیلڈ ورک (Field work) کا متقاضی ہے۔ اس کام سے وہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کے اندر لگن ہو۔ جنون کی حد تک اپنے کام سے لگاؤ ہو اور سفر کو حضر بنانے کا عزم مصمم رکھتا ہو۔ جس کا مزاج قلندرانہ ہو اور طرز فقیرانہ ہو۔ جو ایک سنیاسی کی طرح گاؤں گاؤں قریہ قریہ اپنا کشکول لے کر پھرنے میں عار نہ محسوس کرتا ہو۔ یہ تمام صفات دیویندر ستیارتھی میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان کے اسی جذبۂ قلندری کو میرا جی نے اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

بستی بستی پھرا مسافر، گھر کا راستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا، اپنا پرایہ بھول گیا

وہ لوک گیتوں کی تلاش کرنے کی دھن میں اپنے گھر بار کو بھول گئے۔ لوک گیتوں کے ساتھ اس عشق کی ابتدا کالج کی تعلیم کے دوران ہی ہو گئی تھی۔ چنانچہ دیویندر ستیارتھی پر داد تحسین دیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسمیع نے ان کے اس عشق کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ڈی اے وی کالج (لاہور) کے دوستوں میں وزیر خان اور پریم ناتھ ایسے تھے جن سے ستیارتھی کی قربت تھی۔ وزیر خان افغانی تھا۔ وہ ستیارتھی کو افغانستان کے لوک گیت سناتا اور اس کی خوبصورتی کچھ اس انداز میں بیان کرتا کہ ستیارتھی جھوم اٹھتے۔ پریم ناتھ کا تعلق کشمیر سے تھا وہ کشمیری لوک گیت اور وہاں کی تہذیب و تمدن ستیارتھی کے سامنے بیان کرتا اور انھیں آنے کی دعوت بھی دیتا۔''

(نیا ادب (3)، بنگلور، مرتبہ خلیل مامون، مشمولہ مضمون: دیویندر ستیارتھی، سوانح و شخصیت از: عبدالسمیع)

دیویندر ستیارتھی کی پیدائش 28، مئی 1908ھ کو پنجاب کے ایک ضلع سنگرور میں واقع گاؤں بھروڑ میں ہوئی اور ان کا انتقال 12، فروری 2003 کو تقریباً پچانوے سال کی عمر میں ہوا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لوک گیتوں کو اکٹھا کرنے میں گزارا۔ اپنی عمر کے نصف اول میں انھوں نے اردو میں زیادہ لکھا۔ کیونکہ آزادی سے پیشتر اردو میں لکھنا اور شائع ہونا اس اعتبار سے افادیت کا حامل تھا کہ ان کی بات زیادہ سے زیادہ قاریوں تک پہنچتی تھی اور اس کا معاوضہ بھی ملتا تھا اور ستیارتھی کا گزارا اسی معاوضے پر ہوتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کے چند سال بعد اپنی زیادہ تر توجہ دیگر زبانوں مثلاً ہندی، پنجابی اور انگریزی کی جانب دینی شروع کر دی۔ شاید اسی وجہ سے اردو والوں نے بھی ان کی جانب اپنی توجہ کم کر دی۔ ویسے سرکاری رسائل مثلاً ماہنامہ 'آج کل' وغیرہ میں وقتاً فوقتاً وہ اپنے مضا

مین اور افسانے شائع کرتے رہے۔ لیکن کتابیں زیادہ تر ہندی اور پنجابی میں شائع ہوئیں۔

ستیارتھی میں لوک گیتوں کو جمع کرنے کا شوق جنوں کی حدیں پار کر گیا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ گھر سے سبزی لینے کے بہانے نکلتے اور ان کے قدم لوک یاترا پر گامزن ہو جاتے۔ شادی کے کچھ دنوں کے بعد اسی بہانے جب وہ نکلے تو دو سال بعد اپنے گھر لوٹے۔ بیوی نے پوچھا کہ چار آنے کی سبزی لینے کے لیے نکلے تھے تو انھوں نے جواب دیا کہ ''دیکھو! چار ہزار لوک گیت لے کر آیا ہوں۔ (ایضاً)

انھوں نے لوک گیتوں کی تلاش میں کیے جانے والے سفر کو 'خواب کا سفر' قرار دیا ہے۔ لوک گیتوں کو اکٹھا کرنے کے اپنے دیرینہ خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے وہ گھریلو آسائشوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے کندھے پر تھیلا لٹکائے، کیمرہ ہاتھ میں لیے اور بڑھتی ہوئی داڑھی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے خواب کے سفر پر نکل پڑتے اسی لیے پرکاش پنڈت نے چند لفظوں میں بلکہ فارمولے کی صورت میں ان کی شخصیت کا خاکہ اس طرح بیان کر دیا ہے۔

(ماہنامہ 'نقوش' لاہور۔ شخصیات نمبر مضمون از پرکاش پنڈت)

تھیلا+ کیمرہ+ داڑھی= دیویندر ستیارتھی

لوک گیتوں کو جمع کرنے کے لیے انھوں نے سنیاسی کا روپ دھار لیا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے گاؤں کے لوگ انھیں عزت اور عقیدت سے دیکھتے اور ان کا ہر طرح سے تعاون کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ اسی لیے کسی نے ان کی داڑھی کو 'پاسپورٹ' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ جس کے ذریعے وہ ایسی جگہوں پر بھی پہنچ جاتے تھے جہاں کلین شیو (Clean shave) والا پہنچ نہیں پاتا۔

لوک گیتوں کی تلاش و جستجو میں انھوں نے کہاں کہاں کا سفر اختیار نہیں کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اندرون ملک کشمیر سے لے کر کنیا کماری، بیرون ملک سری لنکا، برما، نیپال جیسے دور دراز علاقوں تک کا سفر کیا۔ اس کی مثال اردو ادب کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ دیگر زبانوں کی تاریخ میں بھی شاذ و نادر ہی ملے گی۔ انھوں نے لوک گیتوں کو اکٹھا کرنے کے کام کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا اور اس کی تکمیل کی راہ میں حائل مشکلات اور صعوبتوں کو انھوں نے دل و جان سے برداشت کیا۔ انھوں نے ایک جگہ لوک گیت کو قوم کا دفینہ قرار دیتے ہوئے ان الفاظ میں اس راہ کی مشکلات کا ذکر کیا ہے:

''ان گیتوں کی کھوج میں قلندر کی طرح ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک گھوما ہوں۔ بھک منگوں کی طرح اپنا کشکول لے کر ہر اس شخص کے پاس گیا ہوں جو اُس میں لوک گیت کی چٹکی ڈال سکتا تھا۔ میں نے جواہرات کے معنی ان گیتوں کی قدر کی، قیمتی پتھروں کی طرح انھیں سینے سے لگایا... لوک گیت قوم کا دفینہ ہیں میرے دوست۔'' (ایضاً ص 438)

اردو کے ممتاز نقاد شمیم حنفی نے لوک گیتوں کے ساتھ جنون کی حدوں کو پار کرنے والے ان کے اس عشق کو 'مقدس کار جنوں' سے تعبیر کیا ہے۔ نقاد عبدالسمیع کی رائے میں ان کا شمار اردو کی ان چند شخصیات میں ہوتا ہے جنھیں ہم تہذیبی استعارے کا نام دے سکتے ہیں۔

(نیا ادب (3) مرتبہ خلیل مامون)

ستیارتھی نے لوک گیتوں کا خزینہ ہی اردو ادب کو نہیں دیا بلکہ ایک اندازے کے مطابق لوک گیت اور لوک ادب کی اصطلاح کو رائج کیا۔ لوک گیت کو اس سے قبل اردو میں دیہاتی گیت اور ہندی میں گرام گیت کہا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی نے بھی انھیں لوک گیت کی اصطلاح کے استعمال کا مشورہ دیا تھا۔

''1932 میں ان کی ملاقات سنیتی کمار چٹرجی (ماہر لسانیات) سے ہوئی۔ انھوں نے ستیارتھی کے کام میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی وہ مختلف زبانوں میں اس کے مختلف ناموں سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے ستیارتھی سے کہا کہ اگر ان ناموں کے بجائے صرف لوک گیت کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے... ستیارتھی کی کوششوں سے یہ اصطلاح نہ صرف ادبی حلقوں میں متعارف ہوئی بلکہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی اسی اصطلاح کا استعمال شروع ہوا۔ اور آج بھی انھیں لوک گیت ہی کہا جاتا ہے۔

(گمری گمری پھرا مسافر، مرتبہ از۔ عبدالسمیع۔ پیش لفظ)

لوک گیتوں سے متعلق دیویندر ستیارتھی کی اولین تصنیف بعنوان 'میں ہوں خانہ بدوش' 1991 میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ اس کتاب کی تلاش و جستجو کا احوال بیان کرتے ہوئے عبدالسمیع کا کہنا ہے کہ کئی سال تک اس کا نسخہ تلاش کرنے کے بعد انھیں یہ اطلاع ملی کہ اس کا ایک نسخہ شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کا انتساب انھوں نے اپنی بیوی شانتی دیوی کے نام کیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ میاں بشیر احمد مدیر ماہنامہ 'ہمایوں' نے لکھا ہے۔ اس میں پندرہ مضامین ہیں اور مختلف اصناف ادب سے متعلق ہیں۔ ستیارتھی نے 'اپنی بات' کے عنوان سے گیارہ صفحات کا جو مضمون لکھا ہے اس میں لوک گیتوں سے اپنی وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ جس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کی روح گاؤں کے لوگوں میں ہی بستی ہے۔ اور لوک گیتوں کی تلاش میں دردر بھٹکنے سے ان کا مقصد دراصل ہندوستان کی تہذیب کی جڑیں تلاش کرنا ہے۔

اس کتاب میں چند ایک مضامین کے علاوہ بقیہ تمام مضامین افسانے کی صورت میں ہیں۔ ستیارتھی نے لوک گیتوں کے تجزیے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کا اظہار ان الفاظ میں ملتا ہے:

''ہندوستان کے مختلف صوبوں کی دیہاتی زبانوں کا تقابلی مطالعہ بہت اہم ہے ان صوبوں میں بھی جہاں ہندو آبادی زیادہ ہے یا جہاں کی زبانوں میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کتنے ہی فارسی اور عربی الفاظ بھی موجود ہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ زبان کے متعلق ہمارا تعصب سرے سے سطحی اور بناوٹی ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر کسی الفاظ کا استعمال نہیں کرتے کہ اس کا حسب و نسب جنم استھان یا مذہب کیا ہے بلکہ ہر لفظ ان کی زبان پر اس طرح آتا ہے جیسے دھرتی پر کوئی پودا اگتا ہے۔''

(نیا ادب (3) مرتبہ خلیل مامون، ص 1054)

دیویندر ستیارتھی کی دوسری کتاب 'گائے جا ہندوستان' ہے جو لوک گیتوں پر مشتمل ہے۔ جس کی اشاعت 1946 میں عمل میں آئی۔ اس کتاب کا مقدمہ اردو کے ممتاز افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے تحریر کیا ہے۔

اس کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف اردو اور ہندی لوک گیتوں کو پیش کیا گیا ہے بلکہ ہندوستان کی چودہ ریاستوں کے لوک گیتوں کو ان کی لوک روایتوں کے پس منظر اور سیاق و سباق میں پیش کیا گیا ہے دیگر زبانوں کے لوک گیتوں کا انھوں نے اردو ترجمہ بھی پیش کر دیا ہے۔ اور ان کا یہ ترجمہ بجائے خود شاعری کا نمونہ بن گیا ہے۔ انھوں نے ہر لوک گیت کے ساتھ یہ تفصیل بھی دی ہے کہ کون سا لوک گیت کس موقع پر اور کس موسم کے لیے گایا جاتا ہے۔ اگر اس کا تعلق کسی مخصوص رقص سے ہے تو اس کی بھی تفصیل درج کر دی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے ان لوک گیتوں کی تلاش میں ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کا سفر اختیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ شہر مدراس بھی آئے تھے۔ ان کی آمد یہاں پر 1939 میں ہوئی تھی۔ انھوں نے یہاں پر واقع YMCA کی جانب سے منعقدہ ایک جلسے میں لوک گیتوں پر لیکچر بھی دیا تھا۔ جس کی صدارت چکرورتی راجہ گوپال اچاریہ نے کی تھی۔

یہاں سے انھوں نے کنیا کماری تک کا سفر کیا اور وہاں سے سری لنکا بھی گئے۔ بہر حال ریاست تملناڈو (جو اس وقت مدراس پریسیڈنسی کہلاتی تھی) میں قیام کے دوران انھوں نے تمل لوک گیت بھی جمع کیے۔ چنانچہ ان

کی دوسری کتاب 'گائے جا ہندوستان' میں شامل پہلا مضمون تمل لوک گیت پر مشتمل ہے۔ اس گیت کا عنوان ہے 'مل کر پھنسو مچھلیو!' تمل خطہ کا ایک ماہی گیر بیچ سمندر میں گیت گا کر اپنا جال لہروں میں پھینکتا ہے اور مچھلیوں کو خود جال میں آکر پھنسنے کی دعوت دیتا ہے۔ ماہی گیروں کی روایت کے مطابق یہ گیت وہی گا سکتا ہے۔ جس کی سگائی ہو جاتی ہے۔ اور جو پہلا شکار اپنی ہونے والی بیوی کے روبرو لاکر رکھتا ہے۔ دلہن ان مچھلیوں کو دیکھ کر اپنے (منگیتر) کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔ سگائی کے بعد دلہن خود اپنے منگیتر کو شکار پر جانے کے لیے کہتی ہے۔ اس شادی کی رسم کے لیے یہی سب سے ضروری شرط ہوتی ہے۔ اس تمل گیت کا اردو ترجمہ اس طرح ہے۔

مل کر آؤ، مل کر آؤ مچھلیو!

اے میرے محافظ! مچھلیوں کی ٹولی بنا کر (میرے روبرو) ڈھکیل دینی چاہیے۔

اور میرے محافظ! مل کر مچھلیوں کو جمع ہونا چاہیے۔

میرے محافظ! ان کی فوج بنا کر (میرے روبرو) ڈھکیل دینی چاہیے۔

ارے او بڑے مچھ! صاف پانی کے اور گرم پانی کے مچھ! آ تو

بھنور کی سفید مچھلی! او بھنور کی سفید مچھلی! آ تو
شنگم درخت کے پتے توڑ کر ہم جاتی لنگم لے آئے ہیں۔
شنگم درخت کے پتے توڑ کر ہم تمہارے نئے نئے جلوے دیکھنے آئے ہیں۔
اری مچھلیو! ہم بھات کی پوٹلی باندھ کر آئے ہیں۔
ہم ان دیکھے دیس میں آئے ہیں اری مچھلیو!
ہم بیوی بچوں کی پرورش کے لیے آئے ہیں اری مچھلیو!
ہم تمہارے جلوے دیکھنے کے لیے آئے ہیں اری مچھلیو!
دور دور کی لڑکیوں نے تمھیں گھیر کر لانے کو کہا ہے۔
جوان کنواریوں نے تمھیں دیکھ کر لوٹنے کو کہا ہے (اری مچھلیو!)

اس طرح انھوں نے ملابار، اڑیسہ، منی پور اور سنتھالی وغیرہ کے لوک گیتوں کو بھی پیش کیا ہے۔ جس طرح گاندھی جی نے کہا تھا کہ اصل ہندوستان یہاں کے دیہاتوں میں بستا ہے تو انھوں نے ان دیہاتوں کے عوامی گیتوں کو جمع کرنے کے بعد اس کو تحریری شکل میں پیش کر کے گویا ہندوستان کی اصل روح کو مجسم کر دیا ہے اور ملک کے دھڑکتے ہوئے دل کو زبان عطا کر دی۔

دیویندر ستیارتھی نے اپنی تصنیف 'گائے جا ہندوستان' میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوک گیتوں کو یکجا کر کے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا ایک مرقع ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ عبدالسمیع کے الفاظ میں "یہ کتاب ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی تاریخ اور اس کی تفہیم کے لیے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے... اگر کوئی شخص قدیم اور جدید ہندوستانی تہذیب کو پڑھنا اور سمجھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہ کتاب گنج گراں مایہ ثابت ہوگی۔"

(بحوالہ نگری نگری پھرا مسافر، مرتبہ عبدالسمیع، ص 408)

لوک گیتوں کے متعلق ان کی تیسری تصنیف 'دھرتی کے گیت' کے متعلق صرف اتنی معلومات دستیاب ہیں کہ مہاتما گاندھی کی شہادت (1948) سے قبل ستیارتھی نے ان سے اپنی ملاقات کے دوران گزارش کی تھی کہ وہ اس کتاب کا دیباچہ لکھیں اور گاندھی جی نے رضامندی بھی ظاہر کر دی تھی لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا اور یہ ستیارتھی کی بدقسمتی کہیے یا زبان و ادب کی بدبختی کہ اگلے ہی دن مہاتما کی شہادت واقع ہو گئی۔ غالباً یہ کتاب ہندی میں مہاتما کے دیباچے کے بنا ہی شائع ہوئی ہو لیکن اردو میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

لوک گیتوں پر مشتمل مذکورہ دو تصنیفات کے علاوہ اردو میں ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ایک مجموعے کا نام تھا 'نئے دیوتا' (مطبوعہ 1942) اور دوسرے مجموعے کا عنوان تھا 'اور بانسری بجتی رہی' (مطبوعہ 1945) دوسرے مجموعے کا مقدمہ کنہیا لال کپور نے تحریر کیا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد ان کی کوئی تصنیف کتابی صورت میں منظر عام پر نہیں آئی لیکن گاہے گاہے ان کے افسانے کئی اردو رسائل کی زینت بنتے تھے۔ ان کی وفات (2003) کے کئی سالوں بعد دیویندر ستیارتھی کی شخصیت اور کارناموں کو ڈاکٹر عبدالسمیع نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ان کے افسانوں کو 'شہر شہر آوارگی' کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔

جس طرح اردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی نے اپنی طبع زاد نظموں کے ذریعے عوامی ادب کی نظیر قائم کی۔ اسی طرح خود عوام کے تخلیق کردہ گیتوں کو تحریری شکل میں مبسوط طور پر یکجا کر کے ہندوستانی ادب کے اس خوش نوا فقیر نے جو بے نظیر کارنامہ انجام دیا ان دونوں کی نظیری اور بے نظیری کا اردو تاریخ میں کوئی جواب نہیں۔ اسی لحاظ سے انھیں اگر ہندوستانی لوک ادب کا کولمبس قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جس طرح نگری نگری اور دیس بدیس کا سفر کر کے ہندوستانی لوک ادب کے گمشدہ خزینے کو دریافت کیا ہے۔

مضمون کے اختتام پر لوک گیتوں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں جو ان کی کتاب 'گائے جا ہندوستان' سے ماخوذ ہیں۔ (بحوالہ ماہنامہ آجکل، مئی 1996)

ارے ہل! تیرے ہاتھوں کو نمسکار
ارے ہل! تیرے پیروں کا نمسکار
سالی کے پیڑ کو سراہتا ہوں
جس سے تم بنائے گئے ہو
تم سدا بلوان رہو
تم سدا کام کے لیے تیار رہو
چاول ہے دال ہے
چولھا نہیں یہی وقت ہے
ہوا چل رہی ہے گرد اڑتی ہے کواڑ نہیں یہی وقت ہے
بیوی آکر سامنے کھڑی ہے
ساڑی نہیں یہی وقت ہے
فقیر آکر دروازے پر کھڑا ہے
دھیلا نہیں یہی وقت ہے

لوریاں

چندا ماموں دور کے
بڑے پکائیں بور کے
آپ کھائیں تھالی میں
ہمیں دے پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ
چندا ماموں گئے روٹھ
پیالی اور لائے
چندا ماموں دوڑ آئے

اے بوا ہمائی
کاہے کی دال پکائی
مسور کی دال پکائی
اس میں مرچ نہ کھٹائی

چوں چوں کرتی آئی میری چڑیا
میاں کا سنگنا لائی میری چڑیا
پروں میں شکر لائی میری چڑیا
چونچ میں چھوارے لائی میری چڑیا
چڑیا چھوڑوں تیرا پیٹ
کاہے کو کھائے بھیا کا کھیت
کھیت دکھائے بھیا جائے
روٹی لے کے میا جائے

■

Dr Hayath Iftekhar
(Rtd)HOD of Urdu
Quide Millath College (Men)
Medavakkam,Chennai.
Mobile: 9884733619

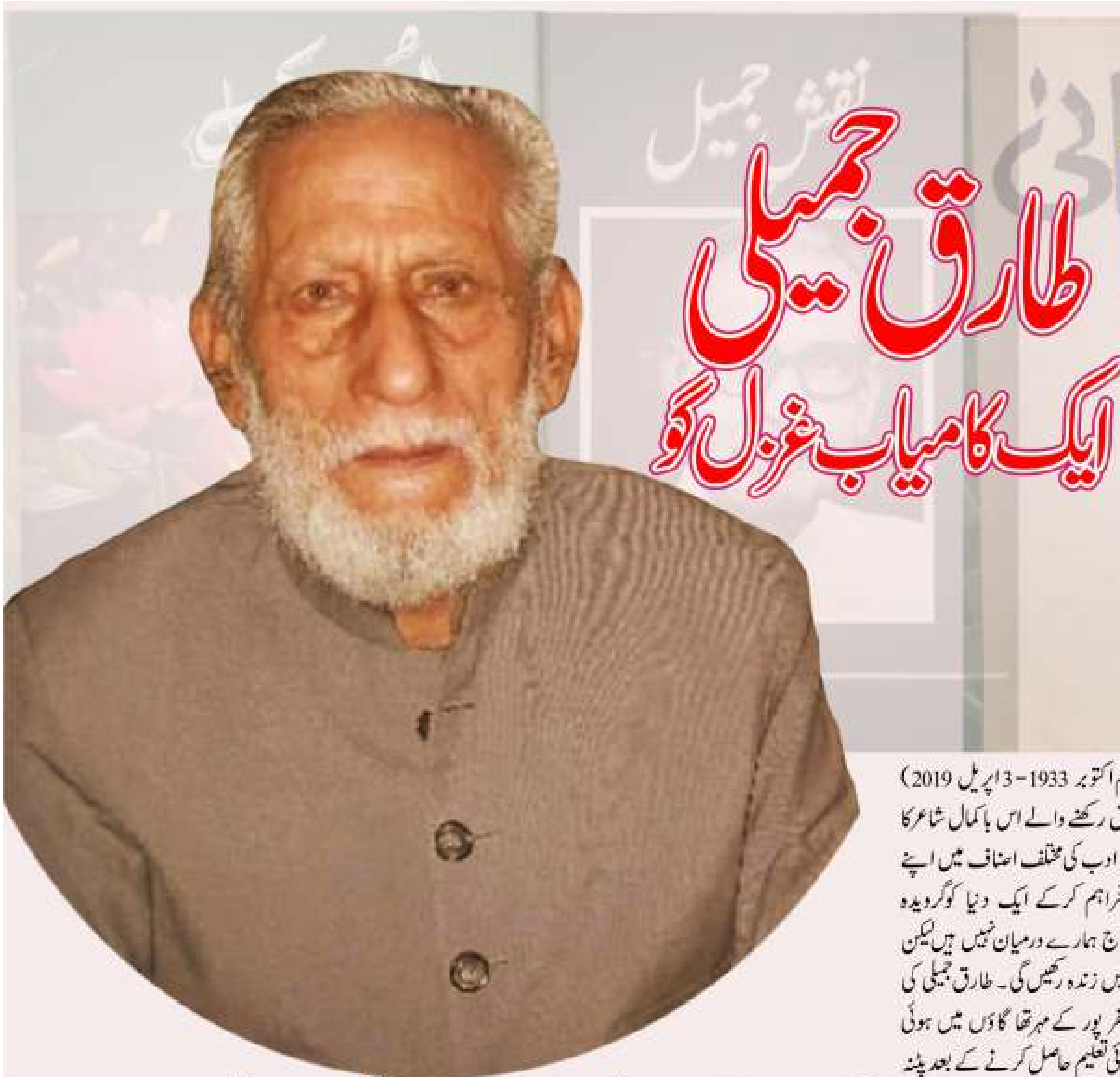

طارق جمیلی
ایک کامیاب غزل گو

قسیم اختر

طارق جمیلی (یکم اکتوبر 1933 - 3 اپریل 2019) سرزمین پورنیہ سے تعلق رکھنے والے اس باکمال شاعر کا نام ہے جس نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں اپنے زور بیان کا ثبوت فراہم کرکے ایک دنیا کو گرویدہ کیا ہے۔ طارق جمیلی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی ادبی کاوشیں انہیں زندہ رکھیں گی۔ طارق جمیلی کی پیدائش 1933 میں مظفر پور کے مہرتھا گاؤں میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی۔ اور پورنیہ کالج میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور صدر شعبہ کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ وہ ایک کامیاب مدرس بھی تھے۔ طارق جمیلی کا انتقال 2 اپریل 2019 کو ہوا۔

طارق جمیلی نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے جو بہت مقبول ہوئے جنھیں نصاب میں شامل کیا گیا۔ انھوں نے پورنیہ کے نام سے ایک طویل نظم لکھی جو ان کی شہرت کا باعث بنی۔ لیکن وہ بنیادی طور پر زلف غزل کے اسیر تھے۔ انھوں نے غزل کے گیسو سنوارنے میں اپنا زیادہ وقت صرف کیا۔ اگر موت نے مہلت دی ہوتی اور وہ صرف غزل کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے تو غزل کے سرمائے میں مزید اضافہ ہوتا اور ان کے شعری محاسن قاری کو مزید گرویدہ کرتے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اب تک ان کا صرف ایک شعری مجموعہ 'جذب دروں' کے نام سے منظر عام پر آسکا ہے۔ اس کے باوجود خوش آئند بات یہ ہے کہ ہمیں مایوسی نہیں ہوتی کہ ان کا شعری سرمایہ قلیل ہے۔ کیوں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ کر لکھا ہے اور اس مختصر شعری مجموعے میں بھی بہت کچھ ایسا فن پارہ موجود ہے جو قاری کو تسکین عطا کرنے کے ساتھ طارق جمیلی کو شہرت دوام بخشنے میں کامیاب ہے۔ اس کے علاوہ 'نقش جمیل' 2013 میں منظر عام پر آیا اور طارق جمیلی کا انتقال 2019 میں ہوا۔ اس درمیانی مدت میں طارق جمیلی کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں جب وہ لکھنے سے قاصر تھے تو اپنا کلام اپنی اہلیہ سے ڈکٹیٹ کرایا تھا۔

جمیلی کا شعری کے مجموعہ 'جذب دروں' کا آغاز حمد ونعت سے ہونے کے بعد غزلوں سے شروع ہوتا ہے اور کتاب کے آخر میں نظموں کا حصہ ہے۔ اس حصے میں والدہ کے نام ایک اور والد کے نام دو نظموں کے ساتھ سترہ نظمیں شامل ہیں۔ ایک مثنوی ہے 'ایک عورت کی کہانی اس کی زبانی'۔ ایک گیت ہے 'چند مچھیرے صبح سویرے لے کر نکلے جال'۔ ایک نظم 'صبح ہوئی' بکیل اتساہی کے نام ہے جب کہ قطعات اور ثلاثی کے علاوہ متفرقات کے تحت درجنوں اشعار شامل ہیں۔ گویا کتاب کا وافر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزلوں کی کل تعداد 63 ہے۔ اس مجموعے میں ان کی مشہور نظم 'پورنیہ' شامل نہیں ہے۔

طارق جمیلی کی تخلیقیت کا جائزہ ان کی غزلوں کے حوالے سے لیتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ طارق کے اندر ایک جینوئن فنکار موجود تھا۔ طارق جمیلی کی قوت اظہار انھیں صنف غزل کی آبیاری میں نیا پن پیدا کرنے اور اپنی بات کو اپنے انداز میں کہنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ طارق جمیلی پامال مضامین کو بھی اپناتے ہیں تو اس میں نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ طارق جمیلی جدید عہد کے شاعر تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے جدید موضوعات کو بھی اپنایا ہے اور روایتی مضامین کو بھی اپنے انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی وہ نئی تشبیہات اور استعارات وضع کرنے میں بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اپنی داخلی کیفیات کے اظہار میں بھی کوئی کمی کوتاہی نہیں کرتے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ طارق جمیلی کسی مخصوص نظریے، ازم اور روایت سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ انھوں نے آزاد نظم بھی کہی ہے

طارق جمیلی کی تخلیقیت کاجائزہ ان کی غزلوں کے حوالے سے لیتے ہوئے یہ محسوس ہوتاہے کہ طارق کے اندر ایک جنیوئن فنکار موجود تھا۔ طارق جمیلی کی قوت اظہار انہیں صنف غزل کی آبیاری میں نیاپن پیداکرنے اور اپنی بات کو اپنے انداز میں کہنے پر مجبو رکرتی تھی۔

لیکن گہری علامتوں سے گریز کیا ہے۔ جس کا براہ راست مطلب یہ ہے کہ وہ قاری کو فراموش کرنا نہیں چاہتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار براہ راست دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ درج بالا سطور میں جو باتیں کہی گئیں ان کی مثال کے لیے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ان اشعار میں خالص طارق جمیلی بولتا ہوا نظر آئے گا لیکن اس سے قبل طارق جمیلی کا یہ شعر بھی دیکھتے چلیں جس سے ان کا نظریہ فن بھی واضح ہوجاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

طارق تمھارا فن ہے روایت کا پاسدار
ہر دور کے تقاضوں سے غافل نہیں رہا

گویا وہ ایک طرف روایت کے پاسدار ہیں تو دوسری طرف اپنے عہد کے تقاضوں سے غافل بھی نہیں۔ یہ چیز طارق جمیلی کی شناخت ہے۔ بہرکیف اب مختلف نوعیت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔

فریب آرزو میں زندگی کیا کیا اٹھا لائی
ستم لائی قلق لائی بلا لائی قضا لائی

نہ روکے اشک رکتے ہیں نہ دل تھامے سے تھمتا ہے
یہ شب کی خامشی کس دل شکستہ کی صدا لائی

اب کہاں فرصت کہ کوئی جا کے تعزیت کرے
فون ہی پر چند آنسو اب بہا لیتے ہیں لوگ

بے غرض کوئی کسی کے گھر پہ اب جاتا نہیں
اب کہاں ملنے ملانے کی وہ خوش اخلاقیاں

میاں طارق یہ آئینہ یہاں کس کو دکھاتے ہو
بدل کر اپنے چہروں کو سبھی محفل میں آتے ہیں

آج ہر شہر پہ صحرا کا گماں ہوتا ہے
کل تو صحرا میں بھی ہم شہر بسا رکھتے تھے

ان اشعار میں وہ سبھی کچھ محسوس کیا جاسکتا ہے جن کا ذکر ناچیز نے درج بالا سطور میں کیا ہے۔ یعنی پامال مضامین کو نئے ڈھنگ سے باندھنا، داخلی کیفیات، عصری آگہی، سماجی بے راہ روی، انسانی رشتوں کی ناقدری اور بڑھتی دوریاں اور جدید شعرا کی طرح شہر کو جنگل سے تعبیر کرنا وغیرہ۔ حالانکہ ان اشعار کو پیش کرنے کے لیے میں نے کوئی انتخاب نہیں کیا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی عرق ریزی کرنی پڑی ہے۔ اس طرح کے اشعار ان کے مجموعے میں جابجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایسے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ طارق جمیلی نے جبراً کسی موضوع کو برتنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ان کے دل نے جو کچھ محسوس کیا ہے اسے پیش کردیا ہے۔

اردو شاعری میں آنکھ اور اشک پر بہت سے اشعار مل جائیں گے۔ ہر عہد کے شعرا ایسے موضوعات کو اپنے اپنے طور پر کہتے رہے ہیں۔ ایک شعر طارق جمیلی کا ملاحظہ فرمائیں اور اس کی کیفیت کو اپنے دل میں جذب کرتے ہوئے مسکرائیں بھی آنسو بھی بہائیں۔ شعر ہے۔

دیدۂ نم کھلے کنول ہوں گے
اشک گریہ کوئی ندی ہوگی

زندگی ایک ایسی گتھی ہے جس کی ڈور سلجھانے سے نہیں سلجھتی۔ حالانکہ ہرفن کار اپنے طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے پھر بھی یہ ایک سوال ہی رہ جاتا ہے۔ اسی سوال کو طارق جمیلی سانسوں کے زیر و بم میں تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

حرف اقرار ہے انکار ہے کیا ہے یہ حیات
ہر نفس مجھ سے الجھتا ہے سوالوں کی طرح

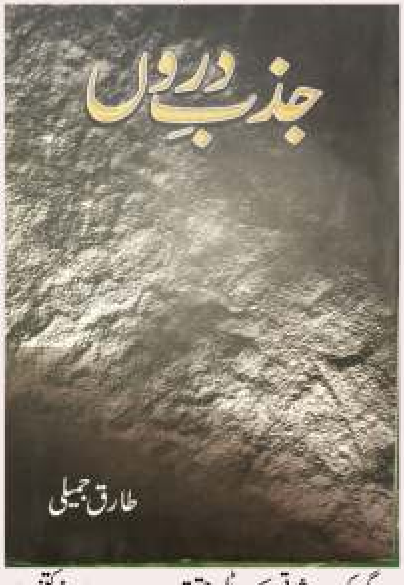

زندگی کی بے ثباتی ایک اٹل حقیقت ہے۔ نہ جانے کتنی بار اس کا اعتراف کیا گیا ہے لیکن یہ موضوع ہر شاعر کو کچھ کہنے کے لیے اکساتا رہتا ہے۔ کچھ حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو بالکل ظاہر ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود اسے سمجھنے اور سمجھانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایسے میں طارق جمیلی اسی بے ثباتی کو اپنا موضوع بناتے ہیں تو یہ حیرت کی بات نہیں ہے البتہ یہ ضرور دیکھنے کے قابل ہے کہ اسے انھوں نے کس طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔ طارق کہتے ہیں۔

بھور کی بیلا طاق پہ رکھی اک بجھتی سی باتی ہوں
ساحل لگتی نیا ہوں اور سانجھ کی ڈھلتی لالی ہوں

اس شعر میں دیکھنے کی چیز زندگی کی بے ثباتی نہیں ہے بلکہ اس بے ثباتی کو اپنی زندگی سے عبارت کرکے اسے پیش کرنے کے انداز میں ہے۔ زندگی کی اس بے ثباتی کو واضح کرنے کے لیے طارق جمیلی نے اس ایک شعر میں تین مثالیں دی ہیں۔ اور تینوں کمال کی ہیں۔ اس سے شاعر کی شاعرانہ ہنرمندی آشکار ہوتی ہے۔ زندگی کا المیہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ بے ثبات ہے بلکہ اس بے ثباتی میں انسان کیا کیا خواب بنتا ہے، آرزوئیں اور تمنائیں پالتا ہے لیکن وہ بھی تکمیل کے مرحلے سے نہیں گزر پاتیں۔ ایسے میں انسان کا غم دوگنا ہوجاتا ہے۔ اور اسے غلط کرنے کے لیے انسان کبھی خود کو ملامت کرتا ہے اور کبھی تاسف کا ہاتھ ملتے ہوئے کہتا ہے کہ کاش وہ کوئی آرزو نہ پالتا۔ آرزوؤں کے اس کھیل میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کسی کی ذات سے امیدیں وابستہ کرلیتا ہے لیکن یہ امیدیں برنہیں آتیں۔ اس صورت میں بھی آرزو کی موت ہوتی ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا انسان کا کام ہوتا ہے کہ وہ آرزو رکھے تو اس کی تکمیل کے لیے کسی سے اظہار کرے یا نہ کرے؟ اگر اظہار کرتا ہے اور اس کا جواب نفی میں آتا ہے تو اس کا حاصل کیا؟ دونوں صورتوں میں آرزو کی موت ہوتی ہے۔ اس مقام پر اگر شاعر یہ سوچے کہ اظہار آرزو کیوں کرے جب کہ وہ پوری ہی نہ ہو تو اسے مثبت سوچ ہی کہیں گے۔ طارق جمیلی کے اس مایوسی بھرے شعر میں امید کی بات یہ ہے کہ اگر اظہار کی صورت میں بھی آرزو کی موت ہوتی ہے تو اس کا اظہار نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ طارق جمیلی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں جو قاری کو چونکاتا ہے۔

آرزو یوں بھی گھٹ کے مرجاتی
کاش کچھ بھی کہا نہیں ہوتا

زندگی ایک ایسی گتھی ہے جس کی ڈور سلجھانے سے نہیں سلجھتی۔ حالانکہ ہرفن کار اپنے طو رپر اسے سمجھنے کی کوشش کرتاہے پھر بھی یہ ایک سوال ہی رہ جاتاہے۔ اسی سوال کوطارق جمیلی سانسوں کے زیر و بم میں تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آرزوؤں کے ٹوٹنے پر بہر حال مایوسی ہی ہاتھ لگتی ہے لیکن آغاز میں ہی ارمانوں کے ستارے ڈوبنے لگیں تو یہ شاعر کے لیے تشویش کی بات ہوگی اور وہ اپنے آپ پر ہی یہ سوال کھڑا کرنے لگتا ہے کہ آغاز کا یہ عالم ہے تو انجام کیا ہوگا؟

ڈوبے جاتے ہیں ستارے مرے ارمانوں کے
رات کا ہے ابھی پہلا ہی پہر کیا ہوگا

زندگی میں ملنے والے غم کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ کبھی معاملات زندگی، مسائل حیات، کبھی معشوق کی بیزاری اور بے وفائی اور کبھی اپنوں اور پرایوں کی طرف سے دی جانے والی چوٹ۔ طارق جمیلی کے یہاں ہر طرح کے غم پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا کہ طارق جمیلی کسی ازم سے وابستہ نہیں تھے لیکن ان کے یہاں روایت اور جدت دونوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں غم جاناں بھی ہے اور غم حیات کے ساتھ غم روزگار بھی ہے۔ اس بات کی تصدیق نہیں کی جاسکتی کہ طارق جمیلی نے عشق کا شیوہ اپنایا تھا یا نہیں تاہم ان کے اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انھوں نے عشقیہ مضامین میں بھی خوبصورت اشعار نکالے ہیں۔

آج کی شب کا جو مہتاب بنو بات بنے
روشنی تاروں کی مدھم ہے کوئی پل ٹھہرو

اس شعر میں شاعر یہی کہنا چاہتا ہے کہ ہجر میں دل فگار ہے۔ آسماں پر خوبصورت تارے بھی مدھم نظر آنے لگے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی مداوا ہے اور وہ یہ ہے کہ ترا وصال نصیب ہو۔ ترا وصال مہتاب کی طرح ہے جس کے بعد ماند ستاروں کی روشنی بڑھ جائے گی۔ وصال کا سرور دل کو وہ طمانیت عطا کرے کہ تاروں میں بھی چمک پیدا ہو جائے گی۔ اس بات کے اظہار کے لیے طارق جمیلی نے جس پیرائے کا سہارا لیا ہے وہ بلا شبہ قابل داد ہے۔ لیکن عشق میں اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ حسن کو غرور کے ساتھ عشق کو اپنی وفا کا غرور بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر حسن جھکنا نہیں چاہتا تو عشق بھی سرنگوں ہونا نہیں چاہتا۔ اس کیفیت کا اظہار طارق جمیلی اس طرح کرتے ہیں۔

ہم کو وفا کا پاس تمھیں حسن کا غرور
تم آنہیں سکتے ہو تو ہم جا نہیں سکتے

زندگی میں ملنے والے غم کے کئی اسباب ہوتے ہیں. کبھی معاملات زندگی، مسائل حیات، کبھی معشوق کی بیزاری اور بے وفائی اور کبھی اپنوں اورپرایوں کی طرف سے دی جانے والی چوٹ. طارق جمیلی کے یہاں ہر طرح کے غم پائے جاتے ہیں.

لیکن اس کے باوجود محبوب کا غم شاعر کے لیے صبا کی طرح ہے جو اشکوں کا گل کھلا دیتی ہے۔ اس کا احساس شاعر کو اس وقت ہوتا ہے ہے اس کی پلکوں کے اشک جھلملانے لگتے ہیں۔ غم کو صبا کہنا ایک خوبصورت تشبیہ ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

جب بھی پلکوں پہ گل اشک کھلا دیتے ہیں
ہم ترے غم کو صبا کہہ کے دعا دیتے ہیں

محبوب کا غم اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک وصال نہ ہو۔ گویا جدائی میں یادوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا لیکن کچھ قرار پانے کے لیے عاشق یہ کوشش کرتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے محبوب کی یادوں کو بھلا دے تاکہ چین سے سو سکے اس کے لیے وہ یادوں کو طرح طرح سے بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ طارق جمیلی اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر سوچتے ہیں کہ اگر یادوں کو تھوڑی دیر کے لیے بہلا کر سلا دیں لیکن پچھلے پہر اگر سوئی ہوئی یادوں کا کارواں بیدار ہو گیا تو کیا ہوگا؟ یہ شعر دیکھیں اور شاعر کے تخیل کی داد دیں۔

ہم تو بہلا کے سلا دیں گے تری یادوں کو
کھل گئی آنکھ اگر پچھلے پہر کیا ہوگا

آخر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہجر میں محبوب کی یادوں کا سلسلہ کچھ اس طرح دراز ہوتا ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی۔ لاکھ ضبط کیجیے مگر۔

غم کی انگنائی میں تم ضبط کی چادر اوڑھو
قطرۂ اوس بھی درد جگا دیتے ہیں

طارق جمیلی کے فکر وفن پر گفتگو ایک مضمون میں کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے اس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ان کے کلام سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شرح دل کی بات ہو یا زمانے کی بدلتی اقدار کی بات ہو بڑی خوبی اور فنکاری کے ساتھ انھوں نے اپنے خیالات کو لفظوں کا پیکر عطا کیا ہے۔ ان باتوں سے الگ دوسرے موضوعات پر بھی عمدہ اشعار ان کے یہاں موجود ہیں۔ یہاں صرف دو شعر پیش کرنا چاہوں گا۔ جس سے طارق جمیلی کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں۔

جنھیں دو چار تنکے کہہ رہے ہو
نگاہ برق میں وہ آشیاں ہے

کیوں آئینے پہ رکھتی ہے پوچھو تو ہوا گرد
کیا کوئی حقیقت ہے جسے ڈھانپ رہی ہے

خلاصہ کلام یہ کہ طارق جمیلی نے اپنے کلام میں اپنے اور پرائے کے غم کو اور زمانے کی روش کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس میں کوئی الجھاؤ اور کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صاف گوئی کے ساتھ کہتے ہیں۔ اس صاف گوئی میں شاعرانہ حسن بھی برقرار رہے اس کی کوشش بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ طارق جمیلی اپنے اشعار کے ذریعے قاری پر کوئی رعب طاری نہیں کرنا چاہتے بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں آسان لفظوں میں اسے قاری تک پہنچائیں اور قاری بغیر کسی تردد کے ان کی باتوں کو سمجھ سکے۔

پروفیسر ابواجمل محمد طارق جمیلی کے سینے میں ایک فنکار کا دل دھڑکتاھے. اپنی تدریسی، سماجی انتظامی اور لسانی مصروفیات اور خدمات کے دوران بھی ان میں تخلیق کی چنگاری سلگتی رھی ھے اور وقتاً فوقتاً اس کاالتہاب فن پاروں کی صورت میں جلوہ گر ھوا کرتاھے.

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے یہاں ترسیل کا مسئلہ نہیں پایا جاتا۔ یہی چیز ان کی کامیابی کی بڑی دلیل ہے۔ میں اپنی بات پروفیسر نجم الہدیٰ کے ان الفاظ پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے طارق جمیلی کے شعری مجموعہ 'جذب دروں' کے دیباچے میں لکھے ہیں۔ ان سے طارق جمیلی کے فکر وفن کو سمجھنے میں ہمیں بھرپور مدد ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''پروفیسر ابواجمل محمد طارق جمیلی کے سینے میں ایک فنکار کا دل دھڑکتا ہے۔ اپنی تدریسی، سماجی انتظامی اور لسانی مصروفیات اور خدمات کے دوران بھی ان میں تخلیق کی چنگاری سلگتی رہی ہے اور وقتاً فوقتاً اس کا التہاب فن پاروں کی صورت میں جلوہ گر ہوا کرتا ہے۔ ان کی طبیعت بہت حساس واقع ہوئی ہے جو فن کار ہونے کی شرط اولیں ہے اور یہی سبب ہے کہ گرد و پیش کے مناظر ہوں یا داخلی یا خارجی زندگی کے تجربات وحوادث، قومی مسائل ومصائب ہوں یا بین الاقوامی منظر نامہ، رشتوں کی نزاکتیں اور لطافتیں ہوں یا معاشرے کے نشیب وفراز اور ناہمواریاں اور ہم آہنگیاں اور انفرادی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات ہوں یا اجتماعی زندگی کے بڑے بڑے ہنگامے، ہمارے فن کار طارق جمیلی کی تخلیقات میں ان سب کے اثرات اور جلوے دیکھے جاسکتے ہیں۔'' (جذب دروں، ص 11)

■

Qaseem Akhtar
Asst. Professor
DS College
Katihar - 854105 (Bihar)
(Mob.:9470120116
Email.: qaseemakhtar786@gmail.com

جن کتابوں نے متاثر کیا

ارشاد احمد

ہائی اسکول میں طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اردو کے استاذ عاشق علی سلفی (مرحوم) اقبال ڈے بڑے کروفر کے ساتھ منایا کرتے تھے۔ اقبال ڈے کے دوسیشن ہوتے تھے۔ پہلے سیشن میں اقبال کی شعری و ادبی خدمات پر مقالے پڑھے جاتے تھےاور دوسری نشست میں شعروشاعری کی محفل سجتی تھی۔ دوسرے سیشن میں اساتذہ، طلبہ اور عوام، سبھی شامل ہوتے۔ میں بھی کسی نہ کسی شکل میں اس پروگرام میں شامل ہوتا۔ میرے ایک مقالے پر توصیفی سند بھی گئی۔ یہیں سے میری شخصیت میں ادب کی تخم ریزی ہوئی۔ ہائی اسکول تک میرا ذہن علامہ اقبال کی حب الوطنی اور اصلاحی شاعری تک ہی محدود رہااور نصابی کتابوں میں جو نظمیں اور ترانے شامل تھے وہیں تک مطالعہ رہا۔ حصول تعلیم کے لیے گاؤں سے سیوان شہر میں آیا۔ گرچہ یہ شہر بہت بڑا نہیں تھا لیکن تعلیمی ماحول گاؤں سے بہتر تھا۔ جب کالج میں داخلہ ہوا تو علامہ اقبال کی بانگِ درا اور بالِ جبریل سے میرا سابقہ پڑا۔ جب ان شعری مجموعوں کا مطالعہ شروع ہوا تو میری دنیا بدل گئی۔ علامہ اقبال کی شاعری میں فلسفہ، منطق اور تلمیحات سے پہلی بار روشناس ہوا۔ یوسف سلیم چشتی کی تشریحات اور حاشیہ نویسی نے علامہ اقبال کی ذہنی وفکری سطح کو سمجھنے میں کافی مدد کی۔ علامہ اقبال کو پڑھتے وقت شعری محاسن سے بھی واقفیت ہوئی۔ تشبیہ، استعارہ، مجازِ مرسل، کنایہ، رمز وایما اور تجاہل ِعارفانہ جیسے شعری محاسن کی تفہیم نے اشعار کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی۔ اس ضمن میں ایک دوسری کتاب کا تذکرہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی 'مقدمہ شعروشاعری' کا مطالعہ بھی اسی زمانے میں کیا۔ ہر چند کہ اردو ادب کے ناقدین اس کتاب کو تنقید کی پہلی کتاب سمجھتے ہیں لیکن دراصل یہ کتاب شعروشاعری کے اصول وضوابط، غرض و غایت، شاعروں کی ذہن سازی اور شعری مبادیات پر مبنی ایک کارآمد کتاب ہے۔ اس کتاب نے بھی شعری محاسن، بہترین اشعار کی پہچان اور اشعار کے مقاصد اوران سے مرتب ہونے والے اثرات سے واقفیت کرائی۔ اس طرح میں مولانا کی مدلل بحث، نکتہ رسی، ژرف نگاہی اور اندازِ بیاں کا قائل ہوگیا۔

علامہ اقبال کی شاعری کی بدولت ہی عالمی سطح کے متعدد فلسفیوں، دانشوروں، شاعروں سیاست دانوں اور سائنس دانوں سے روبرو ہونے کا موقع ملا۔ اسلامیات اور تصوف پر علامہ اقبال نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اقبال کی شاعری سے ہی پہلی بار اسلامی تصوف اور غیر اسلامی تصوف میں امتیاز کو سمجھا۔ اس کے بعد ضرب کلیم، اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، جاوید نامہ اور ارمغان حجاز جیسے شعری مجموعے پڑھ ڈالے۔ شرح اسرار خودی میں اسلامی تصوف اور صوفیہ کے عقائد پر تفصیلی بحث نے ذہن کوایک الگ جہان میں پہنچادیا۔

ملا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

ذہن کچھ بالیدہ ہوااور مطالعے میں وسعت آئی تو دنیائے تصوف کے بڑے بڑے مجسمے مشکوک نظر آنے لگے۔ رہی سہی کسر پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی کتاب 'اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش' نے پوری کر دی۔ لاہور (پاکستان) سے شائع شدہ اس کتاب کو میں نے نئی دہلی کے عالمی کتب میلے سے حاصل کیا تھا۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کا پورا قلعہ ہی مسمار ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد تصوف سے پوری طرح بیزار ہو گیا۔ علامہ اقبال کی شعری تلمیحات نے تاریخ اسلام کے مطالعے کی ترغیب دی۔ بی اے (آنرس) کے نصاب میں شامل پروفیسر اسلم جیراجپوری کی 'تاریخ الامت' کی دوجلدوں نے پوری اسلامی تاریخ پڑھنے کی تحریک دی۔ اسکالرشپ کی شکل میں ملے 244 روپئے میں سے 168 روپئے میں تاریخ الامت کی آٹھوں جلدیں مکتبہ جامعہ سے منگوائیں۔ والد بزرگوار سے پیسہ اس لیے نہیں لیا کہ والد محترم دوجلدوں کی جگہ آٹھ جلدوں کا صرفہ فضول خرچی پر محمول کرتے۔ حالانکہ بعد میں یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ والد محترم نے بھی ساری جلدیں پڑھ لیں اور بہت تعریف کی۔ اسرار خودی میں یوسف سلیم چشتی نے بھی ان کے فہم وادراک کی تعریف کی ہے۔ (ص30) میں نے یہ آٹھوں جلدیں ہفتے بھر میں پڑھ ڈالیں۔ مولوی اسلم جیراجپوری کا معروضی انداز، رواں دواں زبان، اختصار میں جامعیت اور سب سے بڑھ کر غیر جانبدارانہ بیان مجھے کافی پسند آیا۔ تاریخ الامت نہ صرف ایک قوم کی منضبط تاریخ ہے بلکہ ایک قوم کے عروج و زوال، علم و حکمت، تہذیب وثقافت اور نظریاتی تصادم کی مکمل داستان ہے۔ بعد میں دیگر حضرات کی لکھی ہوئی اسلامی تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن ان سے متاثر نہیں ہوا۔

کالج کے دنوں میں اردو میں ترقی پسند تحریک سے سابقہ پڑا۔ ادبی رجحانات میں ترقی پسندوں نے مجھے سب سے زیادہ مرعوب اور متاثر کیا۔ مجاز، مخدوم، اور کیفی اعظمی کی شاعری کے بیشتر حصّے مجھے زندگی کے تلخ حقائق کا بیانیہ لگے۔ علی الخصوص مجاز اور کیفی نے صنفِ نازک کے لیے بلند حوصلگی، نفس کی رفعت و پاکیزگی، آہنی کردار کی تشکیل اور ذہنی وفکری بیداری کے لیے جو پیغامات دیے ہیں وہ اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہیں

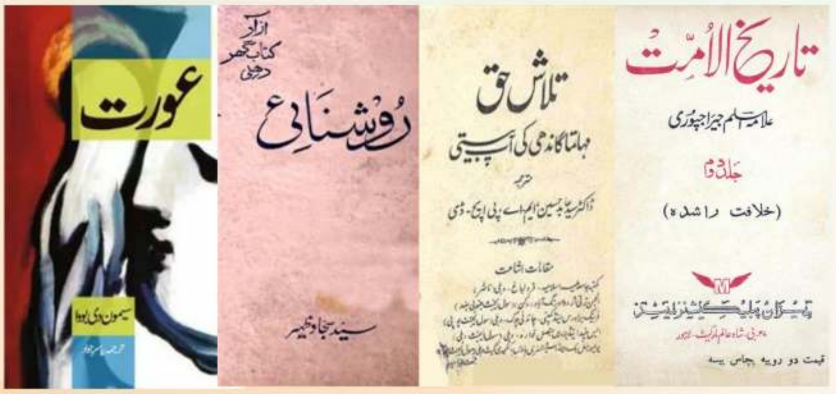

اور میرے لیے متاثر کن بھی۔ کیفیات کی دیگر نظمیں جیسے بیوہ کی خودکشی، بیکاری، سرخ جنت، سپردگی، مکان اور مثنوی خانہ جنگی بھی پسند آئیں۔ ابھی تک مثنویات کے تعلق سے میرے خیالات روایتی، منفی اور دقیانوسی تھے۔

زیست کے آہنی سانچے میں بھی ڈھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

ترقی پسند نثر نگاروں میں منشی پریم چند اور سید سجاد ظہیر نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پریم چند کی شستہ و رفتہ اور با محاورہ زبان، سلاست و روانی، حقیقت پسندی، منظر نگاری اور جذبات نگاری نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔ یکے بعد دیگرے ان کی متعدد تصنیفات کا مطالعہ کر ڈالا۔ لیکن پریم چند کے دو ناول 'میدان عمل' اور 'گئودان' کا کوئی جواب نہیں۔ گئودان اپنے دوست سے عاریتاً لے کر مطالعہ کیا تھا لیکن اس ناول نے اس قدر متاثر کیا کہ کالج کی لائبریری سے جاری کروا کر کے اس کا جرمانہ ادا کیا۔ آج بھی یہ نسخہ میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے جس کی قیمت پانچ روپئے درج ہے۔

سجاد ظہیر نہ صرف ترقی پسند تحریک کے بنیاد گزار ہیں بلکہ منجھے ہوئے نثر نگار بھی ہیں۔ ادبی تاریخ کے عہد بہ عہد تذکرے پر محیط 'روشنائی' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کتاب نے ایک تخلیق کار کی تحریر کے نصب العین کے اصول وضع کیے۔ قید خانے میں تحریر کی گئی اس کتاب کے واقعات اور سرگذشت باہم پیوست و مربوط ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی مخالفت اور اعتراضات کا جواب موصوف نے مدلل اور شائستہ پیرایے میں دیا ہے۔ انھوں نے ہم عصر ادیبوں اور فن کاروں کی شخصیت کی تصویر کشی نہایت پر لطف، پر اثر، دلکش اور حقیقی انداز میں کی ہے۔ تحریر میں دھیما پن، نرمی، مٹھاس اور اپنائیت ہے، جس کی وجہ سے ہر قاری ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب ادبی تاریخ کی سرگذشت ہی نہیں بلکہ ترقی پسند تحریک کی اہم دستاویز ہے۔ آج بھی جب ادب کی غرض و غایت کی روشنی مدھم ہوتی ہے تو اس کا مطالعہ کر لیتا ہوں۔

نثری اصناف میں مجھے خودنوشت سوانح، خاکے، اور سفر نامے خاص طور پر پسند ہیں۔ اس سلسلے میں متعدد کتابوں کا مطالعہ رہا۔ سفر ناموں میں مولوی مہیش پرساد کا سفر نامۂ ایران، مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت اور مہاتما گاندھی کی تلاشِ حق جیسی کتابیں کافی پسند آئیں۔ مولوی مہیش پرساد نے اپنے سفر نامے میں ایران کا جغرافیہ، معدنیات، چرند و پرند، باشندے، آمد و رفت کے ذرائع، مختلف شہروں کے احوال، رسم و رواج، اور خواتین کا تذکرہ بالتفصیل، مؤثر اور پر لطف پیرایے میں کیا ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کثیر الجہات تھی۔ شدت پسند مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے مولانا کی ذہانت، طباعی، حافظہ، ذوقِ علمی اور شوقِ تحصیل علوم کی مثال زبان زدِ عام و خاص تھی۔ مولانا کی خودنوشت مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس میں موصوف نے اپنے ذہنی و فکری سفر، والد کی مذہبی مخاصمت، ہم عہد اکابرین سے ملاقات کی روداد اور اپنی علمی و شعری خدمات کا تذکرہ بے باکانہ انداز اور عالمانہ پیرایے میں کیا ہے۔ تصوف کے متعلق موصوف کے خیالات قران حکیم اور سنت نبویؐ کی تعلیمات کے موافق ہیں۔ والد کی خواہش کے خلاف صوفی نہ بن کر عالم، صحافی، مفکر، متعدد کتابوں کے مصنف اور عالمی شہرت یافتہ سیاست داں بن گئے۔ یہ آپ کی اختراعی طبع، انقلابی فکر اور بلند حوصلے کی دلیل ہے۔ تلاشِ حق میں مہاتما گاندھی نے اپنی ابتدائی نصف زندگی کی روداد تحریر کی ہے۔ یہ کتاب اس لیے متاثر کن ہے کہ اس میں گاندھی جی نے اپنی کامیابیوں، ناکامیوں اور بدنامیوں کو من و عن بیان کر دیا ہے۔ اس کتاب نے پہلی بار مجھے ولایت اور جنوبی افریقہ کی حکمراں قوم کے کریہہ چہرے سے واقف کروایا۔ گاندھی جی نے حق گوئی، عدم تشدد اور ستیہ گرہ کا جو راستہ دکھایا اس سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔ آپ نے اپنے رفیقِ کار اشخاص کا تذکرہ بڑی اپنائیت، محبت اور خلوص سے کیا ہے۔ یہ تحریر حقیقت کی آئینہ دار ہے اور اس میں غلو اور خودنمائی کا شائبہ نہیں ہے۔ اس کتاب کو بار بار پڑھنے کا دل کرتا ہے۔

اپنے مطالعاتی سفر میں چند اسمائے گرامی کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ پی ایچ، ڈی کے سلسلے میں استاذ گرامی ڈاکٹر محمد عطاء الرحمٰن (ریٹائرڈ پروفیسر ایل ایس کالج، مظفر پور) سے شناسائی ہوئی۔ موصوف نے نہ صرف ایک سلیقہ مند گائیڈ کا کام کیا بلکہ مجھے کتب بینی کی طرف مائل بھی کیا۔ آپ نے اپنی ذاتی لائبریری سے کئی اہم، مفید اور کار آمد کتابیں عنایت کیں، جن کے مطالعے سے میری ادبی جانکاری میں قدرے وسعت آئی۔ آج بھی آپ کی نوازشیں برقرار ہیں۔ سیوان میں چند قدموں کے فاصلے پر مقیم محبی ڈاکٹر ظفر کمالی (پروفیسر شعبۂ فارسی، ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج، سیوان) واقعی کمال کے آدمی ہیں۔ ممدوح کی محبتیں اور شفقتیں اس ناچیز پر قائم و دائم ہیں۔ آپ کی ذاتی لائبریری کسی بڑے ادارے کے کتب خانے سے کم نہیں۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت اور نسائی تحریک پر مبنی متعدد کتابیں میں نے موصوف سے عاریتاً لے کر پڑھیں۔ سیمون دی بوار کی ضخیم تصنیف ''عورت'' محترم کمالی صاحب سے لے کر مطالعہ کیا اور متاثر بھی ہوا۔ موصوف نے اپنے کتابی ذخیرے سے یادوں کا جشن، جو یاد رہا، بیتے ہوئے دن اور حال میں ہی طبع شدہ ڈاکٹر صفدر امام قادری کے خاکوں کا مجموعہ 'جانے پہچانے لوگ' دیں جو مجھے کافی پسند آئیں۔ عزیز دوست پروفیسر سراج نادر (مونگیر یونیورسیٹی مونگیر سے وابستہ) قادرالکلام شاعر اور اردو ادب کے سلجھے ہوئے قاری ہیں۔ آپ جب بھی کوئی پسندیدہ کتاب خریدتے ہیں تو ایک عدد میرے لیے بھی لے لیتے ہیں۔ آپ کے مطالعے میں جب کوئی دلچسپ اور معلوماتی کتاب آتی ہے تو مجھ سے پڑھوانے کے لیے بیقرار ہو جاتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے کے بعد ان پر رائے زنی کرنا، تاثر بیان کرنا اور صحت مند تنقید کرنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ آپ کی تنقیدی بصیرت صاف ستھری ہے۔ ذہنی و فکری طور پر ہم دونوں تقریباً ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے کسی بھی کتاب کے متن، اسلوب، افادیت اور ادب میں اس کے مقام و مرتبے پر گھنٹوں بحث ہوتی ہے۔ بات جب اختلاف تک پہنچتی ہے تو موصوف خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ ادا مجھے بے حد پسند ہے۔ یادوں کی برات، اس آباد خرابے میں، ورودِ مسعود، ہم نے دیکھا استنبول اور چلتے تو اچھا تھا جیسی خودنوشت اور سفر نامے پروفیسر نادر کی وجہ سے ہی میری لائبریری کی زینت بنے اور مطالعے میں آئے جن سے بہت متاثر ہوا۔ کتابوں کی تلاش و جستجو اور مطالعے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

■

Dr. Irshad Ahmad
1731, Aamna Manzil, Islamia Nagar
Seewan - 841226 (Bihar), Mob.:9431644722
E-mail.: drirshadahmad05@gmail.com

اردو صحافت اور کالم نگاری

مہتاب امروہوی

جہاں اردو صحافت نے جنگ آزادی میں ناقابل فراموش اہم کردار ادا کیا وہاں دوسری جانب اردو ادب کی مختلف اصناف کے فروغ میں بھی اپنی سرگرمی کو تاہنوز جاری رکھا ہے۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ صحافت کی مشہور اصناف کو آج بھی ادب کے اس حصے میں شامل نہیں کیا گیا جس کا اسے استحقاق ہے۔

اردو ادب کی ہر صنف کی تعمیم میں صحافت نے مرکزی رول نبھایا، خاص طور پر افسانہ، داستان، غزل، ڈراما، سفرنامہ وغیرہ کو بذریعہ اخبارات ورسائل عام قاری تک پہنچایا گیا اور ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا گیا۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جتنا تحقیقی کام افسانہ، غزل، ڈراما اور سفرنامہ پر ہوا اس کا دسواں حصہ بھی فنِ صحافت کی کسی بھی صنف کو نہیں ملا۔ اسے اردو ادب سے باہر کی چیز تصور کیا۔

یوں تو پوری اردو صحافت پر تحقیقی اور معلوماتی کام آج بھی تشنہ ہے بالخصوص اخبار کے داخلی مواد سے متعلق بنیادی کام کو صنفی اعتبار سے اگر تقسیم کیا جائے تو اس میں خبر، اداریہ، شذرہ، انٹرویو، آرٹیکل، انشائیہ، خاکہ، رپورتاژ اور کالم نگاری وغیرہ جیسی تمام صحافتی اصناف آتی ہیں جن کے بارے میں صحافتی لحاظ سے ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ یوں کہنے کو انشائیہ اور خاکے پر اردو میں کچھ حد تک لکھا گیا ہے لیکن وہ ادبی اعتبار سے تحریر کیا گیا ہے، یعنی جن لوگوں نے بھی انشائیہ یا خاکے پر لکھا ہے انھوں نے ان دونوں چیزوں کو ادبی نثر کی نیم ادبی صنف تسلیم کرتے ہوئے اس کو سب سے کمتر قرار دیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ صحافتی تناظر میں لکھنے کی کوشش کسی نے بھی نہیں کی۔ ان اخبار نویسوں اور صحافیوں نے بھی نہیں جن کو حقیقت میں یہ کام کرنا چاہیے تھا اور شاید وہی زیادہ بہتر طور پر اخباری اصناف پر لکھ بھی سکتے تھے۔

ادب اور صحافت میں اتنا قریبی رشتہ ہونے کے بلوجود جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اخباری انشائیہ نگاری، اخباری خاکہ نگاری، اخباری انٹر ویو اور کالم نگاری وغیرہ پر اگر کچھ پڑھنا چاہیں تو کچھ ہاتھ نہیں آتا جبکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو اخباروں کے وقار اور شان کو بڑھانے میں کالم نگاری اور کالم نگاروں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

ادب اور صحافت میں اتنا قریبی رشتہ ہونے کے باوجود جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اخباری انشائیہ نگاری، اخباری خاکہ نگاری، اخباری انٹرویو اور کالم نگاری وغیرہ پر اگر کچھ پڑھنا چاہیں تو کچھ ہاتھ نہیں آتا جبکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو اخباروں کے وقار اور شان کو بڑھانے میں کالم نگاری اور کالم نگاروں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ کالم نگار ہی ہیں جن کے دم سے آج بھی اردو اخباروں کا بھرم قائم ہے۔ ورنہ وسائل کی کمی کے سبب اردو اخبار خالص اخباری شعبوں میں دوسری زبانوں کے اخباروں سے بہت پیچھے ہیں۔ وہ تو کہیے کہ اردو کے ادبی صحافیوں نے اپنے انٹرویوز، انشائیوں اور کالم نگاری سے اردو اخباروں کی لاج بچا رکھی ہے، ورنہ صرف خبروں کے لیے اردو اخباروں کو کوئی خریدنا بھی پسند نہیں کرتا۔

ہمارا موضوع چونکہ کالم نگاری ہے اس لیے ہماری کوشش یہی ہوگی کہ ہم کالم نگاری کی صنفی نوعیت، کالم نگاری کے مقصد، کالم نگاری کی خصوصیات، کالم نگاری کے آداب واصول پر روشنی ڈال سکیں۔ لیکن قبل اس کے کہ کالم نگاری پر اظہار خیال کیا جائے یہ مناسب ہوگا کہ انشائیہ، خاکہ نگاری اور رپورتاژ کے بارے میں بھی مختصراً کچھ اظہار خیال کر دیا جائے تاکہ کالم نگاری ان دیگر اصناف صحافت سے متمیز نظر آئے۔

خاکہ نگاری: اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے اور صحافتی خاکہ نگاری تو بہت ہی نوخیز ہے۔ انگریزی میں خاکہ نگاری کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں، اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز غیر صحافتی انداز یعنی ادب میں ہوا۔ جن ادیبوں نے خاکے لکھے وہ اخباروں سے متعلق نہ تھے۔ محمد حسین آزاد کو اردو کا پہلا خاکہ نگار کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے آب حیات میں کچھ شاعروں کے بہت ہی حسین اور دلکش خاکے لکھے ہیں مگر باضابطہ طور پر اگر کسی خاکہ نگار کا نام لیا جاسکتا ہے تو شاید وہ مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی وحید الدین سلیم کے جو خاکے لکھے ہیں وہ اردو خاکہ نگاری کا آغاز ہی نہیں بلکہ خاکہ نگاری کے اعلیٰ ترین نمونے کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

خاکہ نگاری کو کچھ لوگ شخصیت نگاری سے بھی تعبیر

اردو خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کی ایک اور شکل جس نے ہمارے زمانے میں خاصا رواج پایا ہے، کالم نویسی کی روایت میں دکھائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ نہایت پر کشش مثالیں انتظار حسین اور خامہ بگوش کے ادبی کالموں میں ملتی ہیں۔

کرتے ہیں کہ خاکہ کسی فرد واحد کی شخصیت کی قلمی تصویر ہوتی ہے۔

آزادی سے پہلے جن خاکہ نگاروں نے اس میدان میں اپنی شناخت بنائی تھی ان میں فرحت اللہ بیگ کے علاوہ خواجہ حسن ثانی نظامی، شاہد احمد دہلوی، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، سردار دیوان سنگھ مفتون وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنگ آزادی کے دور میں یا بعد میں جن خاکہ نگاروں نے شہرت حاصل کی ان میں سعادت حسن منٹو، مالک رام، عصمت چغتائی، شورش کاشمیری، انتظار حسین، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی کا نام آتا ہے۔ مندرجہ بالا خاکہ نگاروں میں خواجہ حسن ثانی نظامی دیوان سنگھ مفتون، شاہد احمد دہلوی، عصمت چغتائی اور فکر تونسوی تو باقاعدہ اخبارات سے وابستہ رہے ہیں اور باقی لوگوں نے اپنا خاکہ نگاری سے اردو رسائل کو رونق بخشی۔ صحافتی خاکہ نگاری عام خاکہ نگاری سے تھوڑی سی مختلف ہوتی ہے۔ ایک صحافی جب خاکہ لکھتا ہے تو اپنے خاکے کے لیے بالعموم کسی سیاسی یا سماجی شخصیت کا انتخاب کرتا ہے کیونکہ سیاست اور سماج ہی اس کا مخصوص میدان ہوتا ہے۔ کوئی سیاسی لیڈر یا کوئی ایسا رہنما جس کی شخصیت میں خاکہ نگار کو ایسے عناصر نظر آئیں جو سیاست اور سماج کے لیے نقصان رساں یا سودمند ہوں تو وہ اس لیڈر یا اس رہنما کے ان ہی پہلوؤں کی ایک دلچسپ انداز میں قلمی تصویر کھینچتا ہے۔

کبھی کبھی خاکہ نگاری کی حدیں کالم نویسی سے بھی مل جاتی ہیں یا یوں کہیے کہ کالم نگاری میں خاکہ نگاری کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے۔ یعنی کالم نگار اپنے کالم کے لیے سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی یا علمی شخصیت پر جب لکھتا ہے تو اس کے کالم میں وہ شخصیت اتفاق سے اس طرح ابھرتی چلی جاتی ہے کہ کالم نگاری میں خاکہ نگاری کے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ایسی کالم نگاری کی مثال دیتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے لکھا ہے:

''اردو خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کی ایک اور شکل جس نے ہمارے زمانے میں خاصا رواج پایا ہے، کالم نویسی کی روایت میں دکھائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ نہایت پر کشش مثالیں انتظار حسین اور خامہ بگوش کے ادبی کالموں میں ملتی ہیں۔''

(از پروفیسر شمیم حنفی: آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، اردو اکادمی دہلی، اشاعت دوم 1992، ص 18-17)

انشائیہ نگاری: بیسویں صدی نے اردو صحافت کو جہاں اور چیزیں دیں ان میں سے ایک چیز انشائیہ بھی ہے۔ انشائیہ کو اب سے پہلے صنف نثر کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ صنف نثر تو نقاد اب بھی نہیں مانتے لیکن یہ اس طرز تحریر کی خوش قسمتی ہے کہ بیسویں صدی میں نقادوں نے اسے کم از کم ایک عدد نام تو عطا کر دیا یعنی نثر کے خاص پیرایہ بیان کو انشائیہ کہا جانے لگا۔ انشائیہ کو یہ نام عطا کرنے میں صحافت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اردو نقادوں نے اس نثری تحریر کو یہ نام شاید اس لیے عطا کیا کہ اردو کے انشائیہ نگاروں (اگر نقاد انھیں انشائیہ نگار مان لیں) میں زیادہ تر صحافی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر ڈاکٹر وزیر آغا تک جو نام ہمیں نظر آتے ہیں ان میں بہت سے لوگ کسی نہ کسی حیثیت میں اخبار و رسائل سے منسوب رہے ہیں۔ لہٰذا اردو نقادوں نے ان صحافی ادیبوں کی تحریروں سے ادب کو ممتاز کرنے کے لیے انھیں انشائیہ کا نام دے دیا۔ نقادوں کا یہ رویہ ایک طرح سے ادب کی پاکیزگی اور خالصیت کو برقرار رکھنے کی خواہش ہے۔ اردو کے نامور نقاد کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ انشائیہ وہی صنف ہے جو انگریزی میں (Essay) کہلاتی ہے اور جس کے بارے میں ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا:

"The Essay is a loose sally of mind"

رپورتاژ نگاری: رپورتاژ نگاری بھی صحافت اور ادب کے بین بین ایک چیز (صنف) ہے۔ یہ نیم صحافتی اور نیم ادبی قسم کی اصناف میں شمار ہوتی ہے۔ اس صنف کی ماضی میں جڑیں زیادہ دور تک نہیں ملتی ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری یا چوتھی دہائی میں اس صنف کا آغاز ہوا، البتہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ رپورتاژ نگاری یوروپ سے ہماری زبان اردو میں آئی اور یوروپ کے لیے یہ فرانس کے ادیب صحافیوں کی دین ہے۔ رپورتاژ فرنچ لفظ ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے Reporting یا Report آتا ہے لیکن جب یہی چیز رفتہ رفتہ صحافت اور ادب کے امتزاج سے مستقل طور پر اخباروں کے کالموں کی زینت بننے لگی تو اس صنف کا نام صحافتی زبان میں بطور اصطلاح رپورتاژ ہی پڑ گیا۔ رپورتاژ کیا ہوتی ہے؟ اور اس کا دائرۂ کار (موضوع) کیا ہے؟ اس کے بارے میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اپنے ایک مضمون میں کچھ اس طرح لکھا ہے:

''رپورتاژ عموماً ایسے واقعات پر مبنی ہوتا ہے جس سے ایک خاص طبقے کے بجائے انفرادی شعور کا ایسا کارنامہ ہو جو پھیلی ہوئی شکل میں عمومیت کا درجہ رکھتا ہو۔''

(از ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ نئے ادبی رجحانات، کتابستان الہ آباد، اشاعت پنجم مئی 1957، ص 39)

انٹرویو نگاری: انٹرویو اردو صحافت کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہر چند کہ انٹرویو نگاری کا جو باضابطہ مفہوم اب ہے وہ پہلے نہیں تھا اور نہ انٹرویو اتنے سائنٹفک انداز سے لیے جاتے تھے۔ انٹرویو دراصل اس بالمشافہ گفتگو یا مکالمے کو کہتے ہیں جو انٹرویو لینے والے اور دینے والے کے درمیان سوال و جواب کی صورت میں ہوتا ہے۔ اردو زبان کے بہت سے اخبارات و رسائل نے سیاست، ادب، مذہب، سماج، علم تعلیم اور کھیل کے میدانوں میں ایسے اشخاص کو منتخب کیا جنھوں نے مذکورہ شعبۂ ہائے زندگی میں کسی ایک میں ناموری اور شہرت حاصل کی۔

رپورتاژ عموماً ایسے واقعات پر مبنی ہوتا ہے جس سے ایک خاص طبقے کے بجائے انفرادی شعور کا ایسا کارنامہ ہو جو پھیلی ہوئی شکل میں عمومیت کا درجہ رکھتا ہو۔

انٹرویو نگاری بھی ان ہی اصناف میں شامل ہے جس کو نہ ادب میں جگہ ملی اور نہ صحافت میں کوئی معزز مقام مل سکا۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو انٹرویو کے لیے سلیقے کے ساتھ ساتھ بہت ذہانت، دیانت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ انٹرویو چونکہ حالات و مسائل حاضرہ سے متعلق ہی لیے جاتے ہیں اس لیے انٹرویو لینے والے اور دینے والے کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ تیز اور معلومات Current ہونی چاہیے۔ انٹرویو لینے والا اگر ذہین اور تیز ہے تو سامنے موجود شخصیت سے ہر وہ بات اگلوا سکتا ہے جس کی اسے ضرورت ہے ورنہ بصورت دیگر عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ انٹرویو لینے والا کسی تیز چرب زبان اور تجربہ کار شخصیت کے سامنے خود کو بے بس اور مجبور محسوس کرنے لگتا ہے۔

کالم نگاری: اردو صحافت کی تاریخ میں کالم نگاری

کی روایت کا سراغ ہمیں بہت دور تک ملتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ماضی میں کالم نگاری اپنے رنگ ڈھنگ اور ماضی کے اعتبار سے اپنی کوئی مستقل شناخت قائم نہیں کر پائی تھی جیسی موجودہ کالم نگاری نے قائم کی ہے۔ دراصل یہ شئے ابتدا میں اپنے ناتراشیدہ خد وخال کے ساتھ جنم لیتی ہے یعنی اپنے انگھڑ روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس کا نام اس کے معنی ومفہوم کا تعین بعد کو ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وہ چیزیں Develop ہوتی رہتی ہیں، سنورتی رہتی ہیں اور اپنے ابتدائی روپ کو چھوڑ کر مکمل نقش و نگار کے ساتھ سامنے آتی ہیں تب ہی ہم اس کے معنی ومفہوم کا تعین کرتے ہیں اس کا مقصد بیان کرتے ہیں اور اس کے لیے اصول وقواعد مرتب کرتے ہیں پھر اس کی تعریف متعین کر کے اس کا ایک نام بھی رکھ لیتے ہیں، اس طرح وہ نام ایک اصطلاح کا درجہ اختیار کر کے رائج ہو جاتا ہے۔ سماجی زندگی کے ہر شعبے میں یہ عمل ہوتا رہا ہے۔ علم وادب کی دنیا میں بس یہی ہوتا رہا ہے۔ مختلف علوم کی جن اصطلاحوں کو آج ہم بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور سنتے ہیں ان کے معنی ومفہوم سے بھی آشنا ہو جاتے ہیں یہ اصطلاحیں اپنے آغاز یا ابتدائی دور میں بے نام اور بنا معنی ومفہوم کے تھیں۔

آج ہم قومیت، سیکولرزم، جمہوریت اور مساوات وغیرہ کی اصطلاحیں بے تکلفی سے تحریر وتقریر میں استعمال کرتے ہیں، ان کے معنی ومفہوم سے بھی آگاہ ہیں۔ آج جب جمہوریت بولتے ہیں تو جمہوریت کا لفظ اپنے موجودہ مفہوم وخصائص کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور پھر ہم جمہوریت کی تلاش میں روم و یونان تک پہنچ کر موجودہ جمہوریت کے ڈانڈے قدیم رومن اور یونانی جمہوریتوں سے ملا دیتے ہیں حالانکہ قدیم یونانی جمہوریتوں اور موجودہ جمہوریتوں کے تصور میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ کالم نگاری نے ایک طویل مدت کی تراش خراش کے بعد اپنی موجودہ شکل وصورت اور رنگ روپ حاصل کیا ہے اور اب کہیں بیسویں صدی میں جا کر اپنی الگ شناخت قائم کر پائی ہے وہ بھی اس وجہ سے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی پریس کی دنیا میں نہایت تیز رفتاری سے تبدیلیاں آرہی تھیں۔ وہ تبدیلیاں صرف Technological field اور خبروں کے حصول وترسیل تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ اخبار میں چھپنے والے مواد سے بھی متعلق تھیں۔ بیسویں صدی میں اخباروں بالخصوص اردو اخباروں اور رسائل کے اندرونی مواد کی نئے سرے سے ترتیب وتزئین سے متعلق تھیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بیسویں صدی میں پریس

اردو صحافت اور ہندوستانی مسلم تہذیب میں اخبار اور اس کے متعلقات کو ایک رومانی حیثیت حاصل رہی ہے۔ صحافت کو ایک طرح سے عبادت سمجھا جاتا رہا ہے۔ صحافت کا یہ تصور عام کرنے میں 'الہلال'، 'البلاغ' اور 'ہمدرد' جیسے اخبارات اس طرح پیش پیش رہے ہیں کہ اخبارات کا تجارتی او ر معاشی پہلو پس پشت پڑ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری صنعتوں کی طرح اخبار بھی ایک صنعت ہے۔ جس طرح دوسرے کاروباروں کو نفع بخش بنانے کے لیے کاروباری ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اخبار کو منفعت بخش بنانے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے بھی کاروباری ہنر مندی درکار ہے۔

اپنے Commercial age میں داخل ہو چکا تھا اور صحافت profession میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تجارتی مقابلے نے اخباروں کو مجبور کیا کہ مانگ اور کھپت میں اضافہ ہو۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اخبار اب صرف ملکی اور عالمی واقعات وحادثات سے باخبر ہونے کے لیے نہیں خریدا جاتا تھا ان چیزوں کی آگاہی کے لیے میڈیا کا ایک اور الیکٹرانک شعبہ یعنی ریڈیو میدان میں آگیا تھا۔ اخبار میں قاری اب اپنی دلچسپی کے دوسرے سامان تلاش کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں ہمارے بات کی تائید اوصاف احمد کے اس مضمون سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے آواز کے مشہور صحافی جمیل مہدی کے بارے میں لکھا ہے۔ اردو اخباری دنیا کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے لکھا:

''اردو صحافت اور ہندوستانی مسلم تہذیب میں اخبار اور اس کے متعلقات کو ایک رومانی حیثیت حاصل رہی ہے۔ صحافت کو ایک طرح سے عبادت سمجھا جاتا رہا ہے۔ صحافت کا یہ تصور عام کرنے میں 'الہلال'، 'البلاغ' اور 'ہمدرد' جیسے اخبارات اس طرح پیش پیش رہے ہیں کہ اخبارات کا تجارتی او ر معاشی پہلو پس پشت پڑ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری صنعتوں کی طرح اخبار بھی ایک صنعت ہے۔ جس طرح دوسرے کاروباروں کو نفع بخش بنانے کے لیے کاروباری ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اخبار کو منفعت بخش بنانے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے بھی کاروباری ہنرمندی درکار ہے۔''

(از اوصاف احمد 'جمیل مہدی کچھ باتیں کچھ یادیں' مطبوعہ ماہنامہ کتاب نما مکتبہ جامعہ نئی دہلی فروری 1996، ص 63)

لہٰذا اردو اخبار بھی اس تجارتی دوڑ میں شامل ہو گئے تو انھوں نے اخباروں کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور قاری کی حسب منشا بنانے کے لیے اخباری مواد میں بہت سے نئے گوشے اور شوشے پیدا کر دیے یہ نئے گوشے صحافت کی ان اصناف پر مشتمل تھے جن کو ہم انٹرویو نگاری، خاکہ، انشائیہ، رپورتاژ، جدید فیچر نویسی، مزاحیہ شاعری کے کالم، کارٹون، طنزیہ مزاحیہ نثری کالم کے نام سے جانتے ہیں۔ اردو اخباری دنیا میں ہونے والی اس تبدیلی کی طرف ڈاکٹر قیصر شمیم نے بھی اپنے ایک مضمون میں اشارہ کیا ہے:

''جب اردو اخبارات و جرائد نے صحافت کے جدید اصولوں کو اپنا کر ایک نئے دور میں قدم رکھا تو انیسویں صدی کے اواخر تک فیچر نویسی، اداریہ اور مختلف قسم کے سنجیدہ علمی اور مزاحیہ کالم نویسی نے جنم لیا۔''

(از ڈاکٹر قیصر شمیم 'اردو ادب کے فروغ میں صحافت کا حصہ' مطبوعہ ماہنامہ کتاب نما مکتبہ جامعہ نئی دہلی، مارچ 1998، ص 22)

بیسویں صدی کی صحافت میں مندرجہ بالا جو اصناف داخل ہوئیں ان میں سے کچھ کے دھندلے سے نقوش ہمیں ماضی کی اردو صحافت میں ملتے ہیں۔ ان تمام اصناف میں مزاحیہ کالم نگاری کو جو اہمیت، امتیاز اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسری اخباری صنف کو حاصل نہ ہو سکی۔ اصلیت تو یہ ہے کہ کالم نگاری اردو صحافت کی دنیا میں انقلابی تبدیلی کا باعث بنی اور اس نے اخبارات کو نہ صرف ادبی وقار عطا کیا بلکہ ان کو نئی دلکشی اور دلچسپی سے بھی روشناس کرایا۔

مندرجہ بالا بحث کے تناظر میں ہم یہ بانگ دہل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب کے فروغ میں صحافت کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے لیکن صحافت کی اصناف کو وہ مقبولیت میسر نہ آسکی جس کی وہ مستحق ہیں۔ اب یہ ذمہ داری ان ادبی صحافیوں کی ہے جو اخبارات کے ذریعہ ہی مقبول اور مشہور ہوئے کہ وہ اس اصناف کے فروغ کے لیے کوششیں کریں اور صحافت کو اردو ادب کا ہی ایک اہم حصہ باور کرائیں۔

اس امر کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ تمام ادبی حلقوں کی جانب سے موثر مشترکہ تحریک چلائی جائے اور آنے والی نسل کے لیے ایک ایسا میدان ہموار کیا جائے جہاں شعبۂ نثر میں اردو صحافت کو بھی ایک اہم اور ضروری حصہ تصور کیا جائے۔

■

Dr. Mehtab Amrohvi
Head, Dept of Journalism
Nayab Abbasi Degree (PG)College
Kailsa Road, Amroha224221 (UP)
Mob.:9412512750

مولانا عبدالغنی عزیزی اور رسالہ 'کرن' (گیا)

ساجد ذکی فہمی

صحافت ایک ایسا فن ہے جسے تجارت اور خدمت دونوں مقاصد کی حصولیابی کے لیے استعمال کیا گیا۔ کارزار صحافت میں قدم رکھنے والا ایک گروہ ان حضرات کا تھا جنھوں نے اسے بطور معاش اختیار کیا۔ ان کا مقصد دولت کمانا تھا، خواہ اس کا حصول ضمیر بیچ کر ہی کیوں نہ ہو۔ اسی فہرست میں چند اہل قلم اور محب قوم ایسے بھی تھے جنھوں نے قومی و ملی خدمات کے پیش نظر اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ مولانا عبدالغنی کا شمار ایسے ہی صحافیوں میں ہوتا ہے جن کے پیش نظر تجارت نہیں مقصد تھا، زراندوزی نہیں قومی خدمت کا جذبہ تھا۔ نامساعد حالات، پیسے کی قلت، اپنوں کی بے رخی اور عدم مصروفیت کے باوجود انھوں نے اپنے ناتواں کاندھے پر اس بوجھ یعنی قوم کی خدمت کا بیڑا اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

مولانا عبدالغنی کی پیدائش 1930 میں ضلع مونگیر کے شہر شیخ پورہ میں ہوئی۔ ان کے والد عبدالوحید اپنے وقت کے ایک روشن خیال اور پڑھے لکھے شخص تھے۔ فارسی زبان پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔ ان کے نعتیہ کلام ان کی فارسی دانی پر دال ہیں۔ مولانا عبدالغنی کے والد عبدالوحید کا انتقال 28/جولائی 1950 کو شیخ پورہ میں ہوا اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ والد کے انتقال کے تقریباً دو سال بعد یعنی 1952 میں والدہ کریم النسا نے بھی اس دار فانی کو خیر باد کہا اور اس طرح عنفوان شباب میں ہی والدین کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔

مولانا عبدالغنی نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر شیخ پورہ میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے بہار شریف میں واقع مدرسہ عزیزیہ کا رخ کیا۔ یہاں سے انھوں نے وسطانیہ، فوقانیہ، مولوی، عالمیت اور فضیلت کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ دوران تعلیم درسی کے علاوہ کثیر تعداد میں غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اساتذہ کا احترام، بزرگوں کی عزت، عزیزوں پر شفقت، مطالعے کا شوق، غور و فکر کی عادت اور دینی و اصلاحی کاموں میں ہمہ وقت مشغول رہنے کی وجہ سے ان کی شہرت شیخ پورہ سے نکل کر ملک کے دوسرے حصوں تک پہنچنے لگی۔ بعض واقعات تو ایسے پیش آئے جسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا عبدالغنی کوئی صوفی یا ولی اللہ تھے۔

رسالہ 'کرن' کے اجرا سے قبل مولانا عبدالغنی کے کئی مضامین زمانۂ طالب علمی میں ہی مدرسے سے نکلنے والے قلمی رسائل 'کمال' اور 'فروغ' میں شائع ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے اندر شعرگوئی کا مادہ بھی موجود تھا، جو شاید والد سے ورثے میں ملا تھا۔ اپنے استاذ سعید صاحب جن سے انھیں حد درجہ انسیت تھی، کی وفات پر ایک طویل مرثیہ پڑھا جو بعد میں مدرسے کے قلمی پرچے میں بھی شائع کیا گیا۔ مدرسے کے ان قلمی پرچوں میں مسلسل شائع ہونے کی وجہ سے ان کی تحریر رواں اور سلیس ہوتی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے دل میں ایک ماہنامہ نکالنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مولانا عبدالغنی نے اپنے اس خواب کی تعبیر کے لیے دوستوں، رشتے داروں اور اعزا و اقارب سے ملاقاتیں کیں۔ گفت و شنید کے ذریعے انھیں رسالے کی معاونت کے لیے راضی کیا اور بالآخر رسالے کا اجرا عمل میں آیا۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے لیے انھیں کس قدر اذیت اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اس کی تفصیلات آئندہ صفحات میں بیان کی جائیں گی۔

ماہنامہ رسالہ 'کرن' کا پہلا شمارہ صوبہ بہار کے شہر گیا سے دسمبر 1949 مطابق صفر المظفر 1369ھ میں منظر عام پر آیا۔ آزادی کے بعد کا یہ دور اس قدر پر فتن اور انتشار زدہ تھا کہ یکسوئی کے ساتھ کسی علمی و ادبی کام انجام دینا نہایت مشکل امر تھا۔

ایک اردو ماہنامے کی اشاعت کا خیال مولانا عبدالغنی کے ذہن میں اس وقت آیا جب وہ اپنے ایک قدیم کرم فرما فاروق الحسینی سے دوران ملاقات مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ بالآخر کچھ ردو کد کے بعد یہ طے پایا کہ رسالہ ضرور شائع کیا جائے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا عبدالغنی اداریے میں لکھتے ہیں:

''...صوبے کے اہل علم اور صاحب ذوق طبقے میں ایک معیاری اردو ماہنامے کی سخت کمی محسوس کی جا رہی ہے اور خصوصیت کے ساتھ زبان کے مسئلے میں حکومت کی موجودہ پالیسی نے اردو سے ہمدردی رکھنے والوں میں اپنی قومی و ملکی زبان کی بقا اور استحفاظ کا کافی احساس پیدا کر دیا ہے۔ رسالے کے اجرا سے دوسری غرض یہ مدنظر تھی کہ اس کے ذریعے قومی اصلاح کا کام بہ آسانی انجام پاتا رہے گا۔''[1]

رسالے کا لائحۂ عمل تو تیار ہو چکا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ کس طرح رسالے کے اخراجات کا بندوبست کیا جائے۔ اسی اثنا میں جمعیۃ علما ہند کی صوبائی کانفرنس ہزاری باغ میں منعقد ہونے کی خبر موصول ہوئی ساتھ ہی حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کا حکم نامہ پہنچا کہ کانفرنس میں ضرور شرکت کرو۔ مولانا عبدالغنی نے موقعے کو غنیمت جانا اور کانفرنس میں شرکت کے ساتھ مختلف اضلاع کے لوگوں سے رسالے کے متعلق تبادلۂ خیال کیا اور معاونت کی درخواست کی۔ قصہ مختصر جلسے سے واپسی پر ان کا حوصلہ بھی بڑھا اور اخراجات کے تئیں کسی قدر قلبی سکون بھی میسر ہوا۔ شہر واپسی پر انھوں نے رسالے سے متعلق چند ضروری کارروائیاں انجام دیں۔ مضامین و

مقالات کی حصولیابی کے لیے سیکڑوں خطوط مشاہیر اہل قلم کو روانہ کیے۔ غرض کہ سارے کام نہایت تندہی سے انجام پا رہے تھے۔ مولانا عبدالغنی کو شاید اس بات کا گمان تھا کہ رسالہ جون تک شائع ہو جائے گا، لیکن سرکاری دفاتر کی سست روی اور اپنی بیماری کے سبب اشاعت میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ بہرحال ''کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے'' دسمبر 1949 میں ماہنامہ 'کرن' کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ مولانا عبدالغنی کو رسالے کی اشاعت میں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ پہلے شمارے کے اداریے کو پڑھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''خدا کا شکر ہے کہ شدید انتظار اور اکتا دینے والی تاخیر کے بعد 'کرن' کا پہلا شمارہ مطلع صحافت سے طلوع ہو کر اپنی ضو ریز اور ضیا بار کرنوں سے دنیائے علم و ادب کو جگمگا رہا ہے۔ بلاشبہ آپ کو انتظار کی کٹھن گھڑیوں اور صبر آزما گھاٹیوں سے گزرنا پڑا اور ایسا ہونا ناگزیر تھا کیوں کہ اس سلسلے میں اپنی کوتاہیوں سے زیادہ قدرت کی مصلحتیں کارفرما تھیں۔ ہر چیز اپنے وقت پر ہوتی ہے اور یقیناً کارکنان قضا و قدر نے نومبر ہی کا مہینہ کرن کی پہلی اشاعت کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ادارہ کی مسلسل تگ و دو، لگاتار دوڑ دھوپ اور اپنی انتہائی خواہش کے باوجود نومبر سے پہلے رسالہ شائع نہ ہو سکا۔ جب جب اشاعت کا ارادہ کیا گیا قدرتی اسباب نے قدم تھام لیے۔''[2]

رسالے کی اشاعت پر بسمل سنسہاروی گیاوی جو گیا سے نکلنے والے رسالہ 'سہیل' کے سرپرست تھے، نے ایک نظم کہی۔ نظم کا ایک بند درج ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی پیدا ہوئی ہر شے میں اس آواز سے
ذرہ ذرہ ہوگیا بیدار خواب ناز سے
نیند کے ماتے ہوؤں میں تازگی سی آگئی
خنکیِ بادِ سحر پھر روح کو گرما گئی
محو لطف خواب شیریں تھے ادیب و نکتہ داں
بستروں سے اٹھ کے اب لینے لگے انگڑائیاں
لائق صد آفریں ہیں نوجوانانِ گیا
اک 'کرن' نامی رسالہ مل کے جاری کردیا
یا الٰہی یہ رسالہ ہو جہاں میں کامیاب
نور پھیلائے کرن دنیا میں بن کر آفتاب[3]

یہ رسالہ چالیس صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا، لیکن بعض دفعہ مضامین کی کثرت اور وقت و حالات کے پیش نظر اس کے صفحات معینہ تعداد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ رسالے کی سالانہ قیمت پانچ روپے ایک آنہ، ششماہی دو روپے بارہ آنہ اور فی پرچہ کی قیمت آٹھ آنہ تھی۔ مولانا عبدالغنی ہی چوں کہ اس رسالے کے روح رواں تھے اس لیے ادارت کی ذمے داری انھوں نے خود ہی سنبھالی اور اس طرح سرورق پر مدیر کی حیثیت سے ان کا نام شائع ہونے لگا۔ مولانا عبدالغنی نے چوں کہ مدرسہ عزیزیہ سے فراغت حاصل کی تھی اس لیے نام کے ساتھ ہمیشہ 'عزیزی' کا لاحقہ لگایا کرتے تھے۔ معاونین میں فاروق الحسینی اور قمر رانچوی شامل رہے۔ سرپرست کی حیثیت سے رسالے کے سرورق پر حضرت مولانا رحمت اللہ مدظلہٗ کا نام شائع کیا جاتا تھا۔ جون 1950 کے شمارے سے انجم مانپوری کا نام بطور نگراں رسالے میں شائع ہونے لگا۔ سرورق پر رسالے کا نام اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا ہوتا تھا۔ زمانے کی عام روایت کے مطابق دوسرے شمارے میں رسالے کے نام کی مناسبت سے بسمل سنسہاروی گیاوی کا ایک شعر سرورق کے بجائے فہرست والے صفحے میں سب سے اوپر درج کیا گیا۔

مشتری اس کے ہوں یارب قدردانِ علم و فن
رونق بزم جہاں ہو یہ صحافت کی کرن

'کرن' کے پہلے شمارے میں مندرجہ بالا شعر درج نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ بسمل صاحب نے شعر کہا نہ ہو یا مولانا عبدالغنی عزیزی کو اس وقت یہ خیال ہی نہ رہا ہو کہ پرچے کی مناسبت سے کوئی شعر درج کیا جائے۔ بہرحال واقعہ جو بھی ہو دوسرے شمارے میں مندرجہ بالا شعر شامل کیا گیا۔ یہ شعر دراصل رسالے کا تاریخ مادہ ہے۔ پہلے مصرعے سے 1950 اور دوسرے سے 1369 برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن تیسرے اور چوتھے شمارے میں پھر اس شعر کو حذف کر دیا گیا۔ ماہنامہ رسالہ 'کرن' چوں کہ دسمبر 1949 سے شائع ہونا شروع ہوا تھا اور پہلے مصرعے سے تاریخ 1950 برآمد ہو رہی تھی۔ شاید اسی لیے مصرعے کی خامی کو دیکھتے ہوئے مدیر رسالہ کو شعر کے حذف کیے جانے میں عافیت محسوس ہوئی۔ جب کہ دوسرے مصرعے کے نمبرات ہجری اعتبار سے بالکل درست تھے۔ بہرحال ماہنامہ 'کرن' کے پہلے شمارے میں بسمل سنسہاروی گیاوی ہی کی ایک نظم 'کرن کا خیر مقدم' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اس نظم میں مندرجہ ذیل شعر بھی شامل تھا۔

صبح صادق کا جہاں میں بول بالا ہوگیا
پو پھٹی، دیکھو کرن نکلی، اجالا ہوگیا

راقم الحروف کے مطابق مدیر رسالہ مولانا عبدالغنی یا رسالے کے دیگر معاونین نے متفقہ طور پر رسالے کی مناسبت سے اس شعر کو منتخب کیا اور اس طرح یہ شعر رسالے کے سرورق پر بدستور شائع ہونے لگا۔ بعض شمارے بعد میں ایسے بھی شائع ہوئے جس پر یہ شعر درج نہیں تھا، لیکن مندرجہ بالا شعر کے شائع ہونے کے بعد کوئی دوسرا شعر ماہنامہ 'کرن' کے سرورق پر شائع نہیں ہوا۔

ماہنامہ 'کرن' کے پہلے ہی شمارے میں ادارے کی جانب سے اس کے اصول و ضوابط شائع کیے گئے۔ جو سرورق کے پشت پر 'آئین کرن' کے عنوان سے درج تھے۔ ملاحظہ فرمائیں:

1: کرن میں ہر قسم کے علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، اخلاقی، اصلاحی، معاشی، معاشرتی، تاریخی اور تنقیدی مضامین شائع ہو سکتے ہیں۔
2: اخلاق سوز، بازاری اور فلمی مضامین کی اشاعت نہ ہوگی۔
3: موصولہ مضامین واپس نہیں کیے جائیں گے۔
4: ماہنامہ 'کرن' ہر انگریزی ماہ کے پہلے ہفتے میں شائع ہوا کرے گا۔
5: نمونہ کی فرمائش کے ساتھ آٹھ آنے کا ٹکٹ بھی روانہ کریں۔[4]

پہلے اور دوسرے نکات میں ادارے کی جانب سے یہ واضح کر دیا گیا کہ سوائے مخرب الاخلاق مضامین کے علاوہ دیگر تمام مضامین شائع کیے جاسکتے ہیں۔ چوں کہ رسالے کی اشاعت کا مقصد ہی قوم کی فلاح و بہبود اور اس کی بقا و آبیاری تھی، پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اس سے روگردانی کرتے۔ مولانا عبدالغنی کو کما حقہ اس کا علم تھا کہ اگر رسالے میں بازاری اور فلمی مضامین شائع نہ کیے جائیں گے تو اشتہار کی کمی کی وجہ سے رسالے کا بقا دشوار ہوگا، لیکن اس مرد مجاہد نے مقصد کے پیش نظر رسالے کا سودا نہیں کیا۔ یہاں پہنچ کر ہماری سماعتوں میں مولانا محمد علی جوہر کے وہ الفاظ گونجنے لگتے ہیں جو انھوں نے اپنے اخبار 'ہمدرد' کے متعلق کہا تھا۔ محمد علی جوہر کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں:

1: ہمدرد غریب میں نہ کبھی 'سنسنی خیز' سرخیاں دی گئیں، نہ ایسی خبریں شائع ہونے پائیں جو نوجوانوں کے جذبات کے لیے ہیجان انگیز ہوتیں۔[5]
2: اشتہارات سے بھی اس نے حتی الوسع پرہیز کی۔ شراب اور فحش کتابوں، فحش دواؤں کے اشتہارات تو خیر الگ رہے، سنیما اور تھیٹر کے اشتہارات بھی اس نے کسی اجرت پر نہ چھاپے۔[6]
3: ... بازاریت و ابتذال، فحش و پھکڑ کی نقالی وہ کبھی نہ کر سکا... بگڑے ہوئے ذائقے جس چٹپٹے پن کی

تلاش میں رہتے ہیں، اس جنس سے اس کا دامن ہمیشہ خالی رہا۔[7]

4: معاصرین سے الجھنا 'ہمدرد' نے کبھی اپنا شیوہ نہ بنایا۔[8]

مالی دشواریوں کے باوجود محمد علی جوہر نے کبھی صحافت میں ان اصولوں سے روگردانی نہیں کی۔ اخبار کا بند ہوجانا انھیں منظور تھا لیکن اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی انھیں گوارانہ تھی۔ اس معاملے میں مولانا عبدالغنی کا مطمح نظر عین محمد علی جوہر کے مطابق دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے بھی ابتدا تا آخر اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی نہ کی۔

ماہنامہ 'کرن' میں ذیلی ابواب کے قائم کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا اس لیے تمام مضامین سلسلے وار شائع کیے جاتے تھے۔ البتہ جون و جولائی 1950 کا شمارہ چوں کہ مشترکہ تھا اس لیے شاید مضامین کی کثرت کی وجہ سے ابواب کے تحت مضامین شائع کیے گئے۔ مذکورہ شمارے میں جو ابواب قائم کیے گئے تھے ان میں لمعات، مقالات، منظومات، افسانے، تنقید وتبصرہ اور دینیات شامل تھے۔ اسی طرح نومبر ودسمبر 1950 کا شمارہ بھی مشترکہ شائع کیا گیا تھا۔ اس شمارے میں بھی مختلف ابواب کے تحت تخلیقات پیش کی گئیں۔ اس کے علاوہ ماہنامہ 'کرن' کے تمام شمارے ابواب سے مبرا تھے۔

رسالے کا اداریہ 'لمعات' کے نام سے مولانا عبدالغنی ہی تحریر کیا کرتے تھے۔ بعض مواقع ایسے بھی آئے کہ مولانا کی غیر موجودگی میں اداریے کی ذمہ داری معاونین نے سنبھالی۔ اس رسالے کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس کے آخر میں خبروں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا، جس میں ملک اور بیرون ملک سے متعلق گذشتہ اور آئندہ ہونے والے پروگراموں یا دیگر خبروں کی تفصیلات مختصراً بیان کی جاتی تھیں۔

رسالے میں ادارے کو موصول کردہ خطوط بھی شائع کیے جاتے تھے، لیکن ان خطوط کے لیے کوئی علیحدہ کالم نہیں تھا، بلکہ جب بھی قارئین کی جانب سے ادارے کو کوئی خط موصول ہوتا تو اسے 'مکتوبات گرامی' کے عنوان کے تحت شائع کردیا جاتا۔ رسالے کی کامیابی کے لیے اس زمانے کے جید علما نے مولانا عبدالغنی کو خطوط لکھے اور ان کی اس محنت کو سراہا۔ خطوط لکھنے والوں میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا حفظ الرحمٰن (ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلما ہند)، علامہ سید مناظر احسن گیلانی وغیرہ شامل تھے۔ مثال کے طور پر سید سلیمان ندوی کا خط ملاحظہ فرمائیں جس میں انھوں نے مولانا عبدالغنی کو رسالے کے اجرا پر دلی مبارک باد دیتے ہوئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ لکھتے ہیں:

''مکرم ومحترم!

انالکم اللہ تعالی مقاصدکم...والا نامہ نے شرف کیا۔ مجھے آپ کے مقاصد بہت پسند آئے۔ یہ کام کرنے کا تھا۔ حقیقتاً ادھر سے بہت غفلت برتی گئی۔ آپ اور آپ کی جماعت کی کوشش کو اللہ تعالی بارآور کریں۔ مجھے آپ کے ان کاموں سے پورا اتفاق ہے۔ بلکہ امید اجرا ہے۔ آپ رسالہ مذکور جاری کر کے اپنی برادری کو اس کے بجائے دوسرے مفید اسباب رزق اور تجارت کی طرف متوجہ کریں اللہ تعالی وسائل رزق پیدا فرمائیں گے۔ ان شااللہ تعالی میں دل سے دعا کرتا ہوں۔''[9]

ماہنامہ 'کرن' کی فہرست کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس کا دائرہ کار کتنا وسیع تھا۔ گرچہ یہ رسالہ طویل مدت تک جاری نہ رہ سکا، لیکن اپنی مختصر زندگی میں اس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو صحافت کے باب میں زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس رسالے میں ادبی ومذہبی مضامین، غزلیں، نظمیں، کہانیاں، افسانے، وفیات، تبصرے، خبریں، جماعت العراقین کی سرگرمیوں کی تفصیلات وغیرہ شائع کی جاتی تھیں۔

ایک بات جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ مولانا عبدالغنی کا تعلق عراقی برادری سے تھا اور یہ برادری عرصہ دراز سے شراب کے کاروبار میں ملوث تھی۔ خود ان کے والد بھاگلپور کے ایک مے خانے میں منشی کے کام پر مامور تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا عبدالغنی نے والد سے اس پیشے کو ترک کرنے کی درخواست کی، دور ونزدیک کے رشتے داروں سے باتیں کیں اور انھیں اس کے نقصانات اور عذاب الٰہی کا خوف دلایا، لیکن اس کاروبار کی جڑیں عراقی برادری میں اس قدر پیوست ہوچکی تھیں کہ لوگ صوم وصلوۃ کے پابند ہونے کے باوجود کاروبار بند کرنے کو تیار نہ تھے۔

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

بہرحال اس معاملے میں مولانا عبدالغنی کو کس قدر مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اس کی تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے فقط اتنا کہنا کافی ہوگا کہ انھوں نے انتھک کوشش وکاوش کے بعد برادری کے چند لوگوں کو اپنا ہم نوا بنایا، اور ایک انجمن ''جمعیۃ العراقین'' کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کا مقصد قوم بالخصوص عراقی برادری کی اصلاح کرنا اور انھیں قعر مذلت سے نکالنا تھا۔ رسالہ 'کرن' اس تحریک کے لیے ایک آرگن کی حیثیت سے سامنے آیا۔ رسالے میں عراقی برادری کی مے سازی اور مے فروشی کی کمزوری کو دور کرنے کے لیے اصلاحی مضامین شائع کیے گئے، ساتھ ہی مخالفین کی طعن وتشنیع کی وجہ سے عراقی برادری کے اندر احساس کمتری کا جو مادہ پنپ رہا تھا اسے بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ عراقی سلسلۂ نسب پر قسط وار مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ غرض کہ مولانا عبدالغنی نے ماہنامہ 'کرن' کے ذریعے جس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس میں انھیں کافی حد تک کامیابی نصیب ہوئی۔ اس رسالے میں اخبارات کی طرح مختلف مسائل پر طنزیہ و مزاحیہ انداز میں رباعیات، نظمیں اور غزلیں وغیرہ بھی شائع کی جاتی تھیں۔ مثلاً شہر میں شکر کی قلت کا ذکر کرتے ہوئے بسمل صاحب کی ایک رباعی شائع ہوئی۔ ملاحظہ فرمائیں:

نعمت ہمیں دنیاوی و دینی مل جائے
مانگیں جو خدا سے وہ یقینی مل جائے
بازاروں میں کنٹرول کی برکت سے
ممکن نہیں اک چھٹانک چینی مل جائے

چینی جو بیچنے کا معیار بنا
بنیوں کا گھر اب مصر کا بازار بنا
گاہک کی یہ کثرت کہ الٰہی توبہ
ہر شخص ہے یوسف کا خریدار بنا

ماہنامہ 'کرن' کے متعلق مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے وقت کا یہ ایک اہم رسالہ تھا۔ جن مقاصد کے پیش نظر اس کا اجرا عمل میں آیا تھا اس میں رسالے کو کافی حد تک کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے مذہب کے ساتھ زبان وادب کی بھی حتی المقدور آبیاری کی۔

حواشی:

1 ماہنامہ 'کرن' گیا، مدیر: محمد عبدالغنی عزیزی، اداریہ، جلد نمبر 1، شمارہ 1، دسمبر 1949، ص 2
2 ایضاً
3 ایضاً، ص 5
4 ماہنامہ 'کرن' گیا، مدیر: محمد عبدالغنی عزیزی، جلد نمبر 1، شمارہ 1، دسمبر 1949
5 محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق (حصہ اول)، ص۔ 216
6 ایضاً، ص 217　7 ایضاً، ص، 217　8 ایضاً، ص 218
9 ماہنامہ 'کرن' گیا، مدیر: محمد عبدالغنی عزیزی، اداریہ، جلد نمبر 1، شمارہ 1، دسمبر 1949، ص 8

Dr. Sajid Zaki Fahmi
G-74/B, Abul Fazal, Enclave-1
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:8527007231

نئی جہت اور صداقتوں کا شاعر
جلیس نجیب آبادی

ایم اے کنول جعفری

مغربی اتر پردیش کے کئی تاریخی مقامات میں شامل ضلع بجنور کا ایک شہر نجیب آباد ہے۔ نجیب آباد کو افغانی پٹھان نجیب خان نے 1740 میں بسایا تھا۔ تاریخ میں انھیں نجیب الدولہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مالن ندی کے دائیں کنارے پر واقع نجیب آباد کو اتراکھنڈ کے کوٹ دوار سے جوڑنے والے اتر ریلوے لائن کے واحد جنکشن، سلطانہ ڈاکو کا قلعہ، زرخیز ادبی زمین اور تاریخ اسلام کے مصنف مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی وجہ سے انفرادی مقام حاصل ہے۔ نواب نجیب خان مغل حکومت کے سولہویں بادشاہ مرزا عبداللہ علی گوہر المعروف شاہ عالم ثانی کے دور حکومت میں گورنر کے عہدے پر فائز رہے۔ نجیب الدولہ نے شہر سے کچھ فاصلہ پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اس قلعے کو نجیب الدولہ کے قلعے کے نام سے کم اور سلطانہ ڈاکو کے قلعے کے نام سے زیادہ شہرت ملی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کے لیے سر درد بن گئے سلطانہ ڈاکو کو گرفتار کراسی قلعے میں قید کیا تھا، تب سے لوگ اسے سلطانہ ڈاکو کا قلعہ کہنے لگے۔

علم و ادب کی پرورش گاہ رہے نجیب آباد نے اسلامی مورخ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی، علامہ احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی، اختر الایمان، شفیق بانو شفیق، کفایت حسین ناز، عبدالسلام عاصی، اختر صابری، عرفی خان، عبدالحفیظ قیصر، شکیل رحمانی، مخفی کریمی، ارشاد نجیب آبادی، رشید احمد، عشرت زماں خاں افسر، اشرف شمیم وارثی، سوز نجیب آبادی، اجمل خاں ایڈوکیٹ، مولانا شمس الدین چترویدی، رام اوتار مضطر، مفتی اسرار احمد دانش، انور صدیقی، ثاقب صدیقی اور جرار حیدر جیسے کئی ادیب، شاعر، مورخ، استاد، صحافی، دانشور، مقرر اور مجاہد آزادی پیدا کیے۔ بعد کے شعرا میں اپنا منفرد مقام بنانے اور نئی نسل کے لیے راہ ہموار کرنے والے شعرا میں محمد ظفر جمیل، جلیس نجیب آبادی، طاہر نجیب آبادی، مہندر کمار اشک، عبدالعزیز ظفر رحمانی، مرغوب احمد راہی، سرفراز احمد، مختار احمد شاد، اختر ملتانی، ڈاکٹر آفتاب نعمانی، طیب جمال، شاکر رضوی، شیر حسن عرفی، شارق کفیل، موصوف احمد واصف، الیاس انصاری، سہیل شہاب اور شعیب نفیس سمیت نام قابل ذکر ہیں۔

نجیب آباد کے ادبی آسمان پر جھل مل کرتے ان درخشندہ ستاروں کے درمیان نصف صدی تک نہایت آب و تاب سے چمکنے اور اپنی موجودگی کا احساس کرانے والا جلیس نجیب آبادی نام کا ستارہ بظاہر بجھ گیا، لیکن ادبی حلقوں کے فلک پر اس کی روشنی کی چمک کو برسوں تک محسوس کیا جائے گا۔ آٹھ نومبر 2018 بروز جمعرات دس بجے قبل از دوپہر اپنے عزیز و اقربا اور ادب نواز دوستوں کو دائمی غم دے کر ابدی سفر پر روانہ ہونے والے جلیس نجیب آبادی کا اصلی نام اسلام الدین تھا، لیکن کم ہی لوگوں کو ان کے خاندانی نام سے واقفیت تھی۔ شہر کے زیادہ تر لوگ بھی انھیں جلیس نجیب آبادی کے نام سے جانتے تھے۔ یکم جنوری 1947 کو اتر پردیش کے ضلع بجنور میں واقع نواب نجیب الدولہ کے ادبی اور تاریخی شہر نجیب آباد کے محلہ پٹھانپورہ میں زراعت پیشہ سراج الدین کے یہاں جس بیٹے کی پیدائش ہوئی اُس کا نام اسلام الدین رکھا گیا۔ ابھی سات برس کے ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ چھوٹے بھائی اکرام الدین کا جنم والد کے انتقال کے چھ مہینے بعد ہوا۔ حالانکہ اُن کی پرورش میں چچا اور چچی نے کوئی کور کسر نہیں چھوڑی، لیکن اس کے باوجود انھیں یتیمی، ذہنی الجھنوں اور کئی قسم کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے جولائی 1972 میں شائع ہونے والے اپنے پہلے شعری مجموعہ 'شہر خیال' میں اس کڑوی سچائی اور حقیقت کا تذکرہ بڑی بے باکی کے ساتھ ان الفاظ میں کیا ہے۔

'میں یکم جنوری 1947 کو نجیب آباد کے ایک زراعت پیشہ خاندان میں پیدا ہوا۔ اصل نام اسلام الدین ہے۔ والد صاحب کا نام سراج الدین تھا۔ ابھی میرا بچپن ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور پرورش کا بار والدہ، چچا اور چچی نے اٹھایا۔ والد کی اچانک اور بے وقت موت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ چند اُلجھنوں اور پریشانیوں کے باعث میری تعلیم انٹر میڈیٹ اور ادیب کامل کے بعد جاری نہ رہ سکی۔'

(شعری مجموعہ 'شہر خیال': حرف آغاز ص 7)

ابتدا میں اسلام الدین عشرت زماں افسر کی قربت سے فیض یاب ہوئے۔ عشرت زماں افسر نے انھیں اردو کی طرف راغب کیا اور تعلیمی لیاقت بڑھانے کے لیے اَدیب ماہر اور اَدیب کامل کے امتحانات پاس کرنے میں ہر ممکن تعاون دیا۔ دوسری جانب ان کا زیادہ تر وقت لائبریری میں موجود کتابیں پڑھنے، شہر میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شعرا کا کلام سننے اور ریڈیو اسٹیشن سے گاہے بہ گاہے نشر ہونے والی غزلوں، شعری نشستوں اور کوی گوشٹھیوں کی سماعت میں گزرنے لگا۔ ایسے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ادبی ماحول اپنا اثر نہ دکھائے۔ اُردو کے اَدبی ماحول اور مقامی شاعروں سے متاثر ہوکر دل کے ایک گوشے میں شعر کہنے کی خواہش انگڑائی لینے لگی۔ بچپن اور کھیل کود کو فوقیت دیے جانے والے زمانے میں شعر گوئی کی طرف تیز رفتاری سے بڑھتے رجحان کی بدولت آخر کار اسلام الدین نے صرف چودہ برس کی عمر میں جلیس تخلص کے ساتھ اپنی شاعری کا آغاز کر دیا۔ اسی کے ساتھ نشستوں اور منی مشاعروں میں شرکت بڑھ گئی۔ اخبار و رسائل میں غزلیں شائع ہونے کے سلسلے سے شعر گوئی کو مزید تقویت ملی۔ خیالات میں تضاد ہونے کی بنا پر جلیس، عشرت زماں خاں افسر کے ساتھ زیادہ دنوں تک نہیں ٹک سکے اور علیحدگی اختیار کر لی۔ اپنے وقت کے عظیم شاعر، کوی، اَدیب، مفکر اور صحافی محترم نشتر خانقاہی کی قربت و رہنمائی سے جلیس نجیب آبادی میں کچھ ایسا نکھار آیا کہ جلدی ہی قلم کے اس جادوگر کی پہچان ایک

پختہ شاعر کے طور پر ہونے لگی۔

نشتر خانقاہی کے شاگردوں میں اہم مقام رکھنے والے جلیس نجیب آبادی بہت سادگی پسند، منکسر المزاج، مخلص، گوشہ نشیں اور زیادہ تر خاموش رہنے والے شخص ضرور تھے، لیکن اپنے چہرے پر مسکراہٹ لائے بغیر دوست واحباب کو ہنسانے اور محظوظ کرنے کا ہنر اچھی طرح جانتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند جلیس مشاعروں کے مقابلے شعری نشستوں میں شرکت کو فوقیت دیتے تھے۔ اس بابت ان کا نظریہ دیگر اَدیب وشعرا سے مختلف تھا۔ ان کے مطابق مشاعروں میں شاعر کو ماحول اور حالات کے مدنظر سامعین کی مرضی اور مزاج کے مطابق کلام پڑھنا پڑتا ہے، جب کہ نشست میں شاعر اپنے دل کی آواز کو لبیک کہتے ہوئے اشعار پیش کرتا ہے۔ وہ لن ترانی کے قائل نہیں تھے۔ اُنھیں بے سبب اور بے مقصد کی جانے والی گفتگو یا فضول گوئی کا حصہ بننا قطعی منظور نہیں تھا، لیکن نشست میں دل کھول کر شعر سنتے سناتے تھے۔ اَدبی حلقوں اور شعری محفلوں میں انھیں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

جلیس نجیب آبادی کے بیٹے شبیر پرواز ایڈووکیٹ جنھوں نے ادیب کامل کے بعد انگلش میں ایم اے بھی کیا ہے، نے بتایا کہ اُن کے والد نے ابتدائی تعلیم کے بعد مہاتما گاندھی میونسپل ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کیا۔ اس کے بعد رضا ڈگری کالج رام پور سے اُردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ تین بہنوں کے اکیلے بھائی ہیں۔ والد صاحب نے چاروں بھائی بہنوں کی بہتر پرورش کے ساتھ تعلیم کی جانب بھرپور توجہ دی۔ سب سے بڑی بہن تنویر جہاں اُردو اور سوشیولوجی سے ایم اے، بی ایڈ ہیں اور قصبہ جلال آباد کے مسلم انٹر کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ اُن سے چھوٹی اور دوسرے نمبر کی بہن رفعت جہاں نے پی ایچ ڈی کرنے کے باوجود نوکری کو پسند نہیں کیا۔ سب سے چھوٹی بہن ریشما تبسم گریجویٹ ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اپنے وقت کے مشہور شاعروں میں شمار جلیس نجیب آبادی کا بیٹا اور بیٹیاں اُردو کے طلبہ و طالبات رہے، لیکن چاروں میں سے کسی نے بھی شعر گوئی میں طبع آزمائی کرکے پدری روایت کو زندہ نہیں رکھا۔ جلیس کے چھوٹے بھائی اکرام الدین نے ابتدا میں اشعار ضرور کہے، مگر وہ اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھا سکے۔

اُردو اور ہندی اَدب پر اپنی یکساں اور مضبوط گرفت رکھنے والے ہندوستان کے مشہور ومعروف شاعر، ادیب، مفکر اور صحافی نشتر خانقاہی نے جلیس نجیب آبادی کی شعری کاوشوں کی دل سے تعریف کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے، وہ جلیس نجیب آبادی کے شعری مجموعے 'صبح کرنا شام کا' کے 'سابقہ مجموعوں پر چند تحریروں کے اقتباسات' میں شامل ہے۔

'آج جب کہ اُن کا دوسرا مجموعۂ کلام 'موسم موسم' میرے سامنے ہے تو میں اس کو پڑھ کر ایک گونہ اطمینان محسوس کرتا ہوں کہ میں نے برسوں پہلے جس پوشیدہ کیفیت کا اندازہ کیا تھا وہ اُبھر کر کافی توانا صورت میں سامنے آئی ہے۔ جلیس اجتماعی نوعیت کے شاعر نہیں ہیں۔ وہ دو افراد کے مابین رشتے اور اس کے مختلف حوالے سے اپنے تجربوں کو فنی سطح پر سب کا باہم میں سے بہت کا تجربہ بنانے والے ایسے شاعر ہیں، جو قبائلی اور گروہی انداز کے دانشوروں میں علیحدہ وجود رکھتا ہے.... میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اُنھوں نے ہجومیت کے اس دور میں پوری صداقت کے ساتھ اپنا تحفظ کیا ہے۔'

(شعری مجموعہ 'صبح کرنا شام کا': اقتباس نشتر خانقاہی، ص 23)

جلیس نجیب آبادی آفاقی فکر کے مالک تھے۔ ان کی سوچ انتہائی بلند تھی۔ شعری نشستوں میں ان کی موجودگی سے لگتا تھا کہ اُنھیں شعر کہنے کا سلیقہ اور ملکہ ہی نہیں ہے، شعر فہمی میں بھی کمال حاصل ہے۔ جدید شاعری کی ترجمانی کے لیے اپنی راہ الگ ہموار کرنے والے جلیس نجیب آبادی نے جس سوز وکرب اور معاشرتی نامناسبت کو منظرِ عام پر لانے کے لیے غزل کا سہارا لیا، اُس سے اُنھیں غزل کا اُستاد تصور کیا گیا۔ حالات حاضرہ پر نگاہ رکھنے والے جلیس نجیب آبادی نے غزل گوئی کو ہی میدانِ عمل نہیں بنایا، بلکہ مختلف اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُنھوں نے حمد، نعت، منقبت، قطعات، نظمیں، گیت اور آزاد نظموں میں بھی بہ آسانی اپنا لوہا منوایا۔ اُن کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں، جس میں نظموں کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ اُردو اَدب پر ان کی گرفت اور شعری مہارت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مشہور ومعروف اخبارات ومعیاری اَدبی جرائد میں تو ان کا کلام شائع ہوتا ہی تھا، بیرون ملک بھی وہ خود کو ثابت کرنے میں کامیاب رہے۔ جلیس نجیب آبادی کی شاعری میں سماج کا کرب اور زندگی کی تلخ سچائیاں پائی جاتی ہیں۔ اُنھوں نے شاعری کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے جدید روایات سے تعلق استوار کیا اور نئے لب ولہجے کی شاعری کے ساتھ عصری آگہی کو اپنا موضوع خاص بنایا۔ وہ ایک معتبر، مستند اور زبان وبیان پر قدرت رکھنے والے مقبول شاعر رہے۔ شاید اسی لیے اُنھیں اردو ادب کا دانشور تک کہا گیا۔ جلیس نجیب آبادی کو اُردو اَدب کی خدمات کے لیے اُردو اکیڈمی اتر پردیش، اُردو اکیڈمی بہار اور اُردو اکیڈمی دہلی کی جانب سے اعزاز واکرام سے نوازا گیا۔

جلیس نجیب آبادی کی شاعری میں منفی، مضر اور غیر موزوں عناصر سے اجتناب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر عنوان چشتی نے جلیس نجیب آبادی کے گوشہ نشیں اور منکسر المزاج ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی اچھی اور سچی شاعری کی تعریف کی اور انھیں سماج وبدلتے منظر کا سامنا کرنے والا شاعر بتایا۔ انھوں نے دسمبر 1980 میں شائع ہونے والے اُن کے دوسرے مجموعۂ کلام، 'موسم موسم' کے مقدمہ 'صداقتوں کا شاعر' میں کچھ ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

''اگرچہ جلیس نجیب آبادی گوشہ نشیں اور منکسر المزاج نوجوان شاعر ہیں، لیکن انھوں نے زندگی، سماج اور فن کے بدلتے ہوئے منظر کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیں۔ ہر اچھے رجحان یا عنصر یا اثر کو قبول کیا اور ہر گمراہ کن رویہ یا تاثر کو مسترد کردیا۔ اُنھوں نے ردّ وقبول کے جس پیمانے سے کام لیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے، ورنہ تحریک کے زور کے وقت بڑے بڑوں کے قدم اُکھڑ جاتے ہیں۔ جلیس نجیب آبادی کی شاعری میں کلاسیکی، شاعری کا نظم وضبط، زبان کی صحت، بیان کی دلکشی ملتی ہے، مگر محض 'لفظ' کو سب کچھ سمجھنے کے رجحان سے انحراف ملتا ہے۔ انھوں نے زبان کے تخلیقی حسن کا راز بخوبی سمجھ لیا ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں لفظ، استعاروں اور پیکروں کی ایسی تخلیق کی ہے جو ایک طرف ان کا ذہنی رشتہ قدیم شعری زبان کے زندہ عناصر پر مشتمل ہے اور دوسری طرف جدیدیت کے طرز جدیدیت سے جوڑ دیتی ہے۔ خیال، فکر یا جذبے کی سطح پر اُن کی شاعری میں ایک نئے انسان سے ملاقات ہوتی ہے جو حساس اور باشعور ہے اور غم کائنات کو غم حیات کے آئینہ میں منعکس دیکھتا ہے۔''

('موسم موسم' کا مقدمہ 'صداقتوں کا شاعر': ڈاکٹر عنوان چشتی، ص 11-10)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ جلیس نجیب آبادی نے حمد باری اور نعت مبارکہ کے علاوہ اصناف سخن کے قریب قریب ہر رنگ کو قرطاس اَبیض پر اُتارا ہے۔ جلیس نجیب آبادی کے شعری مجموعے، 'قحط اور بارشیں' میں شامل 'حمد' قریب 11 برس بعد ماہنامہ 'جہاں نما' گنگوہ کے اکتوبر 2018 کے شمارے میں شائع ہوئی۔

حمد

نور سے بھر دے میرے لفظوں کی دُنیا اے خدا
لکھ رہا ہوں تیری رحمت کا قصیدہ اے خدا
کون تیرے در سے خالی ہاتھ لوٹا اے خدا
جتنا مانگا مل گیا اُس سے بھی زیادہ اے خدا
تو زمین و آسماں کی روشنی، تابندگی
تو ہی بارش، تو ہی خوشبو، تو ہی سایہ اے خدا

ہم تو کھو جاتے کہیں گمراہیوں کے دشت میں
گر نہ ہوتی تیری رحمت کارفرما اے خدا
درگزر فرما مری کوتاہیٔ گفتار کو
شعر کہنے کا نہیں مجھ کو سلیقہ اے خدا

دراصل، جلیس نجیب آبادی اُن شاعروں میں تھے، جو اپنا تعلق ہم قلم، ہم سفر، نقاد اور دانشور سمیت تمام قارئین کے ساتھ بنائے رکھنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیق اور قاری کی حیثیت لازم و ملزوم کی سی ہے۔ اچھا ادب تخلیق کرنے کے لیے جہاں ادب کا عمیق مطالعہ ضروری ہے، وہیں معاشرے پر بھی اس کی نگاہ اور مضبوط گرفت ہونا لازمی ہے۔ اُنھوں نے کلاسیکی ادب کے دعوے داروں پر سوال اُٹھاتے ہوئے کہا کہ کتنے ہی ترقی پسند اپنے نظریات پر قائم ہیں، تو کتنے ہی جدیدیت کے نظریات کے پابند ہیں۔ اچھا ادب، فن پارے اور تحریک کی بابت جلیس نجیب آبادی نے اپنے تجربات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''تحریکیں دم توڑ دیتی ہیں لیکن ہر تحریک کچھ لازوال تخلیقات چھوڑ جاتی ہے اور کچھ ایسے فن کار جن کی شہرت دائمی ہوتی ہے، وقتی نہیں۔ جن کی تخلیقات زبان و ادب کا بے بہا خزانہ اور آئندہ لکھنے والوں کے لیے سنگ میل بن جاتی ہیں۔''

بہت عرصہ پہلے سے یہ آواز گونج رہی ہے کہ اچھا ادب تخلیق نہیں ہو رہا ہے۔ کم سے کم اتنا ضرور سچ ہے کہ اچھا ادب کم تخلیق ہو رہا ہے۔ اس کے اسباب پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ فنکار کا احساس عام لوگوں سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ زندگی کے حسن سے اس کا تعلق زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے فطرت کے مناظر خدائے برتر کی تخلیق کردہ زندہ تصویریں، موسم، نغمگی، مسرتیں، غرض جو کچھ وہ دیکھتا ہے، سنتا ہے اور محسوس کرتا ہے، اسے اپنے تجربے کا ایک حصہ بنا لیتا ہے، پھر وہ کسی اور دنیا میں کھو جاتا ہے۔ یہی کیفیت اپنے اور دوسروں کے دکھ درد سے اس پر طاری ہوتی ہے اور یہ کرب آمیز لذتیں، خوشیاں اور غم اس کے اندرون میں کہیں گم ہو جاتی ہیں اور پھر اس کا قابل استعمال حصہ فنکار اپنے فن پاروں میں لوٹا دیتا ہے اور اس میں سے بھی وہ حصہ جس کی 'نمود خونِ جگر' سے ہوتی ہے، 'معجزۂ فن' بن جاتا ہے۔'

(شعری مجموعہ قحط اور بارشیں 'سخن ہائے گفتنی' ص 12-11)

جلیس نجیب آبادی کے اشعار حقیقت پسند اور صداقت کی ترجمانی کرنے والے ہیں۔ اُنھیں شعروں کے دھاگے میں الفاظ پرونے کا ہنر اچھی طرح آتا ہے۔ عام روش سے ہٹ کر اپنی راہ الگ بنانے والے اس شاعر کے چند شعر اور ایک نظم ملاحظہ فرمائیں۔

آنسوؤں سے ہی سہی بھر گیا دامن میرا
ہاتھ تو میں نے اُٹھائے تھے دعا کس کی تھی
وہ چار دن یہاں ٹھہرے گا لوٹ جائے گا
جو مجھ میں شہر جلا ہے وہ کیا دکھاؤں اُسے
چھتیں، دروازے، دیواریں، دریچے ٹوٹ جاتے ہیں
سحر ہوتے ہی خوابوں کے گھروندے ٹوٹ جاتے ہیں
ڈھونڈتا رہتا ہوں اپنی خامہ سوزی کا جواز
یعنی کیوں لکھتا ہوں اور کس کے لیے لکھتا ہوں میں
ناز تھا جن کی رفاقت پر وہ چہرے کھو گئے
دوپہر سر پر کھڑی ہے اور سائے کھو گئے
پھر آج دھوپ کا سہرا اُگے گا کاغذ پر
پھر آج گرمِ سخن ہے سکوتِ شب مجھ سے
تمھاری یاد کے شعلوں میں جل رہی ہے حیات
میں خود کو اس سے بڑی اور کیا سزا دیتا
رات تیرا خط پڑھا، پھر پُرزہ پُرزہ کر دیا
اور اپنی بے بسی پر دیر تک روتا رہا
پھول سے بچے بھوکے سوتے دیکھے ہیں
آنگن آنگن درد کے سائے دیکھے ہیں

دراصل شاعری تہذیب و روایات کا آئینہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا فن بھی ہے، جس میں اکتاہٹ اور بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ شاعر اور سامعین کو لازم و ملزوم بنائے رکھتا ہے۔ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر حساس اور ذی ہوش شخص کے قلب و جگر میں ایک شاعر چھپا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعر کا شعر پڑھ کر یا سن کر اس کی تعریف کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اس کے برعکس اگر سامع شعر کے مفہوم و مضمون سے ناواقف ہے، تو اُسے شعر سے کوئی فیض نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ، شاعر کو اپنی محنت رائیگاں ہوتی ضرور نظر آتی ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھا شاعر اپنے کلام کو کتابی شکل میں شائع نہیں کرا پاتا۔ اس صورت میں اس کا تمام تر علمی خزانہ کسی صندوق یا الماری میں قید یا پھر مکمل طور پر دفن ہو کر رہ جاتا ہے۔ کم ہی خوش نصیب ہیں جن کے اِنتقال کے بعد اُن کی اولاد یا پھر شاگردوں میں سے کسی نے مرحوم کے کلام کو زندہ و جاوید بنانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک جلیس نجیب آبادی کا تعلق ہے، تو وہ اُن خوش نصیب شعرا میں شامل ہیں، جو اپنی حیات میں آٹھ کتابیں شائع کرا کر منظر عام پر لانے میں کامیاب رہے۔ ان کے اشعار میں شاعری کی زندہ و تابندہ روایتیں تو موجود ہیں ہی، الفاظ کا انتخاب، تراکیب، پیکروں اور استعاروں کا استعمال بھی بڑی تجربہ کاری سے کیا گیا لگتا ہے۔ شعری مجموعے کی دوسری کاوش، 'موسم موسم' میں ذہنی اور نفسانی کیفیتوں کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر پروفیسر عنوان چشتی نے کہا بھی ہے۔

'ان اشعار کے مطالعے سے نئے تصورِ حسن و عشق، درد و داغ، کرب و کیف، خون آشام آرزو، حسرتوں، حوصلوں اور زندگی اور زمانوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی شدید ذہنی اور نفسانی کیفیتوں کا عرفان بھی ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جلیس نجیب آبادی نے کلاسیکی دبستانِ سخن سے اپنا ذہنی رشتہ استوار رکھتے ہوئے نئے دور کا المیہ اور انسان کی ذات کی کشمکش کو پیش کیا ہے اور اس پیش کش میں انھوں نے انسان بیزاری کا ثبوت نہیں دیا۔ بلکہ اپنے دور سے ناآسودگی کے باوجود زندگی کو برتنے اور پیار کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔'

('موسم موسم' بصداقتوں کا شاعر: پروفیسر عنوان چشتی ص 16-15)

جلیس نجیب آبادی کے اَدبی ذخیرے میں شامل شہر خیال (1972)، موسم موسم (1980)، برگ آفتاب (1988)، تذکرہ سیدنا یوسف (2001)، قحط اور بارشیں (2007)، صبح کرنا شام کا (2013) شعری مجموعوں کے علاوہ نشتر خانقاہی، ڈاکٹر گری راج شرن اگروال اور سردار آصف کے ساتھ 'غزلوں کے شہر میں' غزل سنگرہ کو ترتیب دیا۔ ہندی کی اس ضخیم کتاب میں حضرت امیر خسرو سے اب تک کے مشہور و معروف ادیب و شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ 'اوراق پریشان' کتاب کو بھی مرتب کیا۔ 'اوراق پریشان' اپنے وقت کے مشہور شاعر محمد اجمل خاں ایڈوکیٹ مرحوم کا شعری مجموعہ ہے۔ شہیر پرواز بتاتے ہیں کہ یہ شعری بیاض کافی پرانی اور بوسیدہ ہو چکی تھی۔ اس کے بہت سارے اشعار کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ شکستہ خط میں لکھی اس شاعری کو ان کے بیٹے اور نگر پالیکا نجیب آباد کے سابق صدر معظم خاں ایڈوکیٹ ہر قیمت پر چھپوانے کے خواہش مند تھے۔ اس کتاب کو از سر نو لکھنے اور دیمک کی نذر ہو چکے شعروں کو ہر ممکن کوشش کر درست کرنے کے لیے سخت محنت کرنی پڑی۔ اُنھوں نے اپنے اشعار میں نئی نئی جہتیں اور نئے نئے زاویے اس انداز میں پیش کیے ہیں کہ ان کی شاعری دورِ جدید کا منظر نامہ دکھائی دیتی ہے۔ مشاہدات و تجربات کی منازل طے کرنے والے اس معتبر شاعر نے اپنی شاعری کا ایسا کامیاب نمونہ چھوڑا ہے، جس کی بدولت اُنھیں مستقبل میں بھی یاد رکھا جائے گا۔

■

M. A. Kanwal Jafri
127/2, Jama Jasjid
NEENDRU, Tehsil Dhampur
Distt.: Bijnor - 246761 (UP)
Mob.:9917767622
Email.: jafrikanwal785@gmail.com

موسیٰ مجروح کی افسانہ نگاری

ذاکر حسین ذاکر

عہد حاضر کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں موسیٰ مجروح کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔افسانوی ادب میں مجروح کی شناخت مقصد انگیز افسانہ نگار کے طور پر ہوتی ہے۔وہ بنیادی طور پر رومانی افسانہ نگار ہیں۔مگر ان کے افسانوں میں معاشرتی نظام کے مسائل اور تعمیری اقدار کی بازیافت کی جھلک صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے زندگی کی توانائی سے بھر پور ہیں۔موسیٰ ادب میں فن برائے فن اور ادب برائے ادب دونوں ہی نظریے کے یکساں طور پر قائل ہیں۔وہ ادب کو زندگی کی اعلیٰ قدروں کا ترجمان و آئینہ تصور کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں ان کے اس مسلک کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات شعر وشاعری سے کی۔وہ ایک اچھے استاد اور اچھے انسان تھے۔اس لیے ان کی شاعری ان دونوں ہی خوبیوں کا پرتو نظر آتی ہے۔وہ جدید معنویت اور کلاسیکی ندرت سے معمور دلکش اشعار کہتے ہیں۔

لکھ لکھ کے چومنا ورق دل پہ تیرا نام
قائم ہیں آج بھی میرے وحشت کے سلسلے
سورج چھپا کے اپنی شعائیں بھی لے گیا
ذروں کی بے بساط ادائیں بھی لے گیا
مجروح اس لٹیرے کا کیا تذکرہ کروں
جو دل کے ساتھ میری دعائیں بھی لے گیا

جب موسیٰ مجروح ایسی غزلیں کہہ رہے تھے تو اسی زمانے میں ان کے قریبی عزیز اور معروف ادیب علامہ خیر بہوروی جن سے موسیٰ مجروح کی اکثر خط وکتابت ہوتی رہتی تھی۔انھیں غزل گوئی کے شریف فن کو بدنام نہ کرنے کا مشورہ دے دیا۔انھوں نے کہا کہ شاعری میں سب سے مشکل کام غزل کہنا ہے اور اس صنف کو سب سے آسان سمجھا جاتا ہے۔غزل کا ایک مزاج ہوتا ہے جو آسانی سے نہیں سمجھا جاسکتا۔دل بہلانے کے لیے شعر گوئی کو میں دوسرے مشاغل سے بہتر سمجھتا ہوں۔مگر سنجیدہ شاعری کے لیے معیاری ہونا شرط ہے۔خیر بہوروی یہیں نہیں رکے انھوں نے موسیٰ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے امیر مینائی کا شعر بھی پڑھا۔

(پل صراط از موسیٰ مجروح ص:6 نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد لکھنؤ 1983)

تم اس کو امیر اور کوئی کام سکھا و
تڑپانے تڑپنے کے لیے دل نہیں ہوتا

علامہ خیر بہوروی کی اس طنزیہ ترغیب پر جب موسیٰ مجروح نے نثر نگاری میں دشت نوردی کا فیصلہ کیا تو انھوں نے اس کے لیے افسانے کو اپنے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ اور قریب تر پایا۔علامہ کا مشورہ نوجوان موسیٰ کے ذہن پر اسی طرح گراں گزرا جیسے غالب کا 'مردہ پروردن مبارک کارنیست' والا مشورہ سرسید کو برا لگا تھا۔جس طرح سرسید اپنی ناراضگی کے باوجود اس مشورے کی تپش کو اپنے ذہن سے نہیں جھٹک سکے اسی طرح موسیٰ بھی علامہ کے دل بہلانے کے لیے شعر گوئی کا مشورہ بھی بھول نہیں پائے۔موسیٰ نے غزل کہنی تو نہیں چھوڑی مگر جب انھوں نے افسانہ لکھنا شروع کیا تو اس میں انھوں نے خوب دل تڑپائے۔پور پور جب کسی شاعر کا ذہن انسانی مسائل سے زیادہ روبرو ہوتا ہے تو اسے غالب کی طرح غزل تنگ محسوس ہونے لگتی ہے۔موسیٰ مجروح سماجی تقاضوں کو گہرائی سے محسوس کرنے والے شاعر تھے۔اس لیے ان کو افسانہ نگاری میں قدم رکھنا ہی چاہیے تھا۔افسانوی ادب ہی ادیب کے ذہنی تقاضوں کی تکمیل کا اہل ہے۔اسی لیے شاید انتظار حسین نے مرزا غالب کو کلاسکی شاعری کا حرف آخر اور نئے فکشن کا نقطۂ آغاز کہا تھا۔وہ اس لیے بھی یہ بات کہنے کی جسارت کر سکے کہ غالب نے" اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے'' جیسی بات کہہ کر شاعری میں اظہار کی تنگی کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔غالب صرف غزل کہتے تھے جس میں تنگی کا احساس ہونا فطری عمل تھا۔ان کے زمانے میں شاعری کے علاوہ کسی دیگر اصناف میں اپنی بات کھل کر کہہ پانے کی سہولیت موجود نہ تھی۔انتظار حسین کے مطابق 'غالب کو اپنے بیان کے لیے جس وسعت کی تلاش تھی۔وہ انھیں ناول ہی میں میسر آسکتی تھی۔

(علامتوں کا زوال از انتظار حسین ص:182 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1983)

لیکن غالب نے اس خلا کو پر کرنے کے لیے خطوط نگاری میں اپنا راستہ بنایا۔انھوں نے خطوط نگاری کو افسانوی فضا میں ڈھال کر جس سہل انگیز نثر نگاری سے متعارف کرایا،اس کی دھڑکن ہم آج بھی محسوس کرتے ہیں۔مگر اب ڈیڑھ صدی بعد امتداد زمانہ کی وجہ سے شاعروں نے غزل کے علاوہ بھی نظم،آزاد نظم اور نثری نظم کا راستہ نکال لیا ہے۔اس کے برعکس اردو کے عظیم ناول نگار اور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا الگ خیال ہے۔وہ کہتے ہیں کہ کم الفاظ میں اپنی بات کہنے کی جو صلاحیت شاعری میں موجود ہے۔وہ فکشن میں دستیاب نہیں ہے۔'افسانے اور ناول کا وجود اتنا پر قوت نہیں ہے جتنا شاعری کا ہے۔

(افسانے کی حمایت میں از شمس الرحمٰن فاروقی ص:15 شہرزاد کراچی 2004)

موسیٰ مجروح کے افسانوں میں اسی طرح کی گہرائی محسوس کی جاسکتی ہے۔ان کے افسانوں میں شاعری کے نقوش نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ فاروقی نے کئی چاند تھے سر آسماں کی نثر کے ساتھ کیا ہے۔

موسیٰ مجروح کی بیشتر کہانیوں کے پلاٹ ان کے ذاتی تجربات پر مبنی ہیں۔ان کے پلاٹ ان کے آنگن میں پنپتے ہیں اور ان کے ذہن میں ایک درخت کی طرح نشو ونما حاصل کرتے ہیں۔ پھر وہ کاغذ پر روشنائی کے ذریعے بکھرے نظر آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ واردات قلبی صرف موسیٰ کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہوگی۔ موسیٰ ان سے الگ اس لیے ہیں کہ ان کی کہانیوں میں ان کے تجربات کا جس گہرائی سے اظہار ہوتا ہے، اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ کس کرب سے گزر کر ایک کہانی کی تخلیق کرتے رہے ہوں گے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کا چھوٹا بھائی جسے انھوں نے تعلیم و تربیت دی، ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی روز ان کی کھڑکی سے گزر جاتا ہے اور ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے۔ان کی بیماری اور اقتصادی مشکلات سے بھی چشم پوشی کرتا ہے۔ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں تک کو بھی وہ دیکھ کر نظر انداز کرتا تو ان کی حس پھڑک جاتی ہے۔ ایسے میں وہ ناختم ہونے والے کرب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اس کرب کو ایک خوبصورت کہانی کی شکل میں ڈھال دیا جس کے بعد 'کھڑکی' کہانی وجود میں آئی۔ کھڑکی افسانہ نگار کی ذاتی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اتفاق سے اس کہانی کا اہم کردار سلطانہ اور بچوں کے نام بھی افسانہ نگار کے اپنے بچوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔' وہ مجھ سے ملنے نہیں آتا مجھے دیکھنے بھی نہیں آتا لیکن میرے لیے یہ بہت طمانیت کا باعث ہے کہ چارپائی پر پڑے پڑے اپنی کھڑکی سے دوبارا سے اسکوٹر سے آتے جاتے دیکھ لیتا ہوں۔

(پل صراط ص 181)

یہ کہانی کا کلائمکس ہے جس میں افسانہ نگار نے اپنے کرب کو انتہائی اطمینان کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔اس کے اظہار میں بے بسی نہیں ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے پل کے نیچے ٹرین سے کٹی ہوئی ایک لاش افسانہ نگار کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لاش کے اعضا چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسا ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کی آنکھیں زندہ ہیں اور کسی کی متلاشی ہیں۔ یہ مخدوش لاش اس حساس افسانہ نگار کے ذہن سے ایسے چپک کر رہ جاتی ہے جیسے وہ اسے سالوں سے جانتا ہو۔ واقعی وہ اس کے دوست صدیقی کی لاش تھی۔ صدیقی کی لاش کی وہ زندہ آنکھیں افسانہ نگار کا اس وقت تک تعاقب کرتی ہیں جب تک وہ ایک کہانی کا پلاٹ تیار نہیں کر لیتا۔ آنکھیں ان کے افسانوی مجموعہ 'پل صراط' میں شامل ہے۔''اس کی بکھری ہوئی لاش میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ درجنوں گدھ اور کتے اس کی مزید صفائی میں منہمک تھے۔ ویران اور اداس آنکھیں خلاف توقع محفوظ اور کھلی ہوئی تھیں۔ (پل صراط ص 59)

خودکشی کی اس دلخراش واردات کو ریلوے اسٹیشن پر سیکڑوں لوگوں نے دیکھا ہوگا مگر اس کا کرب محسوس کیا موسیٰ نے، جو ایک سچے افسانہ نگار ہیں۔ ایسا نہیں کہ خودکشی کی واردات اس کے بعد نہیں ہوئی۔ آج بھی ہوتی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ آنکھیں سے اچھی کہانی بھی لکھی گئی ہو، مگر آنکھیں نے اس واقعے کی ایک الگ مگر امٹ چھاپ چھوڑی ہے۔ اقتصادی بدحالی کا شکار اور بیماری سے ٹوٹ چکے صدیقی کے لیے اپنی بیوی کے سامنے منہ دکھانا مشکل ہوگیا تھا۔'خودکشی سے قبل صدیقی نے مصنف کے سامنے اعتراف کیا کہ میں ریل کی پٹری سے اٹھ کر آ رہا ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹے تک سٹی اسٹیشن کے پل پر سویا رہا کمبخت کوئی ٹرین ہی نہیں آئی۔ صدیقی خودکشی کرنے کے اپنے ارادے کو بہت فطری انداز میں بیان کرتا ہے۔'اسے اپنی کم مائیگی اور کم نصیبی کا احساس تھا'۔ (پل صراط ص 69)

افسانہ نگار نے اس واقعے کو یوں قبول کیا جیسے کفن میں گھیسو اور مادھو کے آلو کھانے کے معمولی سے واقعہ کو پریم چند نے قبول کیا تھا۔اس خودکشی کے واقعے نے گرد و پیش کے کوائف پر مبنی ایک پر تاثیر اور دردناک کہانی کو جنم دیا۔

اردو کے اس مشہور و معروف شاعر و افسانہ نگار محمد موسیٰ خان موسوم بہ موسیٰ مجروح کا جنم دیوریا کے سلیم پور علاقے کے گاؤں اورنگ آباد میں 1936 ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم سلیم پور ہی میں ہوئی تھی۔ انٹرنس کرنے اسلامیہ کالج گورکھپور چلے گئے۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بی کام کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بہ مشکل بیس سال کی عمر میں موسیٰ کو بلاک ڈیولپمنٹ آفس میں نوکری مل گئی۔اس کام کے ساتھ ان کا ذہن ہم آہنگ نہیں ہو پا رہا تھا۔اس لیے وہ ایک سال کے اندر گورکھپور ریلوے میں اکاؤنٹینٹ ہو کر چلے گئے۔ گورکھپور کی وسیع فضا ان کے مزاج سے مطابقت رکھتی تھی۔ ادب سے ان کا ذہنی لگاؤ پہلے سے ہی تھا۔ گورکھپور کی ادبی فضا میں بسی توانائی نے اس میں مزید جلاء بخشی۔ان کا ادبی ذوق بیدار ہو گیا۔انھوں نے وہاں ایک بار پھر پڑھنا لکھنا شروع کر دیا۔ اردو سے ایم اے کرنے کے بعد ان کی تقرری رتن سین بانسی ڈگری کالج

میں بطور لکچرار ہو گئی۔ زندگی کے اسی موڑ پر موسیٰ مجروح نے محمد موسیٰ خاں کا کینچل اتار پھینکا اور پھر اس ادبی سفر میں نکل کھڑے ہوئے جو انھیں بہت دور تک لے جانے والا تھا۔ انھوں نے اس سفر میں چلتے ہوئے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ محمد موسیٰ خاں سے موسیٰ مجروح تک کا نصف صدی کا سفر دلچسپ بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ اس سفر میں کئی ایسے مقام آئے جہاں نامساعد حالات میں بھی حوصلہ مندی اور ثابت قدمی نے انھیں آگے بڑھتے رہنے کا موقع فراہم کیا۔ان کے تجربات اور مشاہدات نے ان کے دماغ کو ہر موڑ پر نئی اور انوکھی کہانیوں سے روشناس کرایا۔ان کی دلچسپ شیریں بیانی نے انھیں نثر میں شاعری کرنے کا ہنر بخشا، جسے انھوں نے بہت حسن وخوبی سے ادا کیا۔ حالانکہ موسیٰ کا دعوا ہے کہ وہ نثر میں شاعری نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ میں موضوع کی اولیت اور اس کی خوبصورت پیش کش پر جان چھڑکتا ہوں۔ یہ بات درست ہے کہ جب تک ادیب کی شخصیت میں رومانی پیچ و خم نہ ہوں خالص تخیلات کی پرواز کے سہارے دماغ میں ارتعاش پیدا کرنے والی کہانیاں وجود میں نہیں آتیں۔

مگر موسیٰ کی کہانی 'معاوضہ' پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کی ان کی شخصیت میں کتنا پیچ و خم ہے۔ معاوضہ متعصبانہ حالات حاضرہ کی زبردست عکاسی کرتی ہے۔ اس کہانی کے خالق کو خالص رومانی کہانی کار کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ان کے بیشتر افسانے اپنے اندر گہری معنویت پوشیدہ رکھنے کے علاوہ سماجی تانے بانے کے الجھاؤ سے تعلق رکھتے ہیں،اسی سروکار سے تعلق رکھنے کے لیے چار دہائی قبل جل گاؤں شہر میں ہوئے فسادات کی

شاندار عکاسی کے لیے افسانہ معاوضہ کو یاد رکھا جائے گا۔اس کی مرکزی کردار ہاجرہ بیگم کی دشواریاں فسادات میں تباہ ایک متوسط طبقے کے مظلوم خاندان کی کہانی بیان کرتی ہے۔ایک دن ایک عورت افسران کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔

میں بیوہ ہوں۔
بیکس ہوں۔ میں لٹ گئی میں برباد ہوگئی
مگراس کی بات کوئی سننے والا نہیں تھا

(پل صراط ص 152)

دنگے میں کیسے سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے یہ افسانہ اس کی بچی عکاسی کرتا ہے۔' (پل صراط ص 157)

معاوضہ اس ماں کی دردناک کہانی ہے جس کا فساد میں سب کچھ لٹ جاتا ہے اور معاوضہ کے لیے وہ افسران کے آگے گڑگڑاتی پھر رہی ہے۔ یہ فسادات کے موضوع پر ایک زندہ کہانی ہے۔ کہانی کا کلائمکس بہت دردناک ہے۔جب وہ معاوضے کے دفتر میں اپنے کاغذات لے کر جاتی ہے۔کار میں بیٹھا ہوا ایک آدمی اسے بھکاری سمجھ کر سو روپئے دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

پل صراط میں شامل افسانوں کا سماجی اور معاشیاتی مشاہدہ کرنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے کردار کسی نہ کسی سنگین مسئلے سے دوچار ہیں۔ایسے مسائل جس سے متوسط طبقہ نبرد آزما ہونا چاہتا ہے۔مگر اس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ان میں رومان پسندی اور حقیقت نگاری کا ایک سا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا افسانہ کانٹے جسے رومان پسندی کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔یہ بالکل رومانی کہانی ہے۔دوستی اور محبت کی کہانی کانٹے کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

انھیں سے پھول ملے تھے انھیں دعائیں دو
جو آج لائے ہیں کانٹے چھپا کے دامن میں

التجا اور پل صراط تک تمام افسانے رومانیت کے ساتھ نفسیاتی مسائل کے بھی عکاس ہیں۔ان افسانوں کو رومانی کہنے کے لیے ہمارے پاس ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ ہے کہ موسیٰ کی زبان نہایت شیریں ہے۔ان کی نثر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اتنی شیریں اور رومانی ہے کہ ظاہری طور پر تلخ افسانے بھی رومانی نظر آتے ہیں۔نثر میں شاعری کرنے کے تعلق سے کرشن چندر کے بارے میں جو بات کہی جاتی ہے وہ موسیٰ مجروح کے بارے میں صادق آتی ہے۔ ماہ نامہ' بیسویں صدی' میں مسلسل شائع ہونے والے موسیٰ مجروح کے رومانی افسانے کانٹے، ادھورا مجسمہ، خوبصورت ہاتھ، سنگ میل اور منزل اور التجا کو اس دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ پل صراط خود ایک رومانی کہانی ہے۔حالانکہ موسیٰ کی ہر کہانی ایک پل صراط ہے۔مگر پل صراط کی بات ہی کچھ اور ہے۔'اس وقت واقعتاً وہ پتھر کا ایک شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔'

(پل صراط ص 137)

یہ ایک نوجوان لڑکی سے لڑکے کی ملاقات شادی سے پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔اس نے کئی بار شادی سے قبل اس کا بوسہ لینا چاہا مگر لڑکی نے منع کر دیا۔شادی کے بعد وہ ضد کرنے لگتا ہے کہ کیا یہ ہونٹ واقعی کنوارے ہیں۔'میں اس پر دیوانہ وار جھکتا چلا گیا۔سرخ غرارہ جمپر اور مقیش لگی ہوئی اوڑھنی میں میرے دیرینہ خوابوں کی تعبیر چھپی ہوئی تھی۔ (پل صراط ص 139)

قسم کھاؤ کیا ان ہونٹوں کو پہلے کسی نے نہیں چھوا ہے۔جب اس کی ضد بڑھتی گئی تو لڑکی نے کہا کہ دونوں یہ قسم کھائیں تو وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔دراصل موسیٰ کی رومان پسندی مکمل طور پر انسانی مسائل کی رومانیت ہے۔ وہ رومانیت کو بھی مسائل میں ممیز کرتے نظر آتے ہیں۔ان مسائل پر ان کی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ اس کی تاثیر ہی ان کے افسانوں کو دھاردار بنا کر پیش کرتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ جب قاری ان کے افسانے پڑھتا ہے تو اسے ہر افسانے میں ایک نئے پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔

پل صراط میں کل 12 کہانیاں شامل ہیں۔اس کی پہلی کہانی 'سنگ میل اور منزل' بہت دلچسپ ہے۔اس کہانی میں نئی نویلی دلہن سسرال میں اپنے شوہر کا البم دیکھتی ہے اور اس میں لگائی گئی ایک درجن لڑکیوں کی تصویریں اس کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔وہ ان کے متعلق اپنے شوہر سے دریافت کرتی ہے۔شیامالی، فریدہ، صبا، شمع نرگس وغیرہ۔الہ آباد کی شیامالی جو پہاڑ کی رہنے والی تھی۔

پل صراط میں شامل افسانوں کا سماجی اور معاشیاتی مشاہدہ کرنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے کردار کسی نہ کسی سنگین مسئلے سے دوچار ہیں.ایسے مسائل جس سے متوسط طبقہ نبرد آزما ہونا چاهتا ہے۔ مگر اس سے فرار ممکن نہیں ہے.ان میں رومان پسندی اور حقیقت نگاری کا ایک سا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا افسانہ کانٹے جسے رومان پسندی کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔لکھنؤ کی رہنے والی فریدہ جو پاک دامن لڑکی تھی بالکل گنگا جل کی طرح پاکیزہ۔افسانہ نگار البم میں لگے سبھی لڑکیوں کا حسین اور دلچسپ تعارف کراتا ہے۔ان کے حسین چہرے لباس اور خاندانی حالات تک۔مگر وہ آخر میں بڑی صاف گوئی سے کہتا ہے کہ یہ سب سنگ منزل تھیں اور تم منزل ہو۔اپنے شوہر کا بے باک جواب سن کر نئی نویلی دلہن کے چہرے پر تبسم رقص کرنے لگتا ہے۔اس کہانی کو پڑھتے ہوئے مجھے جوش کی خودنوشت 'یادوں کی بارات' کی یاد آگئی۔جس میں جوش صاحب نے بھی بہت بے باکی سے اپنے معاشقے کا ذکر کیا ہے۔

'وہ بڈھا' ہجرت کے کرب کی کہانی ہے۔ایک بڈھا اپنے گاؤں اپنے باغ اور اپنی کوٹھی کو پکڑے بیٹھا رہتا ہے۔آزادی کے بعد تعلیم یافتہ گھرانوں میں جو ہجرت کی وبا چلی تو پورا گھر تباہ ہو گیا۔اس بڈھے کی ساری اولادیں یہاں تک کہ اس کی بیوی بھی پاکستان چلی گئی۔وہ اکیلے رہ جاتا ہے۔اپنے بچوں سے کہتا ہے کہ اپنی جائداد فروخت کرنے کے بعد ہی پاکستان جائے گا۔مگر وہ اپنی جائداد فروخت کرنے کے بعد بھی اپنا گاؤں نہیں چھوڑ پاتا۔ جب اس کا گھر بک جاتا ہے تو وہ لایعنی طور پر گاؤں میں گھومتا رہتا ہے۔کئی دردناک کہانیوں میں رینگتا ہوا آدمی جو 1980 میں لکھی گئی تھی بہت اہم ہے۔ریلوے اسٹیشن پر جوتے پر پالش کرنے والے ایک بوڑھے کی کہانی جس کے چار لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔اس کے بعد بھی وہ تنہا ہے اور پیٹ پالنے کے لیے جوتے پر پالش کرتا پھرتا ہے۔اس کے بچے اپنے اپنے گھونسلے میں نئے چوزوں کو پال رہے ہیں اور اس گدھ کو بھول چکے ہیں جس نے اپنا پیٹ کاٹ کر ان کی پرورش کی تھی۔اب ان کے دنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ لوگوں کے جوتے پر پالش کر کے اپنا پیٹ پال رہا ہے۔آج اس موضوع پر کئی کہانیاں اور ناول لکھے جا چکے ہیں، مگر اس وقت موسیٰ کی کہانی میں نیاپن تھا۔پل صراط پڑھنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ نے علامہ خیر بھوروی کی' دو لائن صحیح لکھنے والی بات' کو غلط ثابت کر دیا۔ جب ایک کامیاب غزل گو نثر کی طرف راغب ہوتا ہے تو شاعری کی ساری لطافت نزاکت اور دلکشی اس کے بیانیہ میں سمٹ آتی ہیں۔بیانیہ کی یہ خوبیاں موسیٰ مجروح کے افسانوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

■

Zakir Hussain Zakir
Shanti Nagar Near Sant Pushpa Schoole
Distt & Post: Deoria-274001 (UP)
Moh.:9415276138

زندگی رات ہے، رات ڈھل جائے گی

(کمال جائسی کی یاد میں)

اشتیاق سعید

شام مکمل طور پر رات میں تبدیل ہو چکی تھی یا ہوا چاہتی تھی، پتہ نہیں! ایسے ہی کسی لمحے میں موبائل کی گھنٹی بجی... میں نے لپک کے موبائل اُٹھایا۔ رشید بشر کا نام فلیش ہو رہا تھا۔ فوراً فون ریسیو کیا۔ میرے ہیلو کہتے ہی رشید بشر کی بے ہنگم آواز گونجی اور وہ لگاتار بولتے چلے گئے۔

''اشتیاق بھائی کمال صاحب کی سانسیں الٹی چلنے لگی ہیں۔ انھیں یہاں لودھا روڈ پر سیتا پارک کے قریب غازی نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا ہے، میری سمجھ سے معاملہ اب تب کا ہے، اگر گھر پہ ہوں تو آجایئے۔ آفاق الماس، جبار استاد اور ظفر گڈّو موجود ہیں''۔

''ٹھیک ہے، میں بھی پہنچتا ہوں''۔ کہہ کر میں نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا اور واش روم میں جا کے جلدی جلدی چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے، لباس تبدیل کیا اور لودھا روڈ کے لیے نکل پڑا۔

کمال صاحب گزشتہ پندرہ سولہ برسوں سے گردے کے عارضے میں مبتلا ہیں۔ اوائل میں مہینے میں دو بار ڈائلیسس سے گزرتے رہے۔ ادھر دو تین برسوں سے ہفتے میں دو مرتبہ ڈائلیسس ہونے لگا تھا۔ معاشی حالات دیگر گوں ہونے کے باوجود وہ اپنے علاج معالجے یا ڈائلیسس کے لیے میونسپل کارپوریشن یا خیراتی ہسپتالوں کو نہیں بلکہ میرا روڈ کے شاندار اور عالیشان ہسپتال 'اُمراؤ' ہی کو اولیت دیتے تھے۔ سبب مظفر حسین تھے۔ ان کے علاج معالجے کے تمام اخراجات مظفر حسین کا ٹرسٹ برداشت کرتا رہا تھا۔ ادھر لاک ڈاؤن سے ان کی طرزِ زندگی یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ لوگ باگ جو ملنے جلنے والے تھے اُن کا آنا جانا تقریباً بند سا ہو گیا تھا۔ معاملہ نقل و حمل کا تھا۔ بسیں اور ٹرینیں تو بند تھیں۔ لہٰذا اخراجات کے لالے پڑ گئے۔ سیّد نسیم احمد رائے بریلوی نے تو آنا ہی بند کر دیا، ممکن ہے بہ توسط موبائل مزاج پرسی کرتے رہے ہوں۔ رشید بشر، غیاث الدین، ظفر گڈّو، ثانی اسلم، عبدالجبار استاد، مکرّم علی، عظیم بھائی اور خاکسار حسبِ دستور اپنے اپنے وقت کی مناسبت سے کمال صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہوتے رہے۔ کمال صاحب ان دنوں کچھ زیادہ ہی پریشان پریشان سے رہنے لگے تھے۔ وجہ صاف تھی کہ جس کسی سے وہ فون پر رابطہ کرنا چاہتے تھے، اوّل تو وہ فون اُٹھاتا نہ تھا، خدا خدا کر کے اُٹھا بھی لیتا تو دو چار جملے ادا کرنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیتا۔ اس پر کمال صاحب جھنجھلا کر وہ وہ مغلظات بکتے کہ اللہ کی پناہ!

اب کیا کہوں میں جھوٹے سہاروں کی شان میں
شمعیں جلا رہا ہوں ہوا کے مکان میں

انھیں دنوں ان کے داہنے پیر کی اُنگلیوں کے پاس ایک چھوٹا سا زخم ہو گیا تھا۔ اگست کا مہینہ تھا، برسات اپنے پورے شباب پر تھی۔ تمام عالم اپنے اپنے گھروں میں دُبکا ہوتا تھا مگر آپ سارا دن کرسی لگائے اپنے اسٹال کے پاس چھپر تلے بیٹھے رہتے اور ہر کس و ناکس سے اپنی بے بسی اور مجبوری کا رونا روتے، یا پھر اپنے پیر کے اُس چھوٹے سے زخم کو کُریدنے کی کوشش کرتے۔ نتیجتاً آٹھ دس روز بعد پیر کا پنجہ سوج گیا۔ ایسا سوجا کہ چلنے پھرنے کے بھی

واقعی مجھے کمال جانسی کی حیات کے تیور میں تبدیلی کبھی دکھائی نہیں دی،وہ جیسے تھے تاعمر ویسے ہی رہے۔یہ الگ بات کہ داد کی صورت حادثوں نے انہیں متزلزل کرنے کی بارہا کوششیں کیں۔ لیکن مجال ہے جو بندہ کبھی ٹس سے مس بھی ہوا ہو۔خیر !واقعہ یہ ہے کہ کمال صاحب فقیری میں بھی اپنی شہنشاہی کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔جب مشاعروں کے عروج کا زمانہ تھا تو ان پر ہُن برستا تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔

لائق نہ رہے۔بیگم جانسی نے بجائے گھر میں پناہ دینے کے فرمان جاری کردیا کہ ہسپتال میں بھرتی ہوجاؤ۔بیگم کا فرمان کمال صاحب کے نزدیک کسی صحیفے کی اطاعت سے کم نہ تھا۔ چنانچہ ہسپتال جانے کی تگ ودو جاری ہوگئی۔ خیر! کمال صاحب کے لیے گھر میں کوئی گوشہ تو تھا نہیں، لہٰذا اُن کا مقدر ہسپتال کے بستروں میں اُلجھا ہوا تھا۔ کمال صاحب اُمراؤ ہسپتال میں بستر نشین ہوئے۔ ڈاکٹروں نے خون پیشاب کی طرح طرح کی جانچ کروائی، پھر آپریشن ہوا۔ دو لاکھ اسی ہزار کا صرفہ آیا، جسے مظفر حسین کے ٹرسٹ نے حسبِ معمول ادا کیے۔ پھر ہفتے بھر بعد جب باری ہسپتال سے چھٹی کی آئی تو بیگم صاحبہ نے لڑکے سے کہلا بھیجا کہ ''ابھی نہیں، ہفتہ دس دن اور رہنے دیں، تاکہ پیر میں کچھ جان پڑ جائے،اور چلنے پھرنے کے قابل ہوجائیں''۔ ہسپتال نے اس کارِ خیر کے لیے لاکھ روپے کا صرفہ بتایا تو چولیں ہل گئیں۔ خیر! پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

بے ساختہ مجھے اُن کا درج ذیل شعر یاد آیا جسے وہ ایّامِ جوانی میں مشاعروں میں خوب لہک لہک اور جھوم جھوم کے پڑھا کرتے تھے۔

کبھی حیات کے تیور بدل نہیں سکتے
ملی ہے داد بہت حادثوں کے گھر سے مجھے

واقعی مجھے کمال جانسی کی حیات کے تیور میں تبدیلی کبھی دکھائی نہیں دی، وہ جیسے تھے تاعمر ویسے ہی رہے۔ یہ الگ بات کہ داد کی صورت حادثوں نے انھیں متزلزل کرنے کی بارہا کوششیں کیں۔ لیکن مجال ہے جو بندہ کبھی ٹس سے مس بھی ہوا ہو۔ خیر !واقعہ یہ ہے کہ کمال صاحب فقیری میں بھی اپنی شہنشاہی کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ جب مشاعروں کے عروج کا زمانہ تھا تو ان پر ہُن برستا تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔

کمال جانسی کی ولادت 15 اپریل 1937 کو محلّہ خواجگان، قصبہ جانس، ضلع رائے بریلی میں ہوئی۔ والدِ محترم حضرت کوثر جانسی کا غالباً چھ دہائی قبل مُلک بھر میں خاصا شہرہ تھا۔ آپ کا شمار شعروسخن کے پیرومرشد میں ہوتا تھا۔ آپ گھر میں نئے مہمان کی آمد پر ایسے عش عش کر اُٹھے گویا رب العزت نے آپ کو شعروسخن کی سلطنت کے لیے جانشین عطا کردیا ہو۔ پھر کیا تھا،آپ نے اپنی تمام تر توجہ اس نونہال پر مرکوز کردی اور نام کمال احمد تجویز فرمایا۔ کہتے ہیں انسانی زندگی پر اچھے ناموں کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور نام ہی کی مناسبت سے خصلت و کردار کی پرداخت ہوتی ہے۔ اس نونہال پر بھی نام کا کمال ظاہر ہونے لگا اور کمال کا کمال اوجِ کمال پر پہنچنے کے لیے بیتاب ہوگیا۔ ابھی وہ عمر کی بارہویں منزل ہی پر تھا کہ شعر فہمی کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کی جانب بھی قدم بڑھانے لگا۔ والدِ محترم حضرت کوثر جانسی نے کمال احمد کے باطن میں موجزن جوہر کو محسوس کیا اور حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ نتیجتاً سترہ برس کی قلیل عمر میں یعنی 1954 میں پہلی غزل کہی اور اپنا نام نامی کمال احمد سے کمال جانسی کرکے باقاعدہ شاعری کا آغاز کردیا۔ پھر رفتہ رفتہ قصبہ، ضلع، ریاست ہی نہیں مُلک بھر میں آپ کے اشعار کی بازگشت سُنائی پڑنے لگی۔

پہنچی ہے جو ترتیب ادا تک تری تصویر
پندارِ مصور نے قلم چھوڑ دیا ہے

1958 میں پہلا کل ہند مشاعرہ کانپور میں پڑھا۔ آپ کے ترنم کے لیے اور لب و لہجے کی برجستگی نے وہ غضب ڈھایا کہ کانپور اور اطراف کے اضلاع میں آپ کے نام کی دھوم مچ گئی۔ پھر تو جہاں کہیں مشاعروں کا انعقاد ہوتا آپ کو ضرور بُلایا جاتا۔ رفتہ رفتہ دوسری ریاستوں میں بھی ان کے نام کی گونج سُنائی پڑنے لگی۔ پھر تین چار برسوں میں یہ نام مُلک کے چاروں کھونٹ میں گونجنے لگا۔

1970 میں کمال جانسی کا اوّلین شعری مجموعہ 'نامہ و پیام' شائع ہوکر مقبولِ عام ہوا۔ دوسرا مجموعہ 'سادہ ورق' 1984 میں شائع ہوا نیز تیسرا اور آخری شعری مجموعہ 'کہو کیا جواب دوں' 2006 میں شائع ہوکر داد و تحسین بٹورنے میں کامیاب ہوا۔ کہنے کو تو کمال صاحب کی تین کتابیں منظرِ عام پر آئیں، لیکن مواد ڈھنگ سے دو کتابوں کا بھی نہیں ہے۔ پہلی کتاب 'نامہ و پیام' کا بیشتر مواد بالخصوص نظمیں دوسری کتاب 'سادہ ورق' میں شامل کیا گیا ہے۔ یہی کیفیت تیسری کتاب پر بھی صادق آتی ہے۔ اب ایسا بھی نہیں کہ کمال صاحب سُست یا کم گو ہیں۔ بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کا زیادہ تر حصّہ روپئوں کی خاطر مالدار متشاعروں کے حوالے کردیا۔ وہ خود کہتے ہیں۔

شہرتوں کے طالب تُو اُداس کیوں ہے
آ، کمال سے پھر کچھ کلام لے جا

یہی سبب ہے جو وہ اپنے تازہ کلام رسائل و جرائد میں شائع کرانے سے ساری عمر احتراز کرتے رہے۔ اگر کبھی بھجوایا بھی تو وہی غزلیں یا نظمیں جو مجموعوں میں شامل ہیں۔ یہ ان کا منفی رویہ رہا ہے جس نے انھیں اُردو اکادمیوں نیز سرکاری اداروں کی مراعات سے دور رکھا۔

کمال جانسی محض میدانِ شعروسخن کے ہی مجاہد نہیں بلکہ ادبی صحافت کے بھی سپاہی رہے ہیں۔ 1970 میں آپ کی ادارت میں ماہنامہ 'چمن زار' کا اجرا ہوا جس کے محض 9/ شمارے شائع ہوئے اس کے بعد بند ہوگیا بعد ازاں پندرہ روزہ 'کلامِ ہند' جاری کیا۔ یہ بھی بارہ تیرہ شماروں سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

1958 میں والدِ محترم کے وسیلے سے کانپور کی 'ایلگن مل' نمبر1 میں کلرک ایگزامنر کے عہدے پر کپڑوں کی کوالیٹی جانچنے کے کام پر لگ گئے اور پوری ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ اپنا کام انجام دینے لگے۔ سال دو سال کام کرنے کے بعد انھیں احساس ہونے لگا کہ ساتھی مزدوروں کے ساتھ مالکان نیز اعلیٰ عہدیداران کی جانب سے کچھ حق تلفی ہورہی ہے تو ان کا دل رہ رہ کے تڑپنے

کمال جانسی محض میدان شعر و سخن کے ہی مجاہد نہیں بلکہ ادبی صحافت کے بھی سپاہی رہے ہیں۔ 1970 میں آپ کی ادارت میں ماہنامہ 'چمن زار' کا اجرا ہواجس کے محض9/ شمارے شائع ہوئے اس کے بعد بند ہوگیابعد ازاں پندرہ روزہ 'کلام ہند' جاری کیایہ بھی بارہ تیرہ شماروں سے آگے نہیں بڑہ سکا۔

لگتا، کیونکہ خدائے برتر و بالا نے انھیں ایک حسّاس دل عطا کیا تھا۔ اب اکیلا چنا تو بھاڑ پھوڑنے سے رہا۔ چنانچہ کافی تگ و دو اور حکمتِ عملی کے بعد مل کی یونین میں شامل ہوئے اور مزدور ساتھیوں کے لیے آوازیں اُٹھانے لگے۔ ان کی آواز اس قدر بلند اور پُر زور ہوتی کہ اربابِ مل اس پر کان دھرنے پر مجبور ہوجاتے اور مسئلہ حل کرنے ہی میں عافیت سمجھتے۔ ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر انھیں

بعد کو باقاعدہ طور پر یونین کا لیڈر منتخب کیا گیا۔ ان کی اسی لیڈرشپ نے انھیں 1962 میں نگر پالیکا کا الیکشن لڑنے پر مجبور کیا۔ یہ الگ بات کہ وہ ہار گئے۔

کہتے ہیں نا کہ کمال را زوال است۔ اس کمال کو بھی ایک روز زوال کا مُنہ دیکھنا ہی تھا۔ چنانچہ 90 کی دہائی نے انھیں زوال کے غار میں ڈھکیل دیا۔ حالانکہ 1990 میں ممبئی نے صابو صدیق گراؤنڈ میں جشنِ کمال کا شاندار اہتمام کر کے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس مشاعرے میں ملک بھر کے نامی گرامی شعراء کرام نے شرکت کی اور جشنِ کمال کی کامیابی کے ضامن بنے۔ اس جشن کا نشہ دو تین سال تک کمال صاحب کو سرور و انبساط کی چہار دیواری سے باہر نکلنے نہ دیا۔ لیکن روزی کا کیا؟ روزی تو مقدور بھر ہر ذی روح کو درکار ہے۔ یوں بھی بیٹھے بیٹھے کھانے سے قارون کا خزانہ بھی ایک نہ ایک دن ختم ہو ہی جاتا ہے۔ جب مشاعروں کا چاند مکمل گہنا گیا اور اس کی مست چاندنی کمہلانے لگی تو کمال صاحب کو آمدنی کی فکر لاحق ہوئی اور آپ اسی فکر کی اُنگلی تھامے 1995 میں کانپور سے سیدھے میرا روڈ (ممبئی) آن پہنچے۔ حالانکہ یہاں علم و ادب نیز شعر و سخن کی زمین انتہائی ناہموار اور بنجر تھی۔ لہٰذا زمین کو ہموار اور زرخیز بنانے کے لیے اسے اپنے تجربات کی نہر سے سینچا، وجدان کے ہل چلائے، جہالت کی خار دار جھاڑیوں کو اُکھاڑنے میں اُنا کی ہتھیلیوں کو لہولہان کیا۔ اسی دوران عبدالجبار اجمیری، اقبال سولنکی اور مصطفیٰ راٹھور سے یارانہ ہوا۔ ان تینوں میں صرف عبدالجبار اجمیری کو کچھ شعر و شاعری کا شغف تھا۔ ان تین ساتھیوں نے انھیں نہ صرف حوصلہ دیا بلکہ مالی مدد بھی کی اور 'میرا ایکتا کمیٹی' کے بنیاد گزاروں میں رہے۔ میرا ایکتا کمیٹی کے زیرِ اہتمام 2016 تک غالباً اٹھارہ کل ہند پیانے کے مشاعرے ہو چکے ہیں۔

کمال جاسی سے میری پہلی ملاقات معروف افسانہ نگار مظہر سلیم کے توسط سے 1998 کے اواخر میں ہوئی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ میں نے انور مرزا اور مبین راجو کے ساتھ مل کے میرا روڈ پہ ایک 'ایکٹنگ انسٹی ٹیوٹ' کا اجرا کیا تھا۔ فلیٹ مظہر سلیم نے دلوایا تھا۔ اُن دنوں میرا روڈ پر اس قدر گہما گہمی نہیں تھی۔ فلموں کے اسٹرگلرز کی یہاں بہتات تھی۔ ہمارا انسٹی ٹیوٹ سات آٹھ مہینے سے زائد نہیں چل سکا۔ آپسی چپقلش کے نتیجے میں بند کرنا پڑا تھا۔ بہر کیف! ان سات آٹھ مہینوں میں بمشکل تین یا چار ملاقاتیں کمال جاسی سے رہیں۔ اُن دنوں کمال جاسی ایس ٹی ڈی، پی سی او بوتھ چلاتے تھے۔ میرا روڈ اسٹیشن کے قریب ریلوے ٹریک سے مُلحق ان کا اسٹال ہے۔

اس دوران 'میرا ایکتا کمیٹی' کی بنیاد پڑ چکی تھی، مشاعرے کی منصوبہ بندی جاری و ساری تھی چندے کا اہتمام و انصرام چل پڑا تھا۔ اس کارگزاری میں عبدالجبار اجمیری پیش پیش تھے۔ اس لیے عبدالجبار اجمیری کا نام ہی زیادہ اُچھلتا تھا۔ خیر دو مشاعروں کے بعد ان کے نام کی دھوم کچھ زیادہ ہوئی تو مظفر حسین کے بھی کان بجنے لگے اور انھوں نے عبدالجبار اینڈ کمپنی کو بُلوا بھیجا۔ انھوں نے اپنا پیر و مرشد بنا کر کمال جاسی کو پیش کیا۔ مظفر حسین کمال جاسی کی سخن طراز شباہت، چشمِ غزل، رُباعی پیشانی، دوہا خصلت اور قصیدہ لبی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ ہی کا شعر آپ پر چسپاں کر دیا۔

یہ رازِ عبادت اے زاہد، برسوں میں کھلا دیوانوں پر
جو عشق سے نسبت رکھتا ہے، وہ کُفر بھی ایماں ہوتا ہے

بہر حال، میرا جب بھی میرا روڈ جانا ہوتا، کمال صاحب سے ملاقات ضرور کرتا۔ پھر نئی صدی یعنی 2006 میں از خود فلیٹ خرید لیا اور مع بال بچوں کے یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ پھر کیا تھا، آتے جاتے ملاقاتیں ہونے لگیں، راہ و رسم مزید مستحکم ہوئی۔ یہیں میری پہلی ملاقات اشہر نجمی سے بھی ہوئی۔ ان دنوں کمال صاحب کا تیسرا شعری مجموعہ 'کہو کیا جواب دوں' کی اشاعتی تیاریاں جاری تھیں۔ اس کی تمام تر ذمے داری حاجی رعب علی خان (واپی، گجرات) نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ کلام ترتیب دینے کا کام اشہر نجمی کے ذمے کا، جسے وہ پوری آب و تاب کے ساتھ انجام دینے میں لگے ہوئے تھے۔ بہر حال! کتاب شائع ہوئی، پھر ان کے شایانِ شان ایک کل ہند پیانے کے مشاعرے میں کتاب کا اجرا بھی ہوا۔

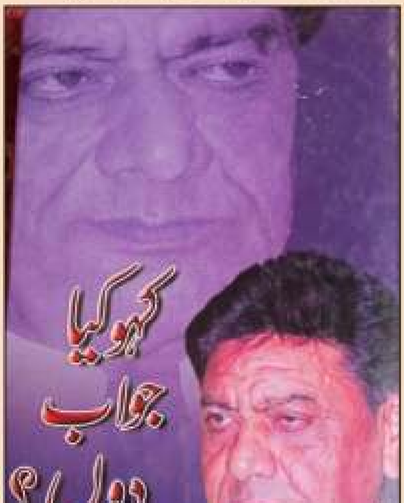

کمال صاحب کے رفقا بتاتے ہیں کہ کتاب کی اشاعت نیز مشاعرہ اور اجرا کے تمام اخراجات تن تنہا حاجی رعب علی خان نے برداشت کیے تھے۔ حاجی رعب علی خان کا شمار بڑے کاروباریوں میں ہوتا ہے نیز آپ کمال صاحب کے مداح و پرستاروں میں سے ہیں، ماشاء اللہ آج بھی بقیدِ حیات ہیں۔ آپ ایامِ نوجوانی سے کمال جاسی کی مترنم آواز کی سحر انگیزی اور لفظوں کی فسوں کاری میں یوں اُلجھے کہ بس!

کسی کی یاد کا نشہ فضا میں گھولتا رہا
اُداس رات تھی خموش چاند بولتا رہا

پھر کتنی اداس راتیں خموشی کی زنبیل میں غرق ہوئیں اور جانے کتنے چاند گفتار کے فلک پر روپوش ہوئے۔ لیکن یاد کا نشہ پوری آب و تاب کے ساتھ فضا میں سُرور آفرینی میں مست اپنی نوجوانی کے قصے لُٹاتا رہا۔

میں جب غازی نرسنگ ہوم پہنچا تو دیکھا رشید بشر دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے ہیں اور کمال صاحب کے عزیزان نیز احباب کو فون کے توسط سے اطلاع رسانی کا کام کر رہے ہیں۔ کمال صاحب کی بہن اور بھائی کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سیّد نسیم احمد، اکمل احمد اور عارف بھی آ گئے۔ انھیں کے پیچھے محشر فیض آبادی اور ثانی اسلم بھی تشریف لے آئے۔

اسی دوران ہسپتال کا عملہ آکر رشید صاحب کو بُلا لے گیا۔ رشید صاحب پانچ منٹ بعد باہر آئے۔ انھوں نے اعلان کیا "کمال صاحب نہیں رہے۔ اس روز تاریخ 27 دسمبر 2020 تھی اور وقت رات کے 9 بجنے میں کوئی تین چار منٹ کم رہے ہوں گے۔ اگلے روز یعنی 28 دسمبر 2020 کی صبح 11 بجے میرا روڈ کے قبرستان میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ جب ہم کمال صاحب کو منوں مٹی تلے دبا کر چلے تو میری آنکھیں جانے کیوں اشکبار ہو گئیں اور ذہن کے کسی گوشے سے اُن کا شعر گونجا۔

تم جلا دو کمال آنسوؤں کے دیے
زندگی رات ہے، رات ڈھل جائیگی

واقعی کمال صاحب کے لیے زندگی گزشتہ دو دہائیوں سے رات ہی رہی جو آج ڈھل گئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی صبح کو ملگجی نہیں بلکہ صاف و شفاف اور روشن کرے نیز کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین

■

Ishtiyaque Saeed
B-01- New Mira Paradise, Geeta Nagar,
Phase-II, Mira Road
Thane-401107 (Maharashtra)
Cell : 9930211461
E-mail : ishtiyaquesaeed@rediffmail.com

ف س اعجاز

شیکسپیئر کے گیارہ سانیٹس کا اردو ترجمہ

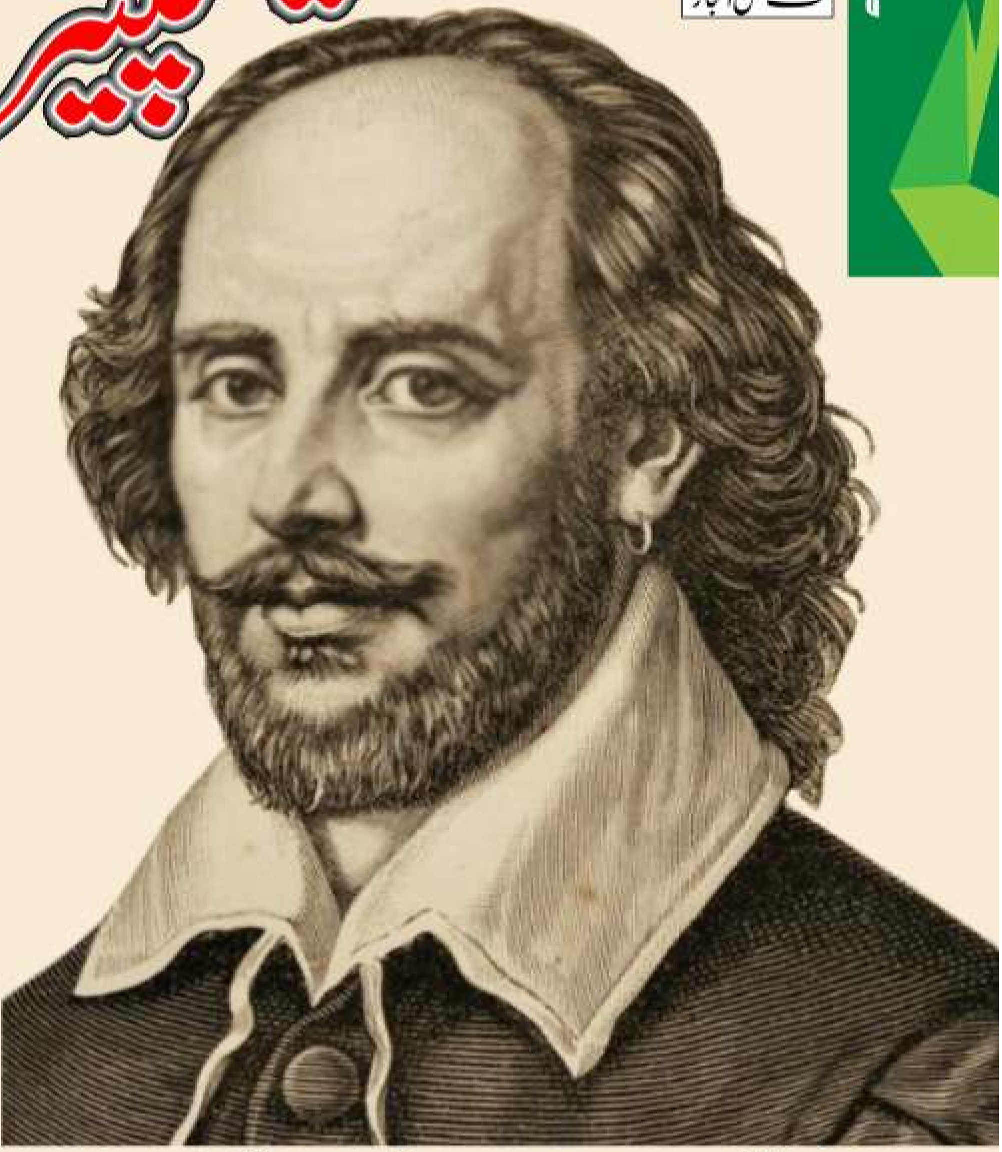

ولیم شیکسپیئر (1564-1616) کے 154 سانیٹوں کا شمار انگریزی کے سدابہار منظوم ادب میں ہوتا ہے۔اور اس کے سانیٹس میں عشقیہ سانیٹس (Love Sonnets) شاہکار قرار دیے جاتے ہیں۔ان میں نمبر 127 سے 154 تک کے 28 سانیٹس جو اس نے اپنی 'ڈارک لیڈی' (Dark Lady) کو منسوب کیے ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔یہ شیکسپیئر کی زندگی کے ایک خاص دور کا پس منظر بھی فراہم کرتے ہیں۔عجیب بات ہے تخلیقی ادب میں کالی عورت کو ایک الگ قابل ذکر مقام ملا ہے۔صوفی شاعر بابا بلّھے شاہ نے مجنوں کے تعلق سے کہا ہے۔

کیتا سوال میاں مجنوں نوں
تیری لیلیٰ رنگ دی کالی اے
دتا جواب میاں مجنوں نے
تیری انکھ نہ دیکھن والی اے

ٹیگور کی مصوری میں بھی ایک ڈارک لیڈی قابل ذکر ہے جس کا مفصل ذکر میں نے اپنی کتاب 'تھوڑا سا ٹیگور' میں ایک تحقیقی مضمون میں کیا ہے۔یہ سطریں لکھتے ہوئے مجھے اپنی ہی ایک کہانی 'یونس تنویر کا فلیٹ' (مشمولہ افسانوی مجموعہ 'پلوٹو کی موت') کے فریدہ نام کے حقیقی کردار کی یاد آرہی ہے۔میرا یہ سیاہ فام کریکٹر کہانی کے ناقدین نے بہت پسند کیا۔مگر ظاہر ہے کہ اپنے کالے رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے کردار یا سائیکی کی بدولت۔

بہر حال شیکسپیئر کی 'ڈارک لیڈی' کیا ہے،کون ہے یہ تحقیق بہت دلچسپ پیرائے میں میری فرمائش پر جناب ستیہ پال آنند صاحب (کنیڈا) نے مضمون کی شکل میں لکھی تھی' جو ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ' کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔شیکسپیئر کی یہ سیاہ عورت Lucy Negro تھی جو Black Luce کے نام سے بھی موسوم تھی۔لوسی نیگرو شمالی لندن کے کلرکین ویل چکلے کی بدنام رنڈی تھی جسے شیکسپیئر نے "My female evil" اور "My bad engel" گردانا ہے۔

بہر حال،شیکسپیئر کے سانیٹس سے اس کے اعلیٰ افکار ہی نہیں اُس کے اپنے کردار کے بھی کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔سانیٹ کا ترجمہ پابند سانیٹ میں بہت مشکل کام ہے۔اور پھر شیکسپیئر کے زمانے کی انگریزی میں لکھے گئے اس کے سانیٹس کا ترجمہ بہت کٹھن کام ہے۔ہندی میں تو شعری زبان یوں بھی آزاد ہے۔اس لیے ہندی میں ترجمے کے نام پر شیکسپیئر کے سانیٹس کا جو زبانی یا تحریری متن ملتا ہے اُسے اصل کی تشریح سے تو تعبیر کیا جا سکتا ہے، ہیئت کے اعتبار سے ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔شیکسپیئر کے سانیٹوں کا ترجمہ تھوڑی محنت سے کیا جا سکتا تو اب تک اس کے کئی سانیٹوں کا ترجمہ ہو چکا ہوتا۔میں نے بھی اب تک اس کے صرف 11 سانیٹ ترجمہ کیے ہیں۔پہلے دو ترجمے شیکسپیئر سَن سوسائٹی آف انڈیا کی دعوت پر 1989 شاعر کی 425 ویں سالگرہ کے موقع پر کیے تھے۔وہ تقریب کلکتہ کے روٹری سدن میں ہوئی تھی۔پھر مزید تین ترجمے کیے۔اُس کے بعد آنند صاحب کے مذکورہ تحقیقی مضمون کی Support میں ضرورتاً ایک سانیٹ ترجمہ کیا جو' ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ' کے دوسرے

شیکسپیئر کے سانیٹس سے اس کے اعلیٰ افکار ہی نہیں اُس کے اپنے کردار کے بھی کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔ سانیٹ کا ترجمہ پابند سانیٹ میں بہت مشکل کام ہے۔اور پھر شیکسپیئر کے زمانے کی انگریزی میں لکھے گئے اس کے سانیٹس کا ترجمہ بہت کٹھن کام ہے۔

ایڈیشن میں 'میرا گلاب' عنوان سے شامل ہوا۔ پھر کورونا کی وجہ سے لگے لاک ڈاؤن میں کرفیو کے دوران دیگر ادبی کاموں کے ساتھ پانچ سانیٹوں کا ترجمہ کیا۔ اصل متن کی چودہ سطروں میں رموزِ اوقاف (Punctuations) کو سمجھنا اور پھر اپنی زبان میں ان وقفوں کی گرہیں کھول کر اپنی زبان میں چودہ سطروں ہی میں گرہیں ڈالنا۔ مترجم کا دماغ الجھا دینے کے لیے بہت کافی ہے۔ یہاں کُل گیارہ سانیٹس کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ واضح رہے کہ شیکسپیئر کے سانیٹ بلا عنوان تھے۔ لیکن میں نے اردو قاری کی دلچسپی اور فہمائش کے لیے ہر ترجمے کو اپنا ایک من چاہا عنوان دیا ہے۔

حسن اور موسم گرما: سانیٹ نمبر 18

گرما کے دن سے میں کروں تیرا مقابلہ؟
تو دل رُبا زیادہ ہے اور معتدل ہے خوب
ہلتے ہیں گو شگوفے مئی کی ہوا سے خوب
گرمی کے دن زیادہ نہیں' کم ہے آسرا؟

چمکے ہے گرم آنکھ کبھی آسمان کی

جتنا سنہرا رنگ ہو سنولاتا ہے کبھی
ہر حسن اپنے رُتبے سے رگر جاتا ہے کبھی
ہو بات اتفاق کی' فطرت کی آن کی

مُرجھانے دے گی پر نہ جو گرمی ازل کی ہے
جو ملکیت ہے حسن کی وہ کھو نہ پائے گی
آوارگی پہ موت نہ شیخی دکھائے گی
تیری نمو میں پنہاں ترقی ازل کی ہے

جب تک تُو سانس لے سکے یا آنکھ دیکھ لے
جب تک کہ زندگی تجھے دے اور تُو جیے

چھایا کا تماشہ: سانیٹ نمبر 43

جب آنکھوں کو میں سب سے زیادہ ہوں جھپکتا
وہ چیزیں تکیں دن میں کہ عزت نہیں جن کی
پر سوؤں تو بس خواب میں دیکھیں وہ تجھے ہی
ظلمت میں جو چمکے سوئے ظلمت ہے لپکتا

تب تُو کہ تری چھایا کو چمکاتے ہیں سائے
بن پائے گا کیوں کر تیری چھایا کا تماشہ
اس دن میں کہ روشن ہے تو دن سے بھی زیادہ
نادیکھتی آنکھوں میں ترا سایہ چمک جائے

اُس نے میری آنکھوں کو ہے نعمت سے نوازا
دن زندہ ہے میں اس میں تجھے دیکھوں بہت صاف
اس گہری سیہ شب میں ترا سایۂ شفاف
جو نیند میں بے نوری آنکھوں پہ ہے ٹھہرا

دن لگتے ہیں راتیں، ترا دیدار کیے بن
تُو خواب میں آئے تو لگے رین مجھے دن

ظاہر سے جدا: سانیٹ نمبر 69

وہ پہلو ترا دنیا کی آنکھیں جسے دیکھیں
محتاج نہیں لوگوں کے کلماتِ رفو کا
سچ بول دے جب خلقِ خدا خود ترے حق میں
کلمہ پڑھے دشمن بھی ترے جوہرِ خو کا

ظاہر کو ملے ظاہری توصیف کا اک تاج
لوگوں کی زبانیں جو کبھی کرتی ہیں تائید
گر ٹھان لیں، کر دیتی ہیں عزت کو بھی تاراج
جب آنکھوں کو ہر بات سجھا دیتی تنقید

یہ دیکھنے لگ جاتی ہیں باطن کی حقیقت
اور تولنے لگ جاتی ہیں اچھے برے اعمال
اُجڈ کی طرح پھر نہیں کرتیں یہ مروّت
چاہے تو کسی پھول میں تو گھاس کی بو ڈال

لیکن تری خوشبو ترے ظاہر سے جدا کیوں؟
مٹی کا جنا چھوڑ کے مٹی کو اُگا کیوں؟

پُرانا سونا: سانیٹ نمبر 76

جانے کیوں ہیں میری نظمیں نئے رنگ سے خالی
ہر ہونی انہونی سے ہوں کیوں اتنا بیگانہ
سے کی بدلی دھارا دیکھوں، ایسی دُھنیں ڈالی
نئی نئی ترکیبوں سے ہوں میں بالکل انجانا

کیوں لکھتا ہوں جانے اب تک وہی ایک سے بول
وہی پرانا سبزہ میرا میدانِ تحقیق
اک اک اکشر پیٹے میرے اپنے نام کا ڈھول
کتنی دور کی راہی ہوگی میری ہر تخلیق؟

لیکن، میری جانِ تمنا! تیرے لیے ہی لکھتا ہوں
تُو اور تیری پیت ابھی تک میرا ایک سوال
اسی لیے تو شبد پرانے پھر سے سجاتا رہتا ہوں
تا کہ جس کو خرچ کیا، پھر خرچ کروں وہ مال

جیسے سورج روز نیا ہے جیسے روز پرانا
میری پیت کا کام ہے پچھلے قصے کو دہرانا

موسم کی تبدیلیاں: سانیٹ نمبر 104

میرے لیے تو کبھی نہ بوڑھی ہوگی اے محبوب
پہلے پہل جب تیری آنکھیں میری آنکھ نے دیکھی تھیں
تین سردیاں تین گرمیوں کا فخر ہلا کر گذریں
اب بھی تیرا حسن ہے لیکن پہلے جیسا خوب

تین حسین بہاریں زرد خزاں میں ہوئیں تبدیل
تین سال کے جُون جلا گئے تین اپریل کی خوشبو
آج بھی تُو سرسبز ہے لیکن آج بھی تازہ دم ہے تُو
میں نے یوں ہوتے دیکھی ہے موسم کی تکمیل

آہ تیرا یہ حسن گھڑی کے ہاتھ کے جیسا لگتا ہے
کچھ ہندسوں کو چُرا لیتی ہے پر معلوم نہیں ہوتا
تیرا میٹھا رنگ مجھے لگتا ہے اپنی جگہ ٹھہرا
لیکن وہ حرکت میں ہے، میری آنکھ کا دھوکا لگتا ہے

سُن اس خوف سے، عمر کا تیری کوئی نہیں ہے بھروسا
تُو جب پیدا ہوئی تھی تب ہی مر گیا حسن کا سرما

میرا گلاب: سانیٹ نمبر 109

جانِ من یہ کبھی نہ کہنا کہ میں دل کا جھوٹا تھا
گرچہ میرا غائب رہنا ایسا ثابت کرتا ہے
لیکن تیرا عاشق کیا یوں ہی تیرا دم بھرتا ہے
مرنا تھا تو تجھ سے جدا ہونا ہی خوب بہانا تھا

تیرا سینہ ہی میری چاہت کا گھر ہے، ٹھکانہ ہے
میں ہوں ایک مسافر ایسا، سے پہ جو لوٹ آئے
ایسے وقت نہیں آتا، جو اُس کا وقت بدل جائے
خود ہی پانی لاتا ہے، اپنے دھبّوں کو مٹاتا ہے

لوگوں کا تُو یقیں نہ کرنا، دیکھ تُو میری سُن
عیب جو میری فطرت میں تھے آپ ہی میں کہہ دوں
ہر وہ نقص تھا مجھ میں جس سے آلودہ ہو جائے خوں
لیکن کیسے چھوڑوں تجھ کو، تجھ میں سارے گُن

کائنات میں تُو ہے تو لگتا ہے اپنا سب کچھ ہے
تُو ہی تو وہ گلاب ہے جس کے اندر میرا سب کچھ ہے

مورکھ عشق: سانیٹ نمبر 137

اے مورکھ اندھے عشق یہ آنکھوں سے کیا کیا؟
وہ دیکھ کر نہ دیکھیں کہ کیا دیکھتی ہیں وہ؟
کیا حسن ہے کہاں پہ ہے یہ جانتی ہیں وہ
پھر بھی جو سب سے خوب اُسی کو برا کہا!

جڑوی نظر نے آنکھوں کو برباد کر دیا
چڑھتے ہیں سب جہاں اُسی کھاڑی پہ رُک گئیں
کذبِ نظر سے ایسے شکنجے میں جا پھنسیں؟
جس سے بندھا ہوا ہے میرے دل کا فیصلہ؟

کیوں سمجھے میرا دل اُسے اک مختلف مقام
جس کو کہے جہاں میں وہ اک عام سرزمیں؟
یا دیکھ کر کہیں مری آنکھیں 'یہ سچ نہیں'
سچائی گندے چہرے پہ رکھنے کا کیا ہے کام؟
یہ چشم و دل نے کیسے غلط کام کر لیے
طاعون کے مرض میں جو اب منتقل ہوئے

جھوٹا سچ: سانیٹ نمبر 138

جھوٹی قسموں کے سہارے وہ دلاتی ہے یقیں:
''سچ کہوں، کس لیے میں تم پہ بہت مرتی ہوں
تم ابھی تک ہو جواں اس لیے دم بھرتی ہوں''
اُس کی باتوں پہ مگر مجھ کو بھروسہ ہی نہیں

میں سمجھتا ہوں عبث وہ مجھے کہتی ہے جواں
اُس کو معلوم ہے کہ ہے مری مٹّی پہ زوال
اب جوانی ہے مری اُس کی ہی باتوں کا کمال
لاکھ اچھی لگے پر بات میں سچائی کہاں؟

پھر بھی وہ کہہ دے تو کیا کوئی غلط کہتی ہے؟
میں نے کب خود بھی کہا اُس سے کہ میں بوڑھا ہوں
پیار میں سچے بھروسے کے تحت زندہ ہوں
عشق میں عمر جوانی کی طرح بہتی ہے!

اس لیے جھوٹ رَوا رکھتے ہیں ہم آپس میں
اک خوشامد سی کیا کرتے ہیں ہم آپس میں

مکافات: سانیٹ نمبر 142

میری الفت پاپ ہے، تیری نفرت کا جنجال
میرے پاپ سے تُو نفرت کر، ہے جو مجرم پیار
دیکھ مری حالت کے آگے لیکن اپنا حال
اپنے حق میں دو بھی لفظ نہیں ملیں گے یار

مل بھی گئے تو تیرے منہ سے کب وہ ہوں گے ادا
پاپی لبوں نے لفظوں کے زیور کی عصمت لوٹی
اپنی محبت پر جھوٹے پیاں کی مہر لگا
جیسے میں نے غیروں کے بستر کی نعمت لوٹی

تجھ کو پیار کروں میں، جیسا تُو کرتا غیروں کو
ہو تیرے افسوس پہ ساری دنیا کو افسوس
تجھ کو میں اُس آنکھ سے دیکھوں جس سے تو اوروں کو
اِک پل اپنی نفرت پر تُو اپنے دل کو مسوس

اپنے عمل سے جس حق کا تُو کرتا ہے انکار
تجھ کو بھی وہ نہیں ملے گا ہرگز میرے یار

جاں بخشی: سانیٹ نمبر 145

وہ ہونٹ جنھیں پیار کے ہاتھوں نے بنایا
اُن ہونٹوں سے آواز چلی آتی تھی 'نفرت'
سن کر جسے کیا رنگ اڑا میرا خدایا
پر اُس نے جو دیکھی مری بگڑی ہوئی حالت
اک رحم سا محبوب کے دل میں اُبھر آیا
پلٹا دیا یوں شیریں و مشاق زباں کو
پھر موت کا عالم مجھے ٹلتا نظر آیا
دینے لگا دعوت وہ مری چشمِ جواں کو
'نفرت ہے مجھے' کہہ کے بدلنے لگا وہ بات
جنت سے جہنم کو چلے جیسے کہ شیطان
دن جیسے بڑے دھیرے سے بن جائے سیہ رات
جب دیکھ چکا وہ مرے اُڑتے ہوئے اوسان
'نفرت ہے مجھے' کہہ کے عجب آگ لگا دی
'پر تم سے نہیں' کہہ کے مری جان بچا دی

پرانا پاگل: سانیٹ نمبر 147

مری محبت بخار جیسی اسی کو اب بھی ترس رہی ہے
بہت دنوں تک بڑھائے رکھتا ہے جو مرض کو
مریض رہتا ہے جس کے چارے پہ زندہ دیکھو
وہ چارۂ بے یقیں ہمیشہ مٹی ہے روگی کی بھوک جس سے

یہ عقل میری، مری محبت کی جو معالج بنی ہوئی ہے
ہے اس پہ برہم کہ اس کا نسخہ کوئی بھی مانا نہیں گیا ہے
جو چھوڑ کر یہ مجھے گئی ہے تو میں نے اقرار اب کیا ہے
کہ ہے جو خواہش وہ موت ہے میرے تن سے جو کہ چمٹی ہوئی ہے

علاج ماضی ہوں اور ماضی کے دیکھنے میں لگا ہوا ہوں
پرانا پاگل ہمیشہ بدامنی پیدا کرنا شعار میرا
کہ اپنے افکار و گفتگو سے بگاڑ ہے کاروبار میرا
جو بات سچائی سے سوا ہے اسی کا اظہار کر رہا ہوں

تجھے جو قسما کہا ہے گورا، کہا ہے روشن ہے تیرا چہرہ
ہے تُو جہنم کے جیسی کالی، سیاہ شب سا ہے رنگ تیرا

■

Fay Seen Ejaz
Editor 'Mahnama Insha', B, Zakaria Street-25
Kolkata - 700073, Mob.: 9830483810

اردو شاعری میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و معاشرت

سجاد احمد نجار

اگر ہم ہندوستان کی مختلف زبانوں کی تاریخ پرھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ زبان سے کام لینے کے متعلق ہندو مسلمان کا فرق نہیں تھا. مسلمانوں نے برج بھاشا اور اودھی میں اُسی طرح تخلیقات کی ہیں جس طرح ہندوؤں نے. ہندوستانی ادب کی تاریخ میں قطبن، جائسی، رس کھان اور رحیم کے نام اُسی طرح احترام سے لیے جاتے ہیں جیسے تُلسی داس، سور اور میرا کے. اسی لیے اردو ادب کی تاریخ کو اس نظر سے پڑھنا چاہیے، ورنہ اس کی ثقافتی اہمیت سامنے نہ آسکے گی.

زبان انسان کے خیالات و جذبات کے وسیلے کا موثر اور بہترین ذریعہ ہے۔ قوموں کی شناخت کے پس پردہ اسی کا سب سے زیادہ عمل دخل رہتا ہے۔ انسان کی فطرت میں تغیر وتبدل کا حیرت کن مادہ پایا جاتا ہے۔ یہ تغیر نہ صرف معاشی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی طرز کا ہوتا ہے بلکہ ادبی لحاظ سے بھی اس کے مختلف عوامل بدلتے ہوئے حالات و واقعات کی روشنی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ امر غور طلب ہے کہ ہر عہد اپنے مخصوص لسانی ورثے کا پاس دار ہوتا ہے۔ اردو شعر و ادب میں گرونانک، تلسی داس، کبیر اور باقی دوسرے عظیم شاعروں اور مفکروں کی سوچ و فکر اور قلبی اظہارات حقیقتاً ہندوستانی سماجیات کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں یہاں کی تہذیب و ثقافت کے جو نغمے گائے ہیں، ان کی عصری معنویت نہ صرف مسلم ہے، بلکہ ہر دور کے شعرا نے اُن سے کسی نہ کسی طور اکتساب فیض کیا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں باقی دیگر زبانوں کے علاوہ اردو زبان و ادب کا اپنا مخصوص اور منفرد مقام حاصل ہے۔ اس میں گنگا جمنی تہذیب کی منہ بولتی تصویر نظر نواز ہوتی ہے۔ سنسکرت اردو اور ہندی زبانیں ہندوستان کے سر کے الگ الگ تاج ہیں۔ ساتھ ہی یہ تینوں زبانیں اس ملک کی تہذیب کی شناخت بھی ہیں۔ سید احتشام حسین ہندوستانی تہذیب کی تشکیل کے بارے میں اپنے خیالات کو لفظوں کی شکل کچھ اس طرح سے دیتے ہیں:

''سچ یہ ہے کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، سماجی ضرورتیں اسے رائج کرتی ہیں۔ اگر ہم ہندوستان کی مختلف زبانوں کی تاریخ پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ زبان سے کام لینے کے متعلق ہندو مسلمان کا فرق نہیں تھا، مسلمانوں نے برج بھاشا اور اودھی میں اُسی طرح تخلیقات کی ہیں جس طرح ہندوؤں نے۔ ہندوستانی ادب کی تاریخ میں قطبن، جائسی، رس کھان اور رحیم کے نام اُسی طرح احترام سے لیے جاتے ہیں جیسے تُلسی داس، سور اور میرا کے۔ اسی لیے اردو ادب کی تاریخ کو اس نظر سے پڑھنا چاہیے، ورنہ اس کی ثقافتی اہمیت سامنے نہ آسکے گی۔''

(اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2011، ص 17)

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان مختلف زبانوں کی آماجگاہ ہے اور ان تمام زبانوں کے طفیل یہاں کی تہذیب، کلچر اور ثقافت میں دلوں کو خوش کرنے والی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کی باقی زبانوں کی طرح اردو زبان و ادب میں بھی یہاں کی معاشرت کے زندہ مرقعے جا بجا نظر آتے ہیں۔

اردو کی شعری اصناف میں مثنوی کو غیر معمولی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ اردو کی بہترین صنف تصور کی جاتی ہے۔ مثنوی نگاروں نے جہاں مافوق فطری عناصر کا اس میں مظاہرہ کیا ہے، وہیں دوسری جانب اس صنف میں ہندوستانی اساطیر کی بے نظیر مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ان مثنویوں میں ان شعرا کے عہد کے رسم و رواج، مذہبی معاملات، کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لباس اور آرائش و زیبائش وغیرہ کا خوب

صورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثنوی سحرالبیان' قطب مشتری اور گلزار نسیم کے علاوہ باقی دوسری اہم مثنویاں یہاں کے ماضی کی تہذیب کی خوبصورت عکاسی کرتی ہیں۔ مثنوی 'سحر البیان' میں لکھنوی معاشرے کا دل اس انداز سے دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ قاری کو اپنی طرف کھینچنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس مثنوی میں ہندوستانی تہذیب خصوصاً لکھنؤ کی معاشرت کی صاف صاف جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی اس مثنوی میں پائی جانے والی ہندوستانی معاشرت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''سحرالبیان میں معاشرت نگاری لباس اور زیورات تک محدود نہیں، پورے جاگیردارانہ ماحول کو محیط ہے۔ محل کی سجاوٹ، خواصوں اور کنیزوں کی چہل پہل، خواتین کے رہن سہن، امیروں کت ٹھاٹ، شاہ، اس کے درباری اور خدام پالکی اور نالکی اٹھانے والے کہار (زربفت کی کرتیاں پہنے، تاس کی پگڑیاں باندھے اور ہاتھوں میں سونے کے موٹے موٹے کڑے ڈالے ہوئے) شاہی جلوس میں شادیانے بجانے والے نقارچی، ہٹو بڑھو کی صدا لگانے والے نقیب و چوبدار، ولادت کے موقع پر بھانڈ، کنچنی چونہ پرنی ارباب نشاط وغیرہ کی موجودگی، شہزادے کی تربیت کے لیے اتالیق، منشی، ادیب کی تقرری... وغیرہ کے رواج اور مختلف رسوم کا کم وبیش ذکر ملتا ہے۔''

(مثنوی سحرالبیان، مرتب ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2013، ص 40)

اردو شاعری میں اس طرح کی عمدہ مثالیں مثنویوں کے بعد آنے والی منظوم شاعری خصوصاً نظم اور غزل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک نظم نگاری میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کے اظہار کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عادل شاہی اور قطب شاہی عہد کے شعرا سے لے کر نظیر اکبرآبادی کے زمانے تک کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا عکاس ہے۔ نظیر اکبرآبادی جو کہ عوامی شاعر کہلاتے ہیں، کا نام کئی لحاظ سے انفرادیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندوستان کی معاشرت کے دلکش نمونے پیش کر کے یہاں کی ملی وحدت کو قائم کرنے کی بے لوث پہل کی۔ اُن کی شاعری میں اس سرزمین کی معاشرت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ جہاں مسلمانوں کے مذہبی تہوار پر نظمیں کہتے ہیں وہیں انھیں ہندو برادری سے تعلق رکھنے والی مذہبی رسومات کو پیش کرنے میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ نظیر ایک آزاد

جہاں تک نظم نگاری میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کے اظہار کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عادل شاہی اور قطب شاہی عہد کے شعرا سے لے کر نظیر اکبر آبادی کے زمانے تک کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا عکاس ہے۔ نظیر اکبر آبادی جو کہ عوامی شاعر کہلاتے ہیں، کا نام کئی لحاظ سے انفرادیت رکھتا ہے۔

منش انسان تھے۔ ان کے دل میں ہندوستان کے ہر ایک طبقے کے لیے محبت تھی، اسی لیے ان کے ہاں مختلف سماجی طبقات کے افراد کے حرکات وسکنات کا خوب صورت میلان نظر آتا ہے۔ نظم ''ہولی'' کے اس بند میں دیکھیے کہ کس طرح نظیر ہولی کی خوشی کے منظر کو باندھتے ہیں۔

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودیں ہیں کچھ اچھلیں ہیں کچھ ہنستے ہین کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

میر اور نظیر ہم عصر شاعر تھے۔ نظیر کی طرح میر کی شاعری میں اس زمانے کی دلی کے خد و خال نظر آتے ہیں۔ میر کا زمانہ پر آشوب رہا ہے اور اس کا اثر آپ نے جلدی قبول کرلیا۔ جس دلی سے انھیں پیار تھا اسی کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ بقول میر۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
خاک بھی سر پر ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

اس کے بعد بھی میر کے کلام میں تصوف، انسان دوستی، عشق ومحبت اور خلوص وصداقت وغیرہ جیسے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ یہی چیزیں ہندوستان کی تہذیب کے اجلے نمونے ہیں۔ دلی کی ویرانی کے بعد اردو شعر و ادب کی محفلیں شہر لکھنؤ میں سجتی ہیں اور اس طرح ان کی شاعری میں اس وقت کے لکھنؤ کی معاشرت جلوہ گر ہوجاتی ہے۔ فنی، فکری اور تہذیبی لحاظ سے دبستان دلی لکھنؤ کی ضد تھی، البتہ بعد میں محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری اور انیس و دبیر کی رثائی شاعری کی وجہ سے وہاں کے شعری مزاج میں قدرے سنجیدگی نظر آگئی۔ ان

شاعروں کے یہاں اگر چہ اسلامی طرزِ فکر پائی جاتی ہے۔ تاہم انھوں نے اس میں بھی ہندوستانی سماج اور معاشرت کی منظرکشی کی ہے۔ محسن کاکوروی کے بارے میں ابواللیث صدیقی یوں رقم طراز ہیں:

''محسن خالص ہندوستانی فضا کے شاعر ہیں اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔''

(لکھنؤ کا دبستان شاعری حصہ دوم، عفیف پرنٹرس دہلی، 2013، ص 160)

غالب اردو کے بلند پایہ سخنور ہیں۔ ان کی شاعری زمان ومکان کی حد بندیوں سے بے نیاز ہے۔ وہ چوں کہ ایک خوش باش انسان تھے اور دوسروں کو بھی خوش ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے مکتوبات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ کس قدر اپنے معاشرے سے لگاؤ رکھتے تھے۔ انھوں نے جس ماحول میں رہ کر سانس لی، اسی ماحول کے وہ پاس دار بھی رہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں ہندوستان کے تہذیبی اور ثقافتی اجزا کا اظہار ملتا ہے۔ غالب کا عہد مسلسل مختلف سماجی تبدیلیوں کا زمانہ تھا، یعنی اس وقت کا ہندوستان ایسی کروٹ بدل رہا تھا کہ ایک طرف سامراجی قوتیں اپنا زور آزما رہی تھیں اور دوسری جانب تہذیب وتمدن کی جڑیں کمزور ہوتی جارہی تھیں۔ اس دوران بھی غالب اپنے کلام کے ذریعے ہند مغل جمالیات کے پھول کھلا رہے تھے۔ پروفیسر شکیل الرحمن غالب کی شاعری میں پائے جانے والے ہندوستانی عناصر کے تعلق سے اپنی کتاب 'مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات' میں لکھتے ہیں:

''غالب جہاں مشترکہ ہندوستانی تہذیب اور ہند مغل جمالیات کی داستانی روایتوں اور قدروں سے تخلیقی رشتہ رکھتے ہیں وہاں اس تہذیب اور اس کی جمالیات کی مصوری، مجسمہ نگاری اور بت تراشی اور رقص سے بھی ان کا تخلیقی رشتہ قائم ہے۔''

(مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، پروفیسر شکیل الرحمن، غالب اکادمی نئی دہلی، 2011، ص 97)

غالب اردو کے بلند پایہ سخنور ہیں۔ ان کی شاعری زمان و مکان کی حد بندیوں سے بے نیاز ہے۔ وہ چوں کہ ایک خوش باش انسان تھے اور دوسروں کو بھی خوش ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے مکتوبات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ کس قدر اپنے معاشرے سے لگاؤ رکھتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ ہندوستان مختلف مذاہب کا مسکن ہونے کی وجہ سے تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے مالا مال ہے۔ اردو شاعری کے ذریعے اس تہذیب کے نقوش اردو شاعروں نے ہر دور میں اپنی شاعری میں ابھارے ہیں۔ اس سلسلے میں 'انجمن پنجاب' سے وابستہ قلم کاروں کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آزاد، حالی اور شبلی اس انجمن کے متحرک رکن تھے۔ اس انجمن کے تحت جتنی بھی نظمیں لکھی گئیں ان تمام نظموں میں ہندوستانی معاشرے کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔ شب قدر، برسات، برکھا رُت، آب کرم، ابر کرم، صبح امید، حب وطن، نشاط امید اور مناظرہ رحم و انصاف وغیرہ جیسی نظموں میں ہندوستان کی تہذیب کے شب و روز نمایاں ہوتے ہیں۔ حالی کی نظم 'برکھارت' کے چند اشعار ذیل میں دیکھیے کہ ان میں کس طرح شاعر نے ہندوستانی کلچر کو لفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔

سہم باغوں میں جا بجا گرے ہیں
جھولے ہیں کہ سو بہ سو بڑے پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن
جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی
جنگل و ہیں سر پہ وہ اٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے
اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے ان میں کوئی ملہار گاتی
اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کوئی کبھی ہنڈولا
کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا

سرور جہاں آبادی، اکبرالہ آبادی، چکبست اور علامہ اقبال کی شاعری میں ہندوستان کے مختلف سماجی عناصر کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ سرور نے اپنے وطن کی محبت کے گیت گائے اور ساتھ ہی اس زمین کی شادابی، رنگینی اور فطرت کو بھی پیش کیا۔ اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے

اردو شاعری کے ذریعے اس تہذیب کے نقوش اردو شاعروں نے ہر دور میں اپنی شاعری میں ابھارے ہیں۔ اس سلسلے میں 'انجمن پنجاب' سے وابستہ قلم کاروں کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آزاد، حالی اور شبلی اس انجمن کے متحرک رکن تھے۔

عوام کو ایک نیا پیغام دیا۔ انھوں نے مغربی اور جدید طرز فکر سے بچنے کی تلقین کرنے کے علاوہ ہندوستانی تہذیب سے اپنا رشتہ مضبوطی کے ساتھ استوار کرنے پر زور دیا۔ اکبر کی شاعری زمینی حقائق سے تعلق رکھتی ہے اس لیے ان کے نزدیک ہندوستان کی عظمت پہلا مسئلہ ہے۔

چکبست نے اپنے وطن پر نظمیں لکھ کر گویا یہ ثابت کر دیا کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ وہ اپنی نظموں کے ذریعے اہل ہند وطن سے وفا کرنے کا سبق سکھاتے ہیں۔ چکبست اپنی حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے اس لیے اس کی گونج ان کی شاعری میں اول تا آخر سنائی دیتی ہے۔ ان ہی کا یہ شعر ہے۔

مٹی ہیں گل جو اور کسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گلشن ہندوستاں کے ہیں

تقسیم ملک سے پہلے علامہ اقبال کی شاعری ہندوستان کی تعمیر وتشکیل اور اس کی تہذیبی و معاشرتی ہم آہنگیوں کے سلسلے میں انفرادیت رکھتی ہے۔ اقبال پیامی شاعر بھی ہیں اور وطنی بھی، ان کے ہاں انسانیت کا درس بھی ملتا ہے اور وہ اتحاد و اتفاق کے علم بردار بھی ہیں۔ نظم 'ترانۂ ہندی' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ہندوستانی معاشرت کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کے سلسلے میں فراق گورکھپوری کی غزلیات و رباعیات کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی دیومالائی عناصر کا بہترین برتاؤ پایا جاتا ہے۔ ہندی اور سنسکرت سے انھیں گہری دلچسپی تھی، ان دونوں زبانوں کا استعمال وہ اپنے اردو کلام میں اس طرح سے کرتے ہیں کہ ان کے ہاں ہندوستانی تہذیب و معاشرت اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔

فراق کی رباعیوں کا مجموعہ 'روپ' ہے۔ اس مجموعے میں فراق کا گرد و پیش اور اس سے سروکار تہذیبی عناصر کا دلکش میلان نظر آتا ہے۔ وہ شعر کہتے وقت اپنے آس پاس کے ماحول سے باخبر رہتے ہیں۔ انھیں ہندوستان اور اس کی تہذیب کا بھرپور احساس ہے۔ ان کی شعری جمالیات میں ہندوستانی معاشرت کو ایک خاص مقام و منزلت حاصل ہے۔ ڈاکٹر کامل قریشی اپنے مضمون 'فراق کی غزل گوئی' میں فراق کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فراق شعر کہتے وقت بھی اپنے ماحول سے بیگانہ نہیں ہوتے، انھیں ہندوستان، ہندوستانیت اور اپنی قومی زندگی کا ہمیشہ احساس رہا، ان کے ہاں رموز شاعری کے طور پر وطنی تہذیب وتمدن اور ملکی دولت ونعمت کے خزانے بکھرے پڑے ہیں۔ وہ جس آب و ہوا میں سانس لیتے ہیں اور جس مٹی سے ان کا خمیر تیار ہوا ہے اس کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس سے انھیں والہانہ عشق ہے۔''

(اردو غزل، مرتب ڈاکٹر کامل قریشی، شوبی آفسیٹ پریس دریا گنج نئی دہلی، 2013، ص 221)

ہندوستانی معاشرت کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کے سلسلے میں فراق گورکھپوری کی غزلیات و رباعیات کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی دیومالائی عناصر کا بہترین برتاؤ پایا جاتا ہے۔ ہندی اور سنسکرت سے انہیں گہری دلچسپی تھی، ان دونوں زبانوں کا استعمال وہ اپنے اردو کلام میں اس طرح سے کرتے ہیں کہ ان کے ہاں ہندوستانی تہذیب و معاشرت اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔

موجودہ دور کو جدیدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ دور ہے۔ اس میں انسان اپنے سماج اور سماج کے باقی تشکیلی عناصر سے لاتعلقی کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ جدیدیت کی ہوا مغرب سے اس تیزی کے ساتھ چلی کہ اس نے مشرق کو آناً فاناً اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہندوستانی معاشرے میں اس کی لہریں ٹھاٹھیں مارتی نظر آتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہاں بھی معاشرتی نظام میں نئی نئی تبدیلیاں آئے روز جنم لے رہی ہیں۔ اعلیٰ انسانی اقدار جن میں رشتوں کی اہمیت، مذہب کا لحاظ، تہذیب کی اہمیت اور باقی اساطیری پہلو شامل ہیں زوال کا شکار ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ زمینوں کے نقشے پوری طرح سے بدل رہے ہیں۔ یہاں کی تہذیب مغربی تہذیب میں ضم ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ انسان تنہائیوں کا شکار نظر آرہا ہے۔ سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی دوریوں کا احساس ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود بھی ہمارے شعرا لوگوں کو سماج اور تہذیب کے ساتھ جوڑنے کے کام میں مگن ومصروف ہیں۔

■

Sajad Ahmad Najar
Gh Mohd Najar
Washbugh Pulwama -192301 (J&K)
Email: shaadsajad864@gmail.com
Mob.:9858667464

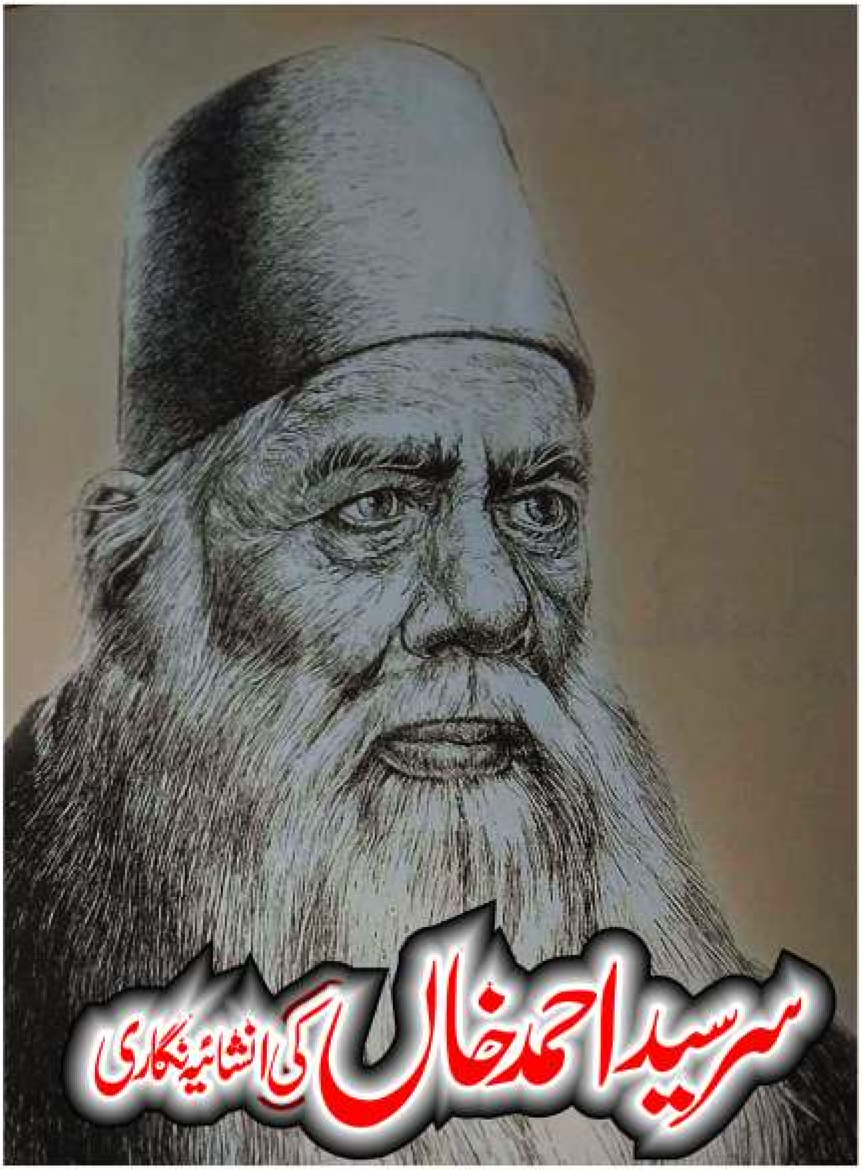

سرسید احمد خاں کی انشائیہ نگاری

محمد علی عالم

انشائیہ نگاری کے ذریعے سرسید نے اہم مقصد اور اس کی تکمیل کے لیے بھرپور کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے کئی مقاصد کی تکمیل کے لیے لندن کے سفر کا ارادہ کیا۔ اس دور تک سرسید احمد خاں نے ہندوستان میں بسنے والی مسلمان قوم کے باشندوں کو ہی نہیں، بلکہ ملک میں اقتدار پر قابض انگریز قوم کو احساس دلانے کے لیے مختلف کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی کتابیں 'تاریخ سرکشی بجنور' اور 'اسباب بغاوت ہند' کی اشاعت سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس دور کے تقاضوں کے خلاف تحریر کو مقصد سے وابستہ کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ سرسید کے دور تک باضابطہ داستانیں لکھنے کا رواج تھا، جس سے عوام کی دل بہلائی اور ان کی وقت گزاری کے لیے مشغلہ دستیاب تھا۔ جبکہ سرسید نے اپنی تحریروں کو مقصدی بنانے کے لیے یہ کوشش کی کہ ظلم وستم کے رویے کو روکا جائے۔ اس مقصدی پس منظر میں 'تاریخ سرکشی بجنور' اور 'اسباب بغاوت ہند' بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

سرسید کی مقصدیت کا انداز ان کے تمام انشائیوں میں حد درجہ گہرا نظر آتا ہے۔ اگرچہ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے مضامین کو اس صنف کی حیثیت سے پیش نہیں کیا اور اسے کسی قسم کے نام سے بھی وابستہ نہیں کیا، لیکن یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے اپنے انشائیوں میں جس قسم کا اسلوب اختیار کیا ہے اور انشائیوں کے مواد میں جن خصوصیات کو شامل کرکے یہ مضامین تحریر کیے ہیں، اس میں موجود مقصدیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ جب انھوں نے لندن کا دورہ خاص مقصد کے لیے کیا اور ولیم میور کی کتاب کے جواب کے طور پر اپنی مشہور کتاب 'خطبات احمدیہ' لکھ کر اس کتاب کے ذریعے پیغمبر اسلام پر لگائے جانے والے الزامات کا خاتمہ کرکے اس کتاب کو انگریزی میں ترجمہ کروایا اور تمام انگریز عہدیداروں کو یہ کتاب بھجوائی تاکہ پیغمبر اسلام کے بارے میں پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ ہوجائے۔ اس اعتبار سے سرسید کی ہر تحریر میں مقصدیت کا عنصر غالب ہے، چنانچہ لندن کے سفر سے لے کر وابستگی تک انھوں نے کوئی بھی کام بغیر مقصد کے انجام نہیں دیا اور واپسی کے بعد باضابطہ اپنے رسالے کو انگریزی ادب کے معروف مضامین سے آراستہ کردیا، اگر سرسید کے لکھے ہوئے مضامین جو آج انشائیے کی حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی تحریروں میں موجود انشاپردازی کے علاوہ مقصدیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ عصر حاضر میں ادب کی مقصدیت کے سلسلے میں کئی سوالات اٹھائے جاچکے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر باضابطہ یہ انداز واضح ہوچکا ہے کہ ادب میں اخلاقیات اور مقصدیت کا اثر کارفرما ہو، تو بلاشبہ ایسا ادب، ادب نہیں، بلکہ پروپیگنڈہ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جس کے تحت یہ بتایا گیا کہ ادب کو تخلیق سے مربوط ہونا چاہیے، بلکہ اسے کسی بھی طرح مقصدیت اور اخلاقیات کا علمبردار نہیں بنایا جانا چاہیے۔ اس قسم کے تاثرات کے پس منظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو میں سب سے پہلے انشائیہ کی صنف کو فروغ دینے والے سرسید احمد خاں نے اردو ادب میں اس صنف کا آغاز کیا، تو اس کے توسط سے مقصدیت کو پیش نظر رکھا۔ اس مقصدیت کا نتیجہ یہ رہا کہ اردو ادب میں اس صنف کی مقبولیت کو فروغ حاصل ہوا۔ غرض حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ سرسید احمد خاں کو اپنے عہد میں سماجی بھلائی کے کام کرنے کا موقع ملا اور ان کی فطرت میں اصلاحی خصوصیات موجود تھیں، اسی لیے انھوں نے اپنی ہر تحریر کے ذریعے اصلاح معاشرہ اور اصلاح ملک وقوم کے ساتھ ساتھ مسلم معاشرے میں درآنے والے غلط خیالات کی اصلاح اور اردو داں طبقہ میں پھیلنے والے غلط افکار کو دور کرنے کے لیے پوری کوشش کی، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس حوالے سے سرسید کی

خدمات اور ان کی مقصدیت کو نمائندگی دی جاسکتی ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم رقمطراز ہیں:

''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی، عظیم رہنما سرسید احمد خاںؒ مرحوم کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے ایک بڑے علم بردار تھے اور انھوں نے ہندوستانی قوم میں بیداری اور علمی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ انیسویں صدی کے بہت بڑے مصلح اور رہبر تھے۔ انھوں نے ہندوستانی قوم کو جمود سے نکالنے اور انھیں باعزت قوم بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی۔ وہ ایک زبردست مفکر، بلند خیال مصنف اور جلیل القدر مصلح تھے۔ انھوں نے اپنی قوم کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب زمین ان پر تنگ تھی اور انگریز ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اُن کی جائیدادیں ضبط کرلی گئیں تھیں۔ نوکریوں کے دروازے ان پر بند تھے اور معاش کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ سرسیدؒ دیکھ رہے تھے کہ اصلاح احوال کی اگر جلد کوشش نہیں کی گئی تو قوم سائیس، خانساماں، خدمت گار اور گھاس کھودنے والوں کے سوا کچھ اور نہ رہیں گے۔''

(ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' جشن سرسید 2017، مدیر صغیر افراہیم، ص نمبر 325 تا 326)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے اپنی زندگی کا مقصد مقرر کرلیا تھا اور انھوں نے اپنی تمام تحریروں کو مقصدیت سے وابستہ رکھا۔ اس اعتبار سے ان کے لکھے ہوئے مضامین جو عصر حاضر میں انشائیے کی حیثیت سے مقبولیت رکھتے ہیں، ان تمام انشائیوں میں باضابطہ طور پر سرسید کے افکار اور ان کی مقصدیت کے ساتھ ساتھ مشرقی تہذیب و شائستگی کی خوبی اور ایشیائی مزاج کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ براعظم ایشیا میں بسنے والے باشندوں کی زندگی کی خصوصیت جلوہ گر ہے، جس کے نتیجے میں سرسید کے انشائیوں کو باضابطہ مقصد کی تکمیل کرنے والے انشائیے قرار دیا جائے گا۔ البتہ یہ امر بحث طلب ہے کہ سرسید نے اپنے انشائیوں میں مقصدیت کو پیش نظر رکھا ہے، تو عصر حاضر میں لکھے جانے والے انشائیوں میں مقصدیت کو نمائندگی دینا مناسب ہے یا نہیں، اس سلسلے میں بلاشبہ نئی بحث اور اس کے امکانات پر غور کیا جاسکتا ہے سرسید نے بلاشبہ اپنی تحریروں کا مقصد یہی بنایا تھا کہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو اور مذہب کے نام پر پھیلنے والی جہالت کو دور کیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسرے طبقات میں مسلمانوں کے خلاف پیدا ہونے والی بدگمانیوں کو ختم کرنا سرسید احمد کا اولین مقصد تھا۔ اس طرح سرسید تحریک، ان کی تعلیمی تحریک اور علی گڑھ کے قیام سے لے کر تمام سوسائٹیوں کا قیام اور علی گڑھ میگزین کے علاوہ اورینٹل میگزین کے ساتھ ساتھ تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور اس کے ذریعے پیش ہونے والے مضامین بھی بے مقصد نہیں تھے۔ سرسید کی مقصدیت اور ان کی عملی کوششوں کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی کیا جاسکتا ہے۔

''سرسید احمد خاں کو ہر لحہ مسلمانوں کی جہالت، کم مائیگی اور تہذیب و شائستگی سے دوری کی فکر رہا کرتی تھی، اس لیے انھوں نے مذہبی طور پر ان کے اندر سائنسی فکر پیدا کرنے کے لیے قرآن مجید کی تفسیر لکھی اور قرآن و سنت کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے خطبات احمدیہ لکھی۔ وہ اس بات سے بھی غافل نہیں تھے کہ اگر ولیم میور جیسا کوئی انگریز The Life of Mohammed جیسی کتاب لکھ کر ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدگمانیاں عام کرنا چاہتا ہے تو اس کا جواب دینا بھی کس قدر ضروری ہے۔ سرسید نے اپنی زیادہ تر جائیداد فروخت کر کے اس مقصد سے انگلینڈ کا سفر کیا اور وہاں جاکر بنیادی حوالوں کی مدد سے ولیم میور کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اپنے مقصد پر نگاہیں مرکوز رکھنے کے باوجود وہ ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح کی فکر سے وہاں بھی غافل نہیں رہے اور جب ان کو وہاں پتہ چلا کہ ولایت میں بھی توہم پرستی کو دور کرنے کے لیے اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر جیسے اخبار اور رسالے نکلا کرتے تھے تو انھوں نے بھی وہیں یہ طے کرلیا کہ ہندوستان واپس جاکر وہ بھی اپنی ملت کی اصلاح کے لیے کوئی نہ کوئی رسالہ ضرور شائع کریں گے۔ تہذیب الاخلاق کی اشاعت دراصل اسی منصوبے کا حصہ تھی۔ رسالہ تہذیب الاخلاق میں وہ مسلم قوم کی توہم پرستیوں اور جہالت کی صورت حال کو بدلنے سے متعلق مضامین شائع کرنے لگے۔ ان کے بیشتر اصلاحی مضامین اس زمانے میں تہذیب الاخلاق میں ہی چھپے مگر سرسید محض اسی پر بس کرنے والے کب تھے، انھوں نے اخلاقی حد پار کی کوششوں کے بعد اپنے غیر معمولی تعلیمی منصوبے پر سوچنا اور اس سے متعلق عملی اقدامات کرنا شروع کردیے۔ ان عملی اقدامات میں مدرستہ العلوم کا قیام تمام چیزوں پر مقدم تھا۔ شروع میں علی گڑھ میں قائم ہونے والا ایک چھوٹا سا مدرسہ یا اسکول تھا مگر اس کی بنیاد میں تعلیم کو فروغ دینے کا ایک ہمہ جہت مقصد کرفرما تھا،،

حوالہ (ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' جشن سرسید 2017، مدیر صغیر افراہیم، ص نمبر 253 تا 254)

اس اقتباس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید نے کسی بھی منصوبے یا پروگرام کے لیے بنیادی مقصد کا تعین کرلیا تھا۔ وہ اصلاح پسند جذبہ کے حامل تھے اور ان کا مقصد مشرقی تہذیب کو اہمیت دینا اور ملی جلی تہذیب کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے دو بڑی قوموں میں اتحاد پیدا کرکے ان کی تعلیمی اور ذہنی ترقی کے لیے اہم کام انجام دینا تھا، مسلم معاشرے میں تیز رفتاری کے ساتھ پھیلنے والی توہم پرستی اور مذہب کے نام پر روایات اور اعتقادات کو فروغ دینے سے روکنا بھی سرسید کے مقاصد میں داخل تھا۔ اسی طرح سرسید نے ہندوستان کی سرزمین میں مسلمانوں کے ذریعے انگریزوں کے بارے میں نفرت اور اس قوم کے رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے مضامین لکھے اور انھیں 'تہذیب الاخلاق' میں شائع کیا، اس لیے اگر 'تہذیب الاخلاق' کے انشائیوں کو مقصدی رویے کا حامل قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ غرض ہندوستان کی سرزمین میں سرسید احمد خاں نے اپنے قلمی جہاد کے توسط سے انشائیہ نگاری کی بنیاد رکھی۔

■

Mohd Ali Alam
Village: Lal Parsa,
Post: Bahri Bankatwa
West Champaran - (Bihar)
Mob.: 6205246947

ایکسل میں چارٹ بنانا
(Drawing Chart in Excel)

ایم ایس-ایکسل میں کسی ورک شیٹ میں بھرے ہوئے ڈاٹا کی بنیاد پر متعدد قسم کے دو یا تین ابعادی چارٹ آسانی سے بنائے جاسکتے ہیں۔ آپ Insert ٹیب کے Charts حصے کے ذریعے اپنی خواہش کے مطابق کیسا بھی چارٹ بنا سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، ایک بار چارٹ بن جانے کے بعد آپ اسے چھپوا سکتے ہیں، درست کرسکتے ہیں اور ایکسل سے باہر کے پروگراموں، جیسے ایم ایس- ورڈ یا پاور پوائنٹ میں بھی لے جاسکتے ہیں۔

ایکسل کے چارٹوں میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جب بھی آپ اس ڈاٹا میں کوئی تبدیلی کرتے ہیں، جس پر چارٹ مبنی ہے، تو متعلقہ چارٹ میں وہ تبدیلی فوراً کردی جاتی ہے یا ایسا کرنے کے لیے پوچھا جاتا ہے۔

یہاں ہم صرف دو ابعادی (Two-dimensional) چارٹ بنانے کے بارے میں بتائیں گے۔

ہر ایک دو ابعادی چارٹ میں دو محور (Axis) ہوتے ہیں۔ X-محور اور Y-محور۔ چارٹوں میں عموماً X-محور کو افقی (Horizontal)، یعنی بائیں سے دائیں دکھایا جاتا ہے اور Y-محور کو عمودی (Vertical)، یعنی نیچے سے اوپر دکھایا جاتا ہے۔ X-محور پر مختلف زمروں کے نام (Labels) دکھائے جاتے ہیں، جیسے مختلف سال یا ماہ یا ہفتے کے دن یا عمر کا گروپ وغیرہ۔ Y-محور پر ان زمروں میں کسی ڈاٹا کو اس کی قدر (Value) کے مطابق خاص طرح سے نشان زد (Plot) کرکے سیدھی لائن یا بار یا نقطہ یا دوسری طرح سے دکھایا جاتا ہے۔

چارٹ بنانا (Preparing Charts)

	A	B	C	D	E	F	G	H
1	Employee_Code	SSN	Region	Department	Name	Gross Earning		Department
2	5001	628-76-6529	South	Production	Anderson	37000		Production
3	5002	133-30-3940	North	Production	Ryan	34000		Accounts
4	5003	816-17-6291	East	Production	Lee	41500		IT
5	5004	133-30-3961	West	Production	Taylor	43876		Sales
6	5005	856-85-6910	North	Production	Fulkerson	65000		
7	5006	169-89-4910	East	Sales	Tate	45654		Sales
8	5007	786-48-2491	North	Sales	Marks	32000		Sales
9	5008	421-40-2831	South	Sales	Taylor	70000		Sales
10	5009	765-74-8097	East	Sales	Roberts	38122		
11	5010	676-10-1583	East	Sales	Pecks	42190		
12	5012	156-38-8493	South	Sales	Darcy	36139		
13	5013	213-45-8752	South	Accounts	Morrison	31876		
14	5011	531-38-7453	East	Accounts	Halpert	35895		
15	5023	843-27-6247	North	Accounts	Gable	38770		
16	5016	631-38-3745	South	IT	Goldstein	45876		
17	5027	476-20-4780	North	IT	Martinez	30876		
18					Total	668034		

تصویر E-6.1: چارٹ بنانے کے لیے ورک شیٹ

ایکسل میں چارٹ بنانے کے لیے Insert ٹیب کے Charts حصے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بٹن ایم ایس- ورڈ کے بٹنوں سے ملتے ہیں، جن کے بارے میں ہم آپ کو حصہ-3 میں بتا چکے ہیں۔ چارٹ بنانے کے لیے درج ذیل کام کیجیے:

1 سب سے پہلے وہ ورک شیٹ کھول لیجیے، جس میں آپ کا ڈاٹا بھرا ہوا ہے۔ مشق کے لیے یہاں ہم تصویر E-6.1 میں دکھائی گئی ورک شیٹ کے ڈاٹا کی بنیاد پر ایک آسان چارٹ بنائیں گے۔

2 ان سیلوں کو چنیے، جن میں نام (Label) سمیت ڈاٹا بھرا ہوا ہے۔ تصویر E-6.1 کی ورک شیٹ میں رینج A3:C8 میں ڈاٹا بھرا ہوا ہے اس رینج کو چن لیجیے۔

3 چارٹ حصے میں چارٹوں کی قسم پر مبنی متعدد بٹن دیے گئے ہیں، جیسے Column، Line، Pie، Bar، Area، Scatter اور Other Charts۔ آپ ان میں سے کسی بھی بٹن پر کلک کرکے چارٹ کی قسم چن سکتے ہیں۔

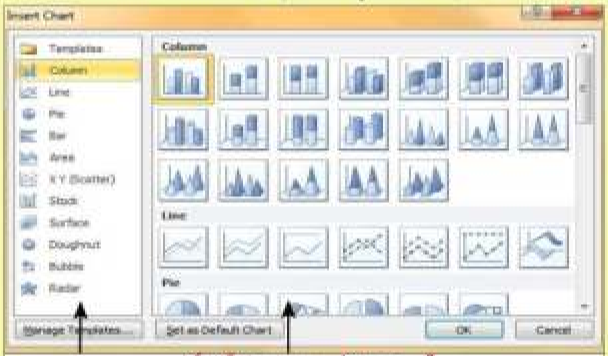

تصویر E-6.2: انسرٹ چارٹ ڈائیلاگ باکس

چارٹ کی قسم چننے کا ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔ Charts ڈائیلاگ باکس لانچر پر کلک کیجیے۔ اس سے Insert Chart ڈائیلاگ باکس تصویر E-6.2 کی طرح کھلے گا۔

اس ڈائیلاگ باکس میں ہم چارٹ کی قسم طے کرتے ہیں یا چنتے ہیں۔ ڈائیلاگ باکس میں بائیں طرف مختلف قسم کے چارٹوں کے ناموں کی فہرست دی جاتی ہے اور دائیں طرف ان میں سے کسی چنے ہوئے ٹائپ کے چارٹوں کے کچھ نمونے دکھائے جاتے ہیں۔ آپ ان میں سے اپنی خواہش سے کسی بھی قسم کا چارٹ بنا سکتے ہیں:

4 مشق کے لیے آپ کالم (Colomn) چارٹ ٹائپ کا پہلا نمونہ چن کر Ok بٹن کو

کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر E-6.3 کی طرح چارٹ آپ کی ورک شیٹ میں جڑ جائے گا۔

5 ورک شیٹ میں چارٹ جڑتے ہی آپ کے ربن میں Chart Tools عنوان کے تحت تین نئے ٹیب جڑ جاتے ہیں۔ ڈیزائن (Design)، لے آؤٹ

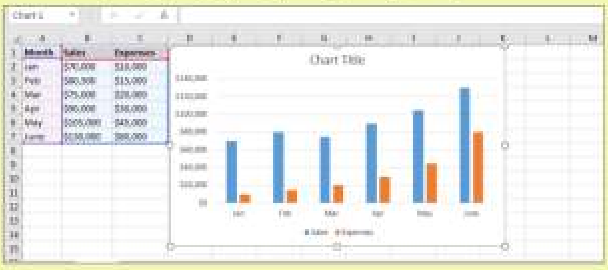

تصویر E-6.3: ورک شیٹ میں جوڑا گیا چارٹ

(Layout) اور فارمیٹ (Format)۔ ان ٹیبوں کے سبھی بٹن اور ان کے استعمال ایم ایس-ورڈ کی طرح ہی ہیں۔ ان کی مدد سے آپ ضرورت کے مطابق چارٹ میں ترمیم کرسکتے ہیں۔

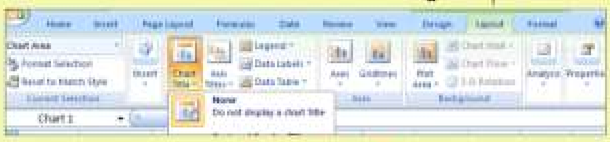

تصویر E-6.4: Layout ٹیب

6 اس ٹیب میں Labels حصے میں دیے گئے Chart Title بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس سے ایک پل-ڈاؤن مینو تصویر E-6.5 کی طرح کھلے گا، جس میں دیے گئے آپشنز کے ذریعے آپ عنوان کی جگہ طے کرسکتے ہیں۔ مثال کے لیے Above Chart آپشن پر کلک کیجیے۔ اس سے تصویر E-6.6 کی طرح آپ کے چارٹ کے اوپر عنوان کے لیے جگہ جڑ جائے گی۔ فارمولہ بار میں THE XYZ BANK LTD ،DELHI ٹائپ کرکے Enter کنجی دبائیں، عنوان فوراً چارٹ میں جڑ جائے گا۔

تصویر E-6.5: چارٹ ٹائٹل کا ابھرتا مینو

7 اس چارٹ کے محور (Axes) میں عنوان جوڑنے کے لیے Chart Title بٹن کے بغل میں دیے گئے Axis Titles بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس

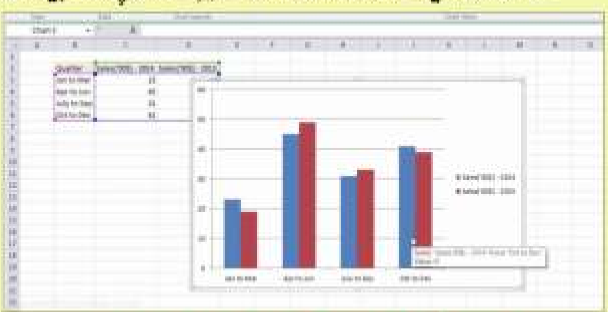

تصویر E-6.6: ایکسل میں جوڑے گئے چارٹ میں چارٹ عنوان کے لیے جگہ

کے بعد Primary Horizontal Axis Title پر ماؤس پوائنٹر لائیے۔ اس سے ابھرتا مینو تصویر E-6.7 کی طرح کھلے گا۔ Title Below Axis آپشن پر کلک کیجیے۔ اس سے آپ کے چارٹ میں X-محور کے نیچے عنوان کے لیے جگہ جڑ جائے گی۔ فارمولہ بار میں Financial Year ٹائپ کرکے Enter کنجی دبائیں، عنوان فوراً چارٹ میں جڑ جائے گا۔

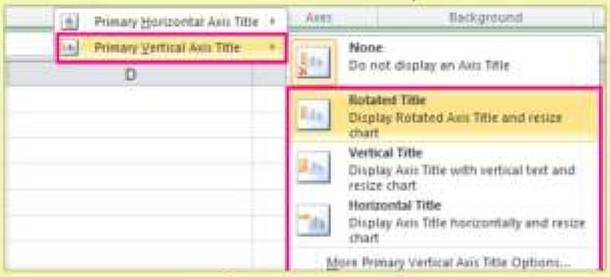

تصویر E-6.7: محور کا عنوان طے کرنا

8 اسی طرح چارٹ کے Y-محور میں بھی عنوان جوڑیے۔ اس کے Axis Titles مینو (تصویر E-6.7) میں Primary Vertical Axis Title کے ابھرتا مینو میں Rotated Title آپشن پر کلک کیجیے۔ اس کے بعد فارمولہ بار میں Rs. (In Crores) ٹائپ کرکے Enter کنجی دبائیں۔

یہ سبھی کام کرنے کے بعد آپ کا چارٹ تصویر E-6.8 کی طرح کھلے گا۔

تصویر E-6.8: ایکسل ورک شیٹ میں تیار کیا گیا چارٹ

اگر آپ کا چارٹ آپ کی امید سے بہت چھوٹا یا بہت بڑا یا بے ڈول بن گیا ہو، تو آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ بہت آسانی سے آپ اسے اپنی خواہش کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ شروع میں چارٹ کے چاروں کونوں اور کناروں کے بیچ میں کالے چوکور نقطے، جنھیں ہینڈل (Handles) کہتے ہیں، دکھائی دیتے ہیں، جیسے کہ تصویر E-6.8 میں دکھائی دے رہے ہیں۔ اگر یہ ہینڈل نہ ہوں، تو آپ چارٹ کو کلک کرکے بنا سکتے ہیں۔ دراصل جو چیز چنی ہوئی ہوتی ہے، اس کے چاروں طرف ایسے ہینڈل دکھائی دیتے ہیں۔

ان ہینڈلوں کا استعمال کرکے، یعنی ان کی مدد سے آپ چارٹ کا سائز گھٹا یا بڑھا سکتے ہیں۔ کونے والے ہینڈلوں کو ماؤس پوائنٹر سے پکڑ کر باہر یا اندر کی طرف کھینچتے ہوئے آپ چارٹ کا سائز بڑھا یا گھٹا سکتے ہیں۔ اس سے چارٹ یکساں تناسب میں گھٹتا یا بڑھتا ہے۔ اسی طرح کناروں کے بیچ والے ہینڈلوں کو ماؤس پوائنٹر سے پکڑ کر کھینچنے سے آپ چارٹ کی صرف لمبائی یا صرف چوڑائی گھٹا بڑھا سکتے ہیں۔ اگر آپ پورا چارٹ ہی دوسری جگہ سرکانا چاہیں، تو چارٹ کی باؤنڈری لائن (Boundary Line) کو ماؤس پوائنٹر سے پکڑ کر کہیں بھی کھینچ لے جائیے۔ اس طرح آپ چارٹ کو ورک شیٹ میں کہیں بھی سیٹ (Set) کرسکتے ہیں۔

چارٹوں میں ترمیم و اضافہ کرنا (Editing Charts)

اگر آپ چارٹ کے کسی مخصوص حصہ، جیسے عنوان، اشارہ، بار وغیرہ کو سرکانا یا درست کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کلک کرکے چن لیجیے۔ اس سے اس کے چاروں طرف ہینڈل بن جائیں گے۔ اب آپ ان ہینڈلوں کی مدد سے ان کا سائز بدل سکتے ہیں اور ادھر ادھر سرکا سکتے ہیں۔ اگر آپ کو چارٹ میں کوئی بڑی ترمیم و اضافہ کرنا ہو، تو Chart Tools کے تحت دیے گئے Design اور Format ٹیبوں کا استعمال کیجیے۔ ان کے بٹن ایم ایس-ورڈ سے ملتے جلتے ہیں، جن کا استعمال آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

اگر آپ اپنی ورک شیٹ کو بغیر چارٹ کے چھپوانا چاہتے ہیں، تو پرنٹ ایریا میں وہ رینج دیجیے، جس میں چارٹ نہ آتا ہو۔ ضروری ہونے پر چارٹ کو دور سرکا دیجیے۔

چارٹوں کو ہٹانا (Deleting Charts)

اگر آپ کسی چارٹ کو ورک شیٹ سے ہٹا دینا چاہتے ہیں، تو اس چارٹ کو چن کر یا تو کی بورڈ پر 'Del' یا 'Delete' بٹن دبائیے یا پھر Home ٹیب کے Editing حصے میں Clear مینو میں Clear All آپشن چنیے۔ ایسا کرنے سے چارٹ غائب ہو جائے گا۔ 'Undo' ہدایت کے ذریعے آپ چارٹ کو واپس لا سکتے ہیں۔

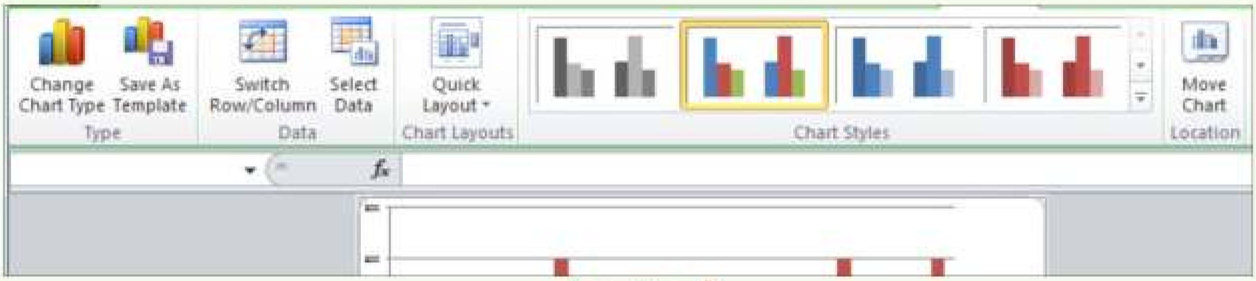

تصویر E-6.9: Design ٹیب

تصویر E-6.10: Format ٹیب

چارٹ کو چھپوانا (Printing Charts)

کسی ورک شیٹ کو چھپواتے وقت اگر چھاپے جانے والی رینج میں چارٹ یا اس کا کوئی حصہ شامل ہو، تو وہ ساتھ ہی چھاپا جاتا ہے۔ اگر آپ صرف چارٹ کو چھپوانا چاہتے ہیں، تو Page Layout ٹیب میں Page Setup ڈائیلاگ باکس لانچر کلک کیجیے۔ اس سے Page Setup ڈائیلاگ باکس کھلے گا، جس کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

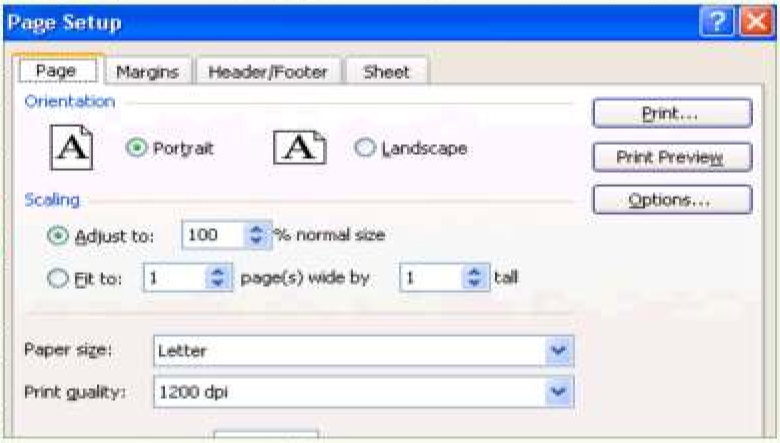

تصویر E-6.11: پیج سیٹ اپ کا ڈائیلاگ باکس

آپ دیکھیں گے کہ اس ڈائیلاگ باکس میں اب Sheet ٹیب شیٹ کی جگہ پر Chart ٹیب شیٹ جڑ گئی ہے (تصویر E-6.11)۔ چیک باکسوں کے ذریعے Printing Quality سیٹ کرکے Ok بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سیٹنگ کے بعد آپ جب بھی 'Print' ہدایت دیں گے، صرف چارٹ ہی چھاپا جائے گا۔

گرافکس جوڑنا (Adding Graphics)

آپ Insert ٹیب کے Illustrations حصے کی مدد سے ایکسل کی ورک شیٹ کے کسی حصے میں یا چارٹ میں بھی کوئی بھی تصویر، شکل وغیرہ بنا کر جوڑ سکتے ہیں۔ Illustrations حصہ بنا کے استعمال کے بارے میں آپ ایم ایس-ورڈ والے حصے میں پڑھ چکے ہیں۔ ایم ایس-ایکسل میں بھی ٹھیک اسی طرح گرافکس بنائے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ ایم ایس-آفس یا اس سے باہر کے کسی پروگرام کے ذریعے بنائی گئی تصویروں کو بھی ایکسل ورک شیٹ میں لا سکتے ہیں۔ اس کے لیے Illustrations حصے میں Picture ہدایت دی جاتی ہے۔

چارٹ یا گرافکس دوسرے پروگراموں میں لے جانا (Exporting Charts of Graphics)

آپ اپنی ورک شیٹ کے کسی بھی حصے میں بنے چارٹ، گرافکس وغیرہ کو دوسرے پروگراموں، جیسے ورڈ یا پاور پوائنٹ میں لے جا سکتے ہیں۔ اس کے لیے اس چیز کو چن کر Home ٹیب کے Clipboard حصے میں 'Copy' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے وہ چیز کلپ بورڈ میں آ جائے گی۔ اب دوسرے پروگراموں میں جا کر اسے 'Paste' کر دیجیے۔ اس کام کا نتیجہ اس چیز اور پروگرام پر منحصر ہے۔ ■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

تبصرہ وتعارف

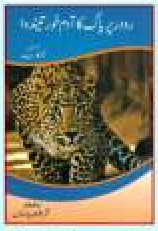

رودرپریاگ کا آدم خور تیندوا

مصنف: جم کاربیٹ، مترجم: شرافت یار خاں

صفحات: 164، قیمت: 100 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عبدالرشید اعظمی، نئی دہلی

دوسری زبانوں کے علوم وفنون، اجنبی ماحول ومعاشرت کی تہذیب وثقافت نیز ذوق وشوق کو اردو زبان اور اردو آبادیوں سے آشنا وواقف کرانے کا کام قومی اردو کونسل بحسن وخوبی انجام دے رہی ہے۔ یہ کام مترجمین بڑی مہارت سے انجام دے رہے ہیں۔ دیگر زبانوں کی کتابوں کو اردو قارئین کے لیے اردو تصانیف کی شکل میں فراہم کر رہے ہیں۔ تاہم ان کی معاونت قومی اردو کونسل کر رہی ہے۔ فروغ اردو کے لیے دیگر پروجیکٹ کے ساتھ قومی اردو کونسل مالی تعاون کے ذریعے اردو کے دامن کو مزید وسعت دے رہی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی 'رودر پریاگ کا آدم خور تیندوا' نامی کتاب ہے جو انگریزی زبان کے مصنف جم کاربیٹ کی کتاب Man Eating Leapart of Rudraprayag کا اردو ترجمہ ہے جس کے مترجم شرافت یار خاں ہیں۔

کسی اچھی کتاب کا دوسری زبان میں منتقل ہوکر مقبولیت حاصل کرنا مترجم کی صلاحیت اور شوق پر منحصر ہے۔ اگر مترجم بذاتِ خود مصنف کے ذوق پر اترتا ہے تو وہ ترجمہ نہیں طبع زاد کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ جم کاربیٹ کی تصنیف کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ شرافت یار خاں خود ایک شکاری ہیں۔ ان کا ماحول بھی جنگلات سے وابستہ ہے۔ شرافت یار خاں کے والد بھی شکاری تھے۔ جم کاربیٹ کی پہلی تصنیف Man-Eaters of Kumaun کا ترجمہ شرافت یار خاں کے والد نے کیا تھا لیکن خود شائع نہیں کرا سکے تھے۔ کسی اور نے اڑا لیا تھا۔ تاہم وہ کتاب بہت مقبول ہوئی تھی اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔ زیر تبصرہ کتاب 'رودر پریاگ کا آدم خور تیندوا' جم کاربیٹ کی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جس میں جم کاربیٹ کی 25 عنوانات کے تحت تحریریں درج ہیں۔ اس سے قبل مترجم کا چار صفحے پر مشتمل کتاب اور مصنف کا تعارف ہے۔ مصنف جم کاربیٹ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انھیں تمام مذاہب سے انسیت ہے، ان کی پہلی تحریر جو شامل کتاب ہے یاتری روڈ ہے۔ ساڑھے تین صفحے پر مشتمل یہ تحریر دراصل ہندوؤں کے مقدس مقام وتیرتھ گاہوں کی زیارت سے متعلق ہے جو خاص طور پر کیدارناتھ اور بدری ناتھ تک راستوں کی تفصیل ہے۔ دوسری تحریر بعنوان 'آدم خور' (The Man-Eaters) ہے۔ یہ کوئی کہانی نہیں ہے بلکہ رودر پریاگ میں مشہور آدم خور تیندوے کے شکار کی تفصیل بتائی گئی ہے اور یہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ درندہ، آدم خور کیسے بنتا ہے۔ مصنف نے اس تیندوے کے بارے میں بتایا ہے جس نے بیش و کم 125 انسانوں کا شکار کیا۔ تیسری تحریر بعنوان 'خوف' (Terror) ہے۔ یہ تحریر گڑھوال کے اس علاقے کی حالت خوف پر مشتمل ہے۔ جہاں آٹھ سال تک ایک تیندوا کا خوف طاری تھا۔ گویا کرفیو زدہ علاقہ اس سے زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔ وہ علاقہ مقامی لوگوں کے علاوہ تیرتھ یاتریوں کا راستہ بھی ہوتا تھا جن پر دہشت طاری رہتی تھی۔ اس میں مصنف نے تیندوے کے چار واقعات کا ذکر کیا ہے جو نہایت ہی دردناک ہیں۔ پہلا واقعہ ایک یتیم چرواہے بچے کا ہے تو دوسرا ایک مہمان کا ہے جو تیندوے کا شکار بن گیا۔ تیسرا واقعہ گاؤں کے پردھان کی بیمار بیوی کا ہے جو تین پڑوسن عورتوں کی نگرانی میں سو رہی تھی۔ سب کے سو جانے پر تیندوے نے ان کی جان لے لی۔ چوتھا واقعہ ایک دہقان زادی کا ہے جو اپنے چچا، باپ اور تین بھینسوں کے درمیان خیمے میں سو رہی تھی۔ یہ تحریر 14 صفحات پر مشتمل ہے جسے مصنف نے نہایت پر تاثیر انداز میں رقم کیا ہے۔ مزید آگے مصنف نے گڑھوال کے لوگوں کے عقیدے پر روشنی ڈالی ہے جس سے ماضی میں گڑھوالیوں کے خوف وہراس اور عقیدے کا پتہ چلتا ہے جس سے خود سماجی سطح پر لوگوں کا نقصان توہم پرستی کے سبب ہوا۔

جم کاربیٹ کی یہ تصنیف دراصل کوئی کہانی یا فکشن کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ اس کے مشاہدات، تجربات اور واقعات پر لکھی گئی حقیقت پر مبنی کتاب ہے۔ یہاں ایک ایک کرکے سارے عنوانات پر گفتگو کرنا ممکن نہیں تاہم بغرض اختصار چند عناوین کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو درج ذیل ہیں، جائے وقوع پر آمد (Arrival)، تلاش (Investigation)، پہلا شکار (The First Killing)، تیندوے کی تلاش (Locating The Leapord)، دوسرا شکار (The Second Kill)، تیاریاں (Preparation)، جادوگری (Magic)، بال بال بچے (A Near Scap) وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ 14 عنوانات کے تحت جم کاربیٹ کی انگریزی تحریروں کا شرافت یار خاں نے بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے جس پر اصل کا گمان ہوتا ہے، کتاب قومی اردو کونسل سے شائع ہوئی ہے۔ کہیں کہیں پروف کی غلطیاں در آئی ہیں۔ تاہم ایک عیسائی شکاری کے تجربے ومشاہدے پر مبنی جنگلات کی دنیا سے متعلق بہت کارآمد کتاب ہے جس سے کوہستانی زندگی سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے۔ 164 صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت صرف 100 روپیہ ہے جو زیادہ نہیں ہے۔

تهذیب و تاریخ

میں لاہور ہوں

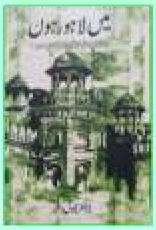

مصنف: کیول دھیر

صفحات: 220، قیمت: 300روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: پروفیسر شارب ردولوی

سی 95، سیکٹر اے، علی گنج لکھنؤ۔ 226024

ڈاکٹر کیول دھیر اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے تقریباً ساری دنیا کا سفر کیا ہے اور وہاں کی زندگی، زبان، کلچر اور ثقافت کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے ان تجربات کی جھلک ان کے افسانوں اور ناولوں میں جگہ جگہ پر نظر آتی ہے۔ وہ ایک Philanthropist ہیں۔ ان کے لیے ہر انسان یکساں طور پر ہمدردی اور دوستی کا مستحق ہے۔ وہ شمال کا رہنے والا دلآویز قد و قامت کا خوبصورت شخص ہو یا خط استوی کے قریب رہنے والا گداز ہونٹوں، لانبے قد اور سیاہ رنگ کا توانا انسان۔ ان کی یہ ہمدردی، مساوات، رواداری اور محبت ان کی زندگی کا حصہ اور ان کی فکر کا جزو ہے۔ اس لیے ان کی تحریر کی بنیاد محبت اور انسانی ہمدردی ہے۔ انھوں نے تقسیم ملک اور ہجرت کا دکھ جھیلا ہے اس لیے انھیں ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ بھرے ہوئے گھر اور سجے ہوئے روشن بازار کس طرح آن کی آن میں ویران ہو جاتے ہیں۔ وہ منٹگمری میں پیدا ہوئے وہیں کی فضاؤں میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی اس لیے غیر منقسم پنجاب یا موجودہ پاکستان سے ان کا ایک جذباتی رشتہ ہے۔ اس لیے لاشعوری طور پر وہاں کی یادیں کردار، واقعات کسی واقعے یا کسی حوالے سے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کا قلم کچھ دیر کے لیے وہیں پہنچ جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر اس بار کسی افسانوی مجموعے یا ناولٹ کے بجائے ایک شہر کے عشق کی کہانی لائے ہیں۔ 'میں لاہور ہوں' جس میں لاہور خود اپنی کہانی کا راوی ہے۔ لاہور کو کبھی ہندوستان کا پیرس کہا جاتا تھا۔ پنجاب کے رہنے والوں کا تو لاہور سے عشق محاورہ بن گیا کہ ''جینو لاہور نئی دیکھیا اور جمیئے نائیں'' یعنی جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ یوں بھی لاہور ایک اہم علمی، تہذیبی و ثقافتی مرکز رہا ہے اور پیرس بھی فنون لطیفہ، فلسفہ، آرٹ اور کلچر سے وابستہ اپنی عظیم شناخت کے لیے مشہور ہے۔ ایک زمانے میں لاہور ایک طرف بڑے اخباروں کی طباعت کا مرکز تھا۔ دوسری طرف صوفیوں اور ملنگوں، درویشوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور ادیبوں کا شہر تھا۔ لاہور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ عاشقوں کا شہر ہے۔ یہ انارکلی اور سلیم کے عشق کا شہر ہے، یہ نور جہاں اور جہانگیر کی داستان الفت کا شہر ہے۔ یہ ہیر اور رانجھے کی محبتوں کا شہر ہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر نے 'میں لاہور ہوں' میں اس کے ہر پہلو کا اختصار لیکن بہت جامع تعارف کرایا ہے۔ یہ کتاب کسی ایک شہر کی تاریخ نہیں بلکہ صدیوں کو محیط یہ ایک شہر سے وابستہ تہذیبی و ثقافتی تاریخ ہے جس سے وہاں کے لوگوں کو ان کے مزاج ان کے برتاؤ اور ان کے رہن سہن کا علم ہوتا ہے'ڈاکٹر کیول دھیر' نے ان 75 ابواب میں لاہور کا ہر رخ اور اس کی تقریباً ہر خصوصیت پیش کر دی ہے ان کا انداز تحریر اس قدر دلچسپ ہے اور اس قدر مصورانہ (Pictorial) ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود بھاٹی دروازہ، انارکلی، ہیرا منڈی، مال روڈ اور رام گلی کی گلیوں سے گزر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر نے لاہور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان ہی گلی کوچوں میں وارث کی ہیر کا پیار پروان چڑھا تھا۔ انھیں گلی کوچوں میں آج محبت کھیلتی ہے۔ ان گلیوں نے اتہاس کو بھی سنبھال رکھا ہے اور لاہور کے کلچر کو بھی ان گلیوں کی فضاؤں میں روحانی زندگی کے روز نئے پھول کھلتے ہیں رنگین آنچلوں میں لہراتے جھمکے، چلمنوں سے جھانکتی شرمیلی آنکھیں، چقوں کے پیچھے دھیمی دھیمی سرگوشیاں، معصوم بچوں کی آنکھ مچولی، بوڑھوں کے حقوں کی گڑگڑاہٹ اور گلی کوچوں کے تھڑوں پر بیٹھنے والوں کی گپ شپ۔ ان گلیوں میں کیا کچھ نہیں، زندگی کا ہر روپ یہاں ملتا ہے۔'' (ص 71)

ڈاکٹر کیول دھیر نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بھی اسی طرح ذکر کیا ہے جس طرح مخصوص اور مشہور باتوں کا، اس لیے تہذیبی طور پر ان چھوٹی چیزوں کی بھی وہی اہمیت ہے۔ مال روڈ پر بنی ایک اک عمارت کا انھوں نے تعارف کرایا ہے جو صرف عمارتیں نہیں بلکہ رونق شہر کی تاریخ ہیں۔ جغرافیہ کے سبق میں کبھی آپ نے پڑھا ہوگا کہ دریاؤں کے کنارے بڑے بڑے شہر آباد ہوئے اور ان دریاؤں کی وجہ سے شہر کی تجارت کو فروغ ہوا۔ دلی، الہ آباد، کانپور، سرینگر سب کے فروغ میں ان کے ساتھ بہنے والے دریاؤں کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن لاہور کی ایک اور خصوصیت ہے شہر یہاں بھی آباد ہوا لیکن یہ محبتوں کا دریا ہے اسی لیے اس کا پانی سفید یا نیلا ہونے کے بجائے گلابی ہے۔

لاہور کی اہمیت صرف اس کے رنگ اور اس کے لوگوں کی رنگینی مزاج کی وجہ سے نہیں ہے اس شہر نے ایک طویل تہذیبی و تاریخی سفر طے کیا ہے۔ اپنے مختصر ابواب کے باوجود ڈاکٹر کیول دھیر نے بڑے سلیقے سے لاہور کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔ اس شہر کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس نے بہت کچھ بنتے اور بگڑتے دیکھا ہے۔ یہ سلطنتوں کے عروج و زوال کا خاموش چشم دید گواہ ہے۔

لاہور کی ایک خصوصیت اس کے عرس اور میلے تھے، یہاں ہر محلے میں صوفی بزرگوں کے مزارات تھے اور یہاں کے لوگ ان کے عرس بہت دھوم دھام سے مناتے تھے جن میں دو عرس ایک حضرت میاں میر کا عرس دوسرا داتا صاحب کا عرس تھا جس میں شرکت کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے اور لاہور میں کوئی ہندو، مسلمان، سکھ یا وہاں رہنے والا ایسا نہیں تھا جو میاں میر اور داتا صاحب کے عرس میں شریک نہ ہوتا ہو وہ عرس نہیں بلکہ لاہور کی سانجھی وراثت ہے۔

عظیم پنجابی شاعروں میں بلھے شاہ اور وارث شاہ کی تخلیقات اور ہیر کی کہانی کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ ڈاکٹر کیول دھیر نے 'میں لاہور ہوں' کے ذریعے ایک ایسی دستاویز فراہم کر دی ہے جسے پڑھ کر ایک بار اسے دیکھنے کا جی چاہتا ہے۔ وہ 'چوبارے' جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ''جو سکھ چھجو کے چوبارے او بلخ نہ بخارے'' وہ سب اب اسی طرح تو نہیں ہو سکتا لیکن وہاں بیٹھنے والوں کی نسلیں اب بھی وہاں بیٹھتی ہوں گی۔ غالب نے کلکتے کے ذکر پر کہا تھا کہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں　　اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اور 'میں لاہور ہوں' پڑھ کر جو اسے چھوڑ آیا وہ غالب کا مصرعہ دہرائے گا اور جس نے نہیں دیکھا وہ اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہوگا۔

تحقیق و تنقید

دیوان غالب

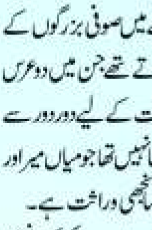

مصنف: پروفیسر عبدالحق

صفحات: 164، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر خالد اشرف، ایسوسی ایٹ پروفیسر، کروڑی مل کالج، دہلی

ہندوستان میں مرزا غالب اور پاکستان میں علامہ اقبال، دو ایسے موضوعات ہیں

جن پر تحقیق وتنقید کا سلسلہ لگا تار جاری ہے۔ چونکہ مرزا غالب کا سیکولر مزاج اور فکری روشن خیالی، ہندوستان کے کثیر الثقافتی مزاج سے زیادہ میل کھاتے ہیں، اس لیے نہ صرف اردو، بلکہ ہندی اور انگریزی وغیرہ میں بھی غالب کی شاعری اور ذہنی رویوں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور اکثر زبانوں کے نصابات میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

اردو، فارسی میں غالب محققین کا سلسلہ مولانا حالی سے شروع ہوکر غلام رسول مہر، شیخ اکرام، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالسلام ندوی، مالک رام، حافظ محمود شیرانی، سید معین الرحمٰن، سید عبداللہ، امتیاز علی عرشی، تحسین فراقی، نثار احمد فاروقی اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ نے آگے بڑھایا۔ غالب کے شارحین کی فہرست اس کے علاوہ ہے۔

جہاں تک دیوان غالب کی اشاعت کا سوال ہے، غالب کی زندگی میں ان کا متداول دیوان 1841 سے چار دفعہ شائع ہوا اور متعدد قلمی نسخے بھی برآمد ہوتے رہے، ان میں نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ بھوپال، نسخۂ رامپور، نسخۂ بدایوں، نسخۂ کراچی، نسخۂ لاہور اور نسخۂ امروہہ وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی اور ان میں سے چند پر تنازعات بھی ہوتے رہے۔

اسی سلسلے کی تازہ کڑی نسخۂ عبدالحق ہے، جس کو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس اور معروف ماہر اقبالیات ڈاکٹر عبدالحق نے آج سے تقریباً پینتیس برس قبل اپنے وطن قصبہ مچھلی شہر (ضلع جونپور) کے ایک کتب خانے سے حاصل کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق کے برآمد کردہ اس نسخے کو بڑی شان وشوکت کے ساتھ حکومت ہند کے تازہ قائم کردہ ثقافتی ادارے National Mission for Manuscirpts واقع نئی دہلی سے شائع کیا ہے، جو غالب اور شائقین غالب کے لیے ایک مسرت آمیز چیز ہے۔ یہ ادارہ ہندوستان کی مختلف جدید اور کلاسیکی زبانوں کے قدیم مخطوطات وکتب کی اشاعت وتحفظ کے لیے مرکزی حکومت کے تحت کام کرتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق، زیر تبصرہ دیوانِ غالب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ غالب کے حینِ حیات میں ان کے دیوان کی اشاعتوں کے ساتھ ساتھ خطی نسخوں کی نقل وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس سے کلام غالب سے گرویدگی اور شہرتِ عام کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی نوعیت کا یہ نسخہ ہے، جس کو ہم فی الحال 'نسخۂ عبدالحق' سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ان کے مطابق اس نسخے کی کوئی انقلابی اہمیت نہیں ہے لیکن اس کے تعلق سے تین خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ اول یہ کہ اس کی کتابت وفاتِ غالب فروری 1869 کے تین ماہ بعد ہوئی تھی، اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی کتابت مرزا غالب کی زندگی ہی میں شروع ہوئی ہوگی اور عین ممکن ہے کہ غالب نے اس کا جائزہ لیا ہو یا اس کی تصحیح کی ہوگی۔ یعنی یہ نسخہ نواحِ دلی کی یادگار ہے، کیونکہ یہ قصبہ ہنڈن Hindon (نزد غازی آباد) کے رئیس / زمیندار صاحب رام جی کے لیے تیار کیا تھا اس نسخے کے کاتب منشی منوہر لال ولد شیولال بن دھیرج لال تھے۔ یہ اطلاعات نسخے کے ترقیمے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس سے دوسری یہ شہادت ملتی ہے کہ امرا و روسا کی خدمت دیوانِ غالب کو پیش کرنے کی خواہش یا روایت موجود تھی اور غالباً یہ پہلا نسخہ ہے جو کسی غیر مسلم صاحب شکوہ کو نذر کیا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر اس دستی تحریر کی تیسری اور سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ عہد غالب کا اندازِ خط اس میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر ایدھر (ادھر) اودھر (اُدھر) سونچ (سوچ) اوٹھایا (اٹھایا) اوسنے (اس نے) پڑھیے (پڑھئے) وغیرہ۔ اسی طرح متداول دیوان سے اختلافِ نسخ کی مثالیں بھی ملتی ہیں، جیسے:

- تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ • ہاں ہجوم اشک سے تار نگہ نایاب تھا
- مٹ گیا کھینے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا • عرش سے ایدھر ہو گا کاش کے مکاں اپنا

اسی طرح اس مخطوطے میں بہت سے الفاظ کے املا میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، جیسے تراز (طراز)، بہت سی غزلوں میں اشعار کی ترتیب میں فرق ہے۔ ردیف 'ث' میں نسخۂ حمیدیہ میں چودہ اشعار پر مشتمل دو غزلیں موجود ہیں جب کہ نسخۂ عبدالحق میں ردیف 'ث' میں کوئی غزل نہیں ہے۔

ان سب مثالوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ زیر تبصرہ نسخۂ غالب اپنی جگہ پر ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے مرتب پروفیسر عبدالحق کے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ دیوان غالب کی تدوینِ نو کی ضرورت ہے۔

پھر آیا وہ زمانہ کہ جہاں میں جامِ جم نکلے

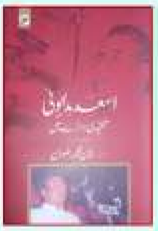

اسعد بدایونی: تنقیدی دائرے میں

مرتب: خان محمد رضوان
صفحات: 468، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: عطا عابدی، معرفت بک امپوریم، اردو بازار، پٹنہ

مختلف شعبہ حیات میں استادی وشاگردی کی روایت رہی ہے۔ اردو میں بھی یہ روایت رہی ہے اور حسین و مستحکم روایت رہی ہے۔ فی زمانہ یہ روایت اخلاقی حوالے سے کمزور ہو چکی ہے۔ اب عام طور پر نہ تو استاد کو اپنے مقام کا ادراک ہے اور نہ طالب علم کو استاد کی حرمت کا خیال۔ ایسے میں ایک لائق و فائق استاد کی خدمات کا اظہار و اعتراف کسی شاگرد کے ذریعے سامنے آئے اور بار بار سامنے آئے تو اسے اس طالب علم کی سعادت مندی اور فرض شناسی کہیں گے۔ ڈاکٹر خان محمد رضوان ایسے ہی شاگردوں میں ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد محترم اسعد بدایونی سے استفادے کی بہت کم مدت پائی لیکن استاد کی حرمت کا ثبوت وہ بے لوث طور پر دے رہے ہیں۔ واضح ہو کہ اسعد بدایونی کی خدمات کے تعلق سے یکے بعد دیگرے ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ (1) اسعد بدایونی بحیثیت شاعر (2) جدیدیت کا مغنی اسعد بدایونی اور (3) اسعد بدایونی: تنقیدی دائرے میں (زیر نظر کتاب) استاد وشاگرد کے حوالے سے ایسی محبت ومحنت خان محمد رضوان سے قبل پروفیسر مظفر حنفی کے یہاں ملتی ہے، جنھوں نے اپنے استاد شاد عارفی سے بہت کم استفادہ کیا لیکن ان کی خصوصیات خدمات کے حوالے سے اہم کتابیں پیش کیں۔ مثالیں اور بھی مل سکتی ہیں، لیکن یہاں اس کا موقع نہیں۔

اسعد بدایونی نے کم عمر پائی لیکن ان کی ادبی خدمات قابل قدر ہیں۔ خان محمد رضوان نئی نسل کے سنجیدہ، متحرک اور ریاضت پسند قلمکار ہیں۔ زیر نظر کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے مقدمہ کی اصطلاح اور اس کی غایت پر گفتگو کرتے ہوئے شعری متن کے ضابطے پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اسعد بدایونی کی بنیادی پہچان شاعری بنی لیکن ادب کے دیگر فنون بھی ان کی دلچسپی کے حوالے رہے ہیں۔ ڈاکٹر خان محمد رضوان نے اپنے مقدمہ میں مذکورہ امور کے ساتھ اسعد بدایونی کے ذہنی وفکری رویے کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں شامل مضمون نگاروں کا تعارف بھی مقدمے کا اہم حصہ ہے۔ 'حرفے چند' کے ذریعے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اسعد بدایونی کی شعری خاصیتوں کے ساتھ بجا طور پر خان محمد رضوان کی بامعنی سرگرمیوں اور کامیاب قلمی جدوجہد کا اعتراف کیا ہے اور روشن توقعات وابستہ کی ہیں۔

زیر نظر کتاب اسعد بدایونی کے دو مضامین اور اسعد بدایونی کی حیات وخدمات سے متعلق مختلف اہل قلم حضرات کے 27 مضامین نیز دو تبصرے اور اسعد بدایونی کی منتخب نظموں پر مشتمل ہے۔ مضامین کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ان کے لکھنے والوں کے نام سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ نام اس طرح ہیں: توصیف تبسم، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر ابرار رحمانی، راشد جمال فاروقی،

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر شمس بدایونی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر مبین صدیقی، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر ارشد عبدالحمید، تسلیم غوری بدایونی، ڈاکٹر راشد انور راشد، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ذکاء الدین شایاں، ڈاکٹر علاء الدین خان، مشتاق صدف، ڈاکٹر محمد عاصم رضوی، ڈاکٹر محمد سلیم قادری، عمران عظیم اور ڈاکٹر قیصر زماں قیس، توصیف تبسم، ارشد عبدالحمید اور تسلیم غوری بدایونی کے دو دو مضامین شامل اشاعت ہیں۔

ارشد عبدالحمید نے جدید تر فکری عوامل کی نشاندہی کرتے ہوئے اسعد کے کلام میں نئی فکر کے بہت سے پہلو روشن ہونے کی بات کہی ہے۔ ڈاکٹر احمد امتیاز کے خیال میں زندگی کے مثبت پہلوؤں کی جستجو اسعد بدیونی کی شاعری کو اثر دار بناتی ہے۔ ڈاکٹر راشد انور راشد نے اسعد بدایونی کی شعری کائنات کا جائزہ لیا ہے۔ اپنے اس جائزہ میں انھوں نے اسعد بدایونی کی اناپسند طبیعت پر بھی رشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سرور الہدیٰ اسعد بدایونی کی غزل کو زندگی کی نئی وسعتوں کا استعارہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا مطالعہ یہ ہے کہ:

''اسعد بدایونی کے شعری پیکر زندگی کی سچی اور معنی خیز تصویریں ابھارتے ہیں اور ان کے ذہن کی خلاقی اور تخیل کی زرخیزی کی غمازی کرتے ہیں۔

مشتاق صدف نے اسعد بدایونی کی شاعری میں فکر و اظہار کی نئی بصیرتوں کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد عاصم رضوی نے موضوعات کی بوقلمونی اور افکار کی ہمہ جہتی کو اسعد بدایونی کی غزل کا خاص وصف بتایا ہے۔ ڈاکٹر محمد سلیم قادری کے نزدیک اسعد بدایونی کے مقام اعتبار و امتیاز کا سبب ان کی تخلیقیت اور شاعری کے نئے افق کی تلاش جستجو ہے۔ عمران عظیم نے اسعد بدایونی کا طرۂ امتیاز زندگی کی نئی وسعتوں پر نظر کرنا اور ان کو نئے انداز میں بیان کرنا بتایا ہے۔ ڈاکٹر قیصر زماں قیس کا مضمون برسوں قبل سب اس میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں اس کی شمولیت بامعنی صورت رکھتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اسعد بدایونی کو اپنے عہد اور معاشرے کی شکست و ریخت کا گہرا شعور حاصل ہے۔ انھوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں اپنے عہد کی حسیت کا شاعرانہ اظہار کیا ہے۔''

'تبصرے' کے باب میں پروفیسر ثروت اللہ قادری، ڈاکٹر جاوید منظر اور پروفیسر راشد طراز نے خان محمد رضوان کی اسعد شناسی کا اظہار کرتے ہوئے اسعد بدایونی کی ادبی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اسعد بدایونی کی منتخب نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ یہاں اگر اسعد بدایونی کی منتخب غزلیں بھی شامل ہوتیں تو بہتر ہوتا۔ زیر نظر کتاب کے مندرجات سے واضح ہے کہ یہ کتاب بھی، اسعد بدایونی سے متعلق، خان محمد رضوان کی دیگر کتابوں کی طرح اسعد شناسی کے باب میں بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ اسعد بدایونی کی خدمات کی مختلف جہتوں کو محبت و محنت سے آئینہ صورت بنانے کی مسلسل کوشش کے سبب خان محمد رضوان کو اگر ماہر اسعدیات کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

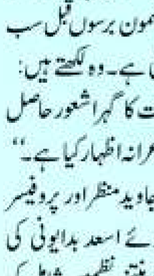

حسن آرزو کی ادبی اور علمی خدمات

مصنف و ناشر: ڈاکٹر ابراہیم آرزو

صفحات: 296، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایم ایم پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف علامہ اقبال اسٹریٹ، سنبھل یوپی

آج کے دور میں انسان کی بڑھتی ہوئی مصروفیات اور عہد حاضر کی چمک دمک کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کی توجہ کتابوں سے ہٹ کر دوسری چیزوں کی طرف مبذول ہوتی جا رہی ہے۔ اور ہماری نئی نسل جدید وسائل کی طرف کچھ زیادہ ہی راغب ہو رہی ہے۔ اس خودغرضی اور نفسانفسی کے وقت میں یہ بات بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ اب کوئی کسی کے لیے کچھ بھی نہیں کرتا بلکہ انسان کو اپنے لیے سب کچھ خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص اولاد سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس کے ادھورے کاموں کو پورا کر دے گی پوری طرح بے سود ہے۔ مگر اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر جو کتاب ہے اس سے یہ مفروضہ پوری طرح غلط ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک قلم کار کی تصنیف ہی نہیں بلکہ ایک بیٹے کا اپنے والد کے تئیں بہترین خراج عقیدت بھی ہے۔ کہ انہوں نے مرحوم کے تحریری کام کو اپنے پی ایچ ڈی کا موضوع بنا کر ان کی قلمی کاوشوں کو جلا بخشی ہے۔ یہ کتاب تحقیقی نوعیت کی ہے جو دراصل پی ایچ ڈی مقالہ ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب یہ کتاب زیور طبع سے مزین ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ اس کا آغاز مصنف کے پیش لفظ سے ہوتا ہے۔ ان سطور میں انھوں نے کتاب کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بعد پروفیسر صغیر افراہیم کے رشحات قلم 'آرزو کی تکمیل: ایک آرزو' کے عنوان سے دیے گئے ہیں۔ ان سطور میں آپ نے بحیثیت ممتحن اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔ جن میں عقیدت و محبت کی جھلک بھی ہے۔ اس کے بعد 'حسن آرزو کی ادبی و علمی خدمات' کے عنوان سے 'ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری' کے خیالات زینت قرطاس بنائے گئے ہیں۔ بعدۂ اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کا باب اوّل شروع ہوتا ہے، جو سوانحی کوائف پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب تعلیمی احوال اور ملازمت کے عنوان سے ہے۔ تیسرے باب میں ان پہلوؤں کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جن پر کتاب میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ یہ تینوں ابواب بہت ہی مختصر ہیں۔ کتاب کا چوتھا باب 'ادبی خدمات' کے عنوان سے ہے۔ جس میں حسن صاحب کی ادبی خدمات کا مفصل تعارف و جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں حسن صاحب کے ادبی کام میں سب سے اہم بات 'سعادت یار خاں رنگین: حیات اور نگارشات' کا ہے۔ یہ تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس میں عمیق بحثیں بھی ہیں۔ اور دلچسپ معلومات بھی۔ اس باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے۔ کہ رنگین ایک مرنجان مرنج اور جامع شخصیت کے مالک تھے۔ جن کی مثال اردو ادب میں خال خال ملتی ہے۔ انہی سطور میں رنگین کے سنہ ولادت پر بھی تحقیقی بحث کی گئی ہے۔ جس میں کافی تلاش و تحقیق کے بعد ان کی درست تاریخ ولادت رقم کی گئی ہے۔ اپنی تحقیقی صحت اور بے پناہ سخت کوشی کے بعد یہ حصہ کتاب کا کافی تحقیقی حصہ بن گیا ہے۔ جس کے لیے مصنف نے بہت ہی محنت و مشقت سے کام لیا ہے۔ اور 17 ذیقعدہ 1171ھ مطابق 1757 کو ان کا سال ولادت تسلیم کیا گیا ہے۔ (کتاب مذکور ص 75)

حسن صاحب کے ادبی کارناموں میں مذکورہ کتاب کے ساتھ ہی اردو کے مخفی افسانے، نئے معاشرے کا تنہا آدمی، اور ان کی شاعری کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ جس میں موصوف کے مذکورہ کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد کتاب کا پانچواں اور آخری باب شروع ہوتا ہے۔ جو 'علمی خدمات' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب بھی بڑا تفصیلی ہے جو 94 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں حسن صاحب کے علمی کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کا یہ حصہ بھی تحقیقی نوعیت کا ہے۔ یہاں پر علی ابراہیم نے حسن صاحب کی شخصیت کو کثیر الجہت تسلیم کرتے ہوئے ان کے علم نجوم سے واقف ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ان کو 'علم الاعداد' کا ماہر ثابت کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک علم الاعداد تاریخ انسانی کا پرانا فن ہے۔ قدیم حکما نے اس کے اصول و قواعد مرتب کیے ہیں۔ ان کے نزدیک کچھ علوم مخفی نوعیت کے ہوا کرتے ہیں۔ علم الاعداد بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ جس کے ذریعے ہم بہت سے پوشیدہ راز معلوم کر سکتے ہیں۔ اس باب میں انھوں نے اسی علم پر بڑی ہی تفصیلی و تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ جس سے اس کی اہمیت و عظمت واضح ہوتی ہے۔ جس میں تحقیق بسیار کے بعد یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اگرچہ یہ علم پہلے بھی رائج تھا مگر اس کو اصل علم کی شکل میں عربوں نے ہی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اعتراف کیا ہے:

''یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ حروف کی اعدادی قیمت سے سب سے پہلے عربوں نے ہی

کام لیا تھا۔ اس سے قبل حروف کے اعداد متعین تو ضرور تھے۔ لیکن بہ ظاہر ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ آج یورپ میں جو علم الاعداد کا رواج ہے وہ عربوں کا ہی شرمندہ احسان ہے۔'' (کتاب ہذا ص 206)

مختصر یہ کہ کتاب کا یہ باب بھی اپنی نوعیت کا منفرد باب ہے۔ اور حاصل کتاب بھی۔ اس کے بعد کتابیات کی فہرست دی گئی ہے اور سب سے آخر میں کچھ تصاویر بھی ہیں۔ جن میں حسن صاحب کے نام لکھے گئے مشاہیر ادب کے خطوط اور ان کی کتابوں کے سرورق کی تصویریں دی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب مکمل ہو جاتی ہے۔ الغرض یہ کہ کتاب پوری طرح تحقیقی نوعیت کی ہے۔ جس کو اردو کے علمی و ادبی سرمائے کا اہم حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور ہر طرح سے اس لائق ہے کہ اس کو خرید کر مطالعہ کیا جائے۔

تنقید بھی، تحسین بھی

مرتب و ناشر: محمد اسلام خان

صفحات: 520، قیمت: 291، سنہ اشاعت: 2021

مطبع: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد شرافت علی، (ٹاپ فلور) ٹاور بلڈنگ، کالندی کنج روڈ، شاہین باغ، نئی دہلی

'تنقید بھی، تحسین بھی' محمد اسلام خان کی پہلی مؤلفانہ ادبی کوشش ہے، جو 'حنیف ترین کی شاعری سے مکالمہ' ہی نہیں کرتی بلکہ شاعر موصوف کے قد و قامت کا بھی بڑی حد تک تعین کرتی ہے۔ حنیف ترین کی شعری کائنات کی تفہیم کے حوالے سے یہ کتاب ناقابل فراموش ہے کہ اس میں دور حاضر کے تقریباً تمام مستند و معتبر قلمکاروں کی تحریریں شامل ہیں، جنھوں نے حنیف ترین کی شاعری سے سیر حاصل بحث کی ہے، جو نتیجہ قائم کرنے اور شاعر کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے میں معاون و مددگار کہلاسکتی ہے۔

ہمارے عہد کا المیہ ہے کہ کوئی بھی قلم کار چاہے وہ شاعر ہو یا ادیب، افسانہ نگار ہو یا ناول نگار، وہ اپنے عہد میں ادبی تخلیقات کے حوالے سے شہرت و ناموری تو ضرور حاصل کرتا ہے، لیکن جب وہ اس دار فانی سے کوچ کر جاتا ہے، تو اکثر اسے بھلا دیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے سماج کی ایک ایسی حقیقت ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس پس منظر میں یہ بات بھروسے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ 'تنقید بھی، تحسین بھی' کے منظر عام پر آنے کے بعد حنیف ترین کو فراموش کرنا دنیائے اُردو کے لیے ممکن نہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے مطالعے کے بعد یہ تاثر ابھرتا ہے کہ محمد اسلام خان نے اہل علم کی تحریروں کی روشنی میں حنیف ترین کی شعری کائنات کی تفہیم جس انداز سے کی ہے، وہ شاعر مرحوم کو حیات جاودانی عطا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ 'تنقید بھی، تحسین بھی' یقیناً ایک ایسی کتاب ہے، جو حنیف ترین کو اس وقت تک زندہ و پائندہ رکھے گی، جب تک اردو دنیا میں کتابوں کی اہمیت مسلم اور باقی رہے گی۔ سالکان ادب جب جب ماضی کے شعرا کی تفہیم کی کوشش کریں گے، اکیسویں صدی کے مقبول و مشہور شاعر حنیف ترین کی شعری کائنات انہیں اپنی جانب متوجہ و مائل کرنے پر ضرور مجبور کریں گی۔......صرف اس وجہ سے نہیں کہ اس کتاب میں عہد حاضر کے مستند لکھنے والوں کے خیالات یکجا کر دیے گئے ہیں، بلکہ اس بنا پر بھی کہ صاحبان مضمون نے اپنی گراں قدر تحریروں کے ذریعے حنیف ترین کی شاعرانہ عظمت کا اپنے اپنے انداز میں محاسبہ کیا ہے اور یہ محاسبہ جب محمد اسلام خان کی توجہ کا مرکز بنا تو انہوں نے اسے 'حنیف ترین کے شعری مکالمہ' کے ذیل میں یکجا کرتے ہوئے شاعر موصوف کی قدر شناسی کی عمدہ کی کوشش کی۔

زیر نظر کتاب میں 'نقد و نظر' کے تحت 47 مضامین شامل اشاعت ہیں۔ اس ضمن میں جن صاحبانِ ادب کی تحریروں کو جگہ دی گئی ہے، ان میں وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، نثار احمد فاروقی، جوگندر پال، آئی کے گجرال، اقبال مجید، فہیم اعظمی، راج بہادر گوڑ، نظام صدیقی، قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، توقیر احمد خاں، اعجاز علی ارشد، مناظر عاشق ہرگانوی، سید مشکور حسین یاد، حکیم منظور، مصور سبزواری، فاروق نازکی، احمد سجاد، عبدالصمد، صلاح الدین پرویز، سیدہ حنا، مجید بیدار، رفیق راز، اقبال اعجاز بیگ، حمیدہ معین رضوی، اقبال واجد، غلام مرتضیٰ راہی، ظہیر غازی پوری، خواجہ اکرام الدین، حشمت صدیقی، عبدالاحد ساز، مولا بخش، محمد عاصم رضوی، شہناز پروین، نذیر احمد یوسفی، قمر سنبھلی، امام اعظم، ابوالفیض عزم سہریاوی، عالم خورشید، حقانی القاسمی، شعیب رضا فاطمی، مشتاق صدف، محمد ہادی رہبر، نعمان قیصر اور نبیل عارفی کے مضامین شامل اشاعت ہیں۔

'میزان' کے تحت حنیف ترین کے شعری مجموعوں پر ردعمل کی شکل میں سامنے آنے والی تحریروں کو مرتب کتاب نے نہایت سلیقے کے ساتھ شامل کتاب کیا ہے۔ اس ضمن میں حنیف ترین کی کتاب 'رباب صحرا'، 'ابابیلیں نہیں آئیں'، 'زمین لاپتہ رہی'، 'لالۂ صحرائی' اور 'دلت کویتا جاگ اٹھی' کا جائزہ لینے والی دو درجن قلم کاروں کی تحریریں شامل کتاب ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ 'محاسبہ' کے عنوان سے حنیف شناسی کی دعوت دیتا ہے، جس میں بشیر شاہ، حقانی القاسمی اور غلام نبی کمار نے شاعر مرحوم سے خصوصی انٹرویو کے ذریعے ان کی شاعری اور شخصیت کو منصۂ شہود پر لانے کی کوشش کی ہے۔

درحقیقت یہ کتاب اشاعت کے مرحلے میں ہی تھی کہ حنیف ترین اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مؤلف کتاب نے نہایت فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور بعد از رحلت حنیف ترین کی شخصیت کے حوالے سے منظر عام پر آنے والی چند اہم تحریروں کو 'پس مرگ' کے عنوان سے شامل کتاب کرنے کی اضافی کوشش کی۔ اس ضمن میں 9 تحریریں شامل کتاب ہیں، جو حنیف ترین کی شخصیت کو سمجھنے کے حوالے سے نہایت ہی کارآمد کہلاسکتی ہیں۔ ابرار رحمانی، سہیل انجم، ظفر انور، شمس کمال انجم، خاور حسن، غلام نبی کمار، قسیم اختر، حبیب سیفی اور راقم الحروف کی تحریریں 'پس مرگ' کے تحت شامل کتاب ہیں۔ مختصر یہ کہ 520 صفحات پر مشتمل کتاب 'تنقید بھی، تحسین بھی' حنیف شناسی کا حق ادا کرنے والی پیش کش قرار پانے کے لیے کافی ہے۔ برسبیل تذکرہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ کتاب کے آخر میں شاعر مرحوم کی اہم شخصیات کے ساتھ لی گئی درجن بھر تصویریں بھی شامل ہیں، جن سے ان کے وسیع تر تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔ کتاب کا سرورق عمدہ ہے اور بیک کور پر حنیف ترین کو جینت پرمار کی جانب سے عمدہ لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس ادبی کوشش کے لیے محمد اسلام خان مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسی شخصیت کی قدر شناسی کی ہے جو اردو شاعری کی دنیا میں تقریباً 5 دہائیوں تک نہایت مقبول و معروف شاعر کے طور پر کامیابی کا جھنڈا گاڑتا رہا اور 'دور کورونا' میں موذی مرض کا شکار ہو کر نہایت خاموشی کے ساتھ اللہ کو پیارا ہوگیا۔

مضامین / کالم

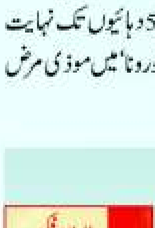

ایوان فکر

مرتب: ڈاکٹر محمد ارشد حسین

صفحات: 352، قیمت: 350، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: احتشام الحق، انچارج ہیڈ ماسٹر، نئی تعلیم راجکیہ بنیادی، ودیالیہ مجھولیا، حیا گھاٹ، دربھنگہ 846002 (بہار)

ڈاکٹر محمد ارشد حسین ٹیچرس ٹریننگ کالج میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ وہ گزشتہ چند برسوں سے جامعاتی تحقیق کے ساتھ دیگر موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر ارشد حسین نے اپنی اس کتاب میں مشہور کالم نویس ڈاکٹر مشتاق احمد پرنسپل سی ایم کالج دربھنگہ کے ان کالم اور مضامین کو یکجا کیا ہے جو ہندوستان کے مختلف اخبارات و جرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔ کالم نویس سماج کا ایک بیدار اور باشعور فرد ہوتا ہے جس کی نظر سماج، معاشرہ اور ملک و دنیا کے حالات پر بڑی گہری ہوتی ہے۔ وہ سماج و معاشرہ اور قومی و بین الاقوامی سماج و سیاست اور تہذیب و ثقافت کے اتھل پتھل اور تصادم کے ساتھ سماج کی ظاہری سطح پر ہونے والی ہلچل اور بسا اوقات تہہ میں پیدا ہونے والی خفیف سی حرکت کو بھی محسوس کرتا ہے۔ وہ واقعات و اخبارات پر نظر رکھتا ہے اور ملفوظی خبروں کے بین السطور کے مبہم بیانیے پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے۔ وہ خبروں میں پیش ہو رہے حقائق کے علاوہ خبروں کے بطن میں جا کر حقائق کی تلاش کرتا ہے اور پھر اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ کسی واقعہ کے بعد مستقبل میں پیدا ہونے والے حالات بھی اس کی نگاہوں میں پھرنے لگتے ہیں۔ ایک اچھا کالم نویس اپنے کالم میں مستقبل میں پیدا ہونے والے خطرات سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے۔ کالم نویس کسی مسئلے میں رائے عامہ ہموار کرنے میں بڑا کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے موجودہ مسائل میں سے کسی اہم مسئلے پر سماج کو راہ دکھاتا ہے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر مشتاق احمد میں اچھے کالم نویس کی بہت سی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور ان کے کالم نظر اشتیاق سے پڑھے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ارشد نے اپنی کتاب میں ڈاکٹر مشتاق کے بہتر (72) کالموں کو جمع کیا ہے۔ مصنف اور مرتب کی دی ہوئی معلومات کے مطابق اس کتاب میں روزنامہ انقلاب، روزنامہ راشٹریہ سہارا اور عالمی سہارا میں مطبوعہ کالموں کو شامل کیا گیا ہے۔ مشمولہ کالم کے عناوین پر سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ادبی، علمی، سیاسی، سماجی، مذہبی، تعلیمی، اقتصادی، شخصی اور تہذیبی و ثقافتی موضوعات شامل ہیں جس کا دعوی مرتب نے بھی اپنے مقدمہ میں کیا ہے۔

عام طور پر اخبارات کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے۔

شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش

اخبارات کے مشمولات میں خبروں کے علاوہ جو اجزا ہیں وہ بھی ٹھیلوں اور خوانچوں پر اگلے دن ٹھونگے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جو لوگ علمی انداز کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں وہ ضروری چیزوں کے تراشے رکھنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اخبار میں کالم بھی وہ جزو ہے جس کو تراشا بنا کر رکھا جاتا ہے اور کئی دفعہ بعض کالم بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اخباروں کے تراشے رکھنا کارے دارد اور اس کو برسوں سنبھال کر رکھنا بڑا مشکل امر ہے۔ ڈاکٹر ارشد نے ایسے کالموں کو یکجا کر کے باذوق افراد کی محنت آسان کر دی ہے اور کالموں کو دست برد زمانہ کے ہاتھوں پامال ہونے سے بچا لیا ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر عبدالرحمٰن ارشد (استاذ نہرا +2 اسکول) اور ڈاکٹر جاوید اختر (استاذ مڈل اسکول مریٹھا، جالے) بھی ڈاکٹر مشتاق احمد کے کالموں کے ایک وافر حصے کو کتابی صورت دے چکے ہیں۔ ڈاکٹر ارشد نے اس تسلسل کو قائم رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے مقدمہ میں صحافت، کالم نویسی اور کالم نویس ڈاکٹر مشتاق احمد کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ کتاب میں شامل کالموں کا بھرپور تجزیہ بھی پیش کیا ہے جس سے کالموں کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔ حالانکہ بعض کالموں میں پیش کی گئی آرا سے اختلاف کے امکان کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ ایک اچھا کالم اپنے عہد کا بے گرد آئینہ اور اپنے سماج کا مظہر ہوتا ہے۔ کالم میں چونکہ خبروں کے پیچھے جا کر خبروں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی حیثیت لکھے جانے کے وقت جو ہو لیکن جوں جوں وہ اپنے عہد تحریر سے دور ہوتا جاتا ہے تاریخی نوعیت کا بنتا جاتا ہے۔ کالم نویس کی شخصیت اور کاوش کے اعتبار سے اس کی حیثیت مستند دستاویز کی ہوتی ہے۔ ایسا سمجھا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ارشد کی یہ کتاب تاریخی اور دستاویزی حیثیت کی حامل ہوگی۔ توقع ہے کہ اہل نظر ڈاکٹر ارشد کی اس کاوش کو سراہیں گے۔ کتاب طلبہ، اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔

فکشن

ذہن زاد

مصنف: توصیف بریلوی

صفحات: 150، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر ذاکر فیضی، آئی 10، مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ افسانہ لکھنا انتہائی محنت و ریاضت اور غور و خوض کا متقاضی ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کو اپنے مطالعے، مشاہدے اور تخیل سے اس طرح کام لینا ہوتا ہے کہ قاری کو کہانی کی تفہیم میں دشواری نہ ہو اور کردار کی نفسیاتی گتھیاں اس طرح سامنے آ جائیں جیسے یہ اُس کا اپنا تجربہ ہو۔ مگر بہت کم فنکار ایسے ہوتے ہیں جو ان نکات پر خصوصی توجہ دے کر افسانہ تحریر کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں جو نئے افسانہ نگار اردو دنیا میں وارد ہوئے ہیں ان میں اکثر افسانہ نگار نہایت محنت اور لگن سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ یہ وہ افسانہ نگار ہیں جو افسانہ نگاری کو وقت گزاری کا ذریعہ نہیں مانتے بلکہ اس کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔

ایسے ہی افسانہ نگاروں میں توصیف بریلوی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ذہن زاد'' ہمارے سامنے ہے۔

زیر نظر افسانوی مجموعے میں بیس افسانے شامل ہیں۔ تمام ہی افسانے قابل مطالعہ ہیں اور بنا کسی دشواری کے قاری افسانے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے مشہور و معروف افسانہ نگار سید محمد اشرف فرماتے ہیں:

''توصیف بریلوی کے افسانوی مجموعے 'ذہن زاد' کے افسانے اکیسویں صدی کے افسانے ہیں۔ کرداروں کی سوچ، اُن کے عمل، ٹیکنالوجی اور روزمرہ کی زندگی کے لوازمات، سب کے سب بالکل نئے لگتے ہیں۔ نئے پن کے علاوہ ان افسانوں میں یہ بھی ایک خوبی ہے کہ یہ افسانہ نگار دل لگا کر کہانی لکھنا چاہتا ہے۔''

مجموعے کا پہلا افسانہ 'جیلر' ہے۔ یہ افسانہ علامتی رنگ لیے ہوئے ہے اور بہت دلچسپ افسانہ ہے۔ گو کہ اختصار کی وجہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے کہیں کسی آنچ کی کمی رہ گئی۔

افسانہ 'جیلر' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں کتابیں کس قدر اہمیت کی حامل ہیں۔ نیز یہ بھی کہ انسانیت کی بقا کے لیے مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ کتابوں کے مطالعے سے ہی کوئی سماج ترقی کرتا ہے، آگے بڑھتا ہے۔

مجموعے کا سب سے اہم افسانہ 'ذہن زاد' ہے، جس پر تخلیق کار نے کتاب کا عنوان بھی قائم کیا ہے۔ 'ذہن زاد' ایسے شخص کی کہانی ہے جو اولاد کی دولت سے محروم ہے مگر تصوراتی دنیا میں اس کے دو بچے ہیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ کہانی کو نہایت سلیقے سے خلق کیا گیا ہے۔ کہانی کے اختتام پر قاری کو انکشاف ہوتا ہے کہانی کے مرکزی کردار نے جن دو بچوں کی پرورش کی ہے، جن کو تعلیم دلا کر زندگی جینے کا سلیقہ سکھایا ہے، دراصل وہ بچے خیالی دنیا کے باشندے ہیں۔ ان کا وجود حقیقی دنیا میں ہے ہی نہیں۔

اس کتاب کے افسانے پڑھتے ہوئے بہت سے جملے آپ کو ایسے ملیں گے جن کو

پڑھ کر آپ زیرِ لب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ توصیف بریلوی کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ اپنے افسانوں کے ذریعے قاری کو جو بھی پیغام دینا چاہتے ہیں، اس کی ترسیل میں کسی طرح کی دشواری نہیں ہوتی۔

اس افسانوی مجموعے میں آپ کو ایسے دلچسپ اور انوکھے افسانے پڑھنے کو ملیں گے، جو آپ کو ان دیکھی دنیا کی سیر کرائیں گے۔ توصیف بریلوی کہانی کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے افسانے لائق مطالعہ ہیں۔ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ وہ آئندہ بھی ایسے ہی دلچسپ اور مزیدار افسانے لکھتے رہیں گے۔ کتاب کا سرورق نہایت خوب صورت ہے۔ پروف کی غلطیاں بہت معمولی ہیں اور طباعت صاف ستھری ہے۔

انشائیے

رنگ رنگ کے شاعر

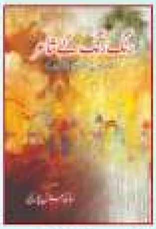

مصنف: ساجد جلال پوری

صفحات: 224، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر : سرور مہدی

اسسٹنٹ پروفیسر، ایچ ایس کالج، مادھوپورہ۔ 852220 (بہار)

ساجد صاحب خود بھی اچھے شاعر ہیں اور معنوی اعتبار سے آتش و ناسخ کے مکتب کے پروردہ.. سنگلاخ زمینوں کو رام کرنے کی دھن میں مست۔ اپنی نجی زندگی میں بھی شعرا سے واسطہ رہا، ہر شاعر کے اندر کے شاعر کو دیکھا، پہچانا اور ان کی ہیئت کذائی گونا گوں خصوصیات کے ساتھ زیب قرطاس کردی۔ اپنی شاعرانہ رنگ طبیعت بھی ظرافت کے گلشن پر جا بجا چھوڑا ہے۔ فکر و خیال کے دامن فلک پر اپنی یادداشت سے لے کر اشعار کے ستارے ایسے ٹانکے ہیں کہ لطف دوبالا ہوگیا ہے۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ 'رنگ رنگ کے شاعر' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

ساجد صاحب بھی اپنے حافظے کی قید سے اساتذہ کے اشعار کو مضمون کی 'ڈیمانڈ' پر رہا کرتے جاتے ہیں اور اسلوب کو شگفتہ سے شگفتہ تر بناتے جاتے ہیں۔ یہ برجستہ اشعار جہاں پڑھنے والے کو چونکاتے ہیں وہیں مسرت سے ہمکنار بھی کرتے ہیں۔ انشائیے کی عبارت اکثر مقامات پر اشعار کے لیے تمہید کا کام کرتی ہے اور سنجیدہ اشعار ایک نئے پہلو سے ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور اشعار کی یہ مزاحیہ تشریح نظم کی نثری پیروڈی معلوم ہوتی ہے۔

ساجد جلال پوری کا اسپ قلم بلاشبہ انشائیہ نگاری کے میدان میں بڑا تیز گام ہے۔ طنز کی نشتریت سیدھے دل میں محسوس ہوتی ہے تو مزاح کی لطافت لبوں کو متبسم کر دیتی ہے۔ طنز اور مزاح کے بیچ بیچ موصوف بڑے معنی خیز اور علمی اشارے بھی کر جاتے ہیں کہ چشم شعور روشن ہو جاتی ہے۔ 'شاعر کباب' کی یہ عبارت دیکھیے کتنی مدلل ہے:

''سائنسی اور تاریخی نقطہ نظر سے کباب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی اس سرزمین پر انسانوں کی آمد کی۔ قدیم پتھر کے زمانے میں جب لوگ پیڑوں کے پتوں سے جسم ڈھانپتے تھے اس وقت بھی جانوروں کا شکار کرتے تھے تو اس کو بھون کر کباب کی طرح کھا جاتے تھے۔''

طنز و ظرافت ہو یا کوئی صنف ادب، اس کا اولین فریضہ بلکہ نصب العین انسانی معاشرے کی اصلاح و تعمیر ہے۔ کہیں کوئی 'بندہ آزاد' داد و تحسین سے بے نیاز ہو کر 'گوش بشریت' کو اشعار کے ذریعے متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کہیں کوئی فکشن نگار اساطیری اسلوب کی بندشوں کے ذریعے قاری کے خفتہ احساسات پر ضرب لگانے کی سعی مشکور کرتا نظر آتا ہے۔ مزاح بھی ایک طرف ہونٹوں کو تبسم ریزی کے حوالے کرتا ہے تو دوسری طرف دل و دماغ کو غور و فکر کی تحویل میں دے دیتا ہے اور قاری یک لخت قہقہے کے بعد بہت کچھ سنجیدہ باتیں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ساجد صاحب اپنی ذاتی زندگی میں بے حد سنجیدہ انسان ہیں جن سے گاہے گاہے ادبی ظرافتیں بھی پھوٹتی ہیں۔ موصوف نے اپنی کتاب میں شاعروں کے مختلف چہرے، رویے، اعمال و افعال دکھا کر قارئین کو ہنسایا ضرور ہے لیکن اس میں ادب کی بنیادی ضرورت سے غفلت نہیں برتی گئی ہے۔

ساجد صاحب کے انشائیوں میں کلاسیکی ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے بھی بھرپور مواد موجود ہے۔ کیونکہ موصوف نے کوئی صرف آج کے شاعروں کا ذکر تو کیا نہیں بلکہ متقدمین سے لے کر معاصر شعرا تک سب ہی اس 'جام جہاں نما' میں نظر آتے ہیں کیونکہ انسانی فطرت (شاعرانہ فطرت اس لیے نہیں کہا کہ شاعر کی تمام خوبیاں اور خامیاں بحیثیت انسان ہیں جو مشغلہ کے اعتبار سے ظہور پذیر ہوتی ہیں) ازل سے تا حال ایک جیسی ہے۔ کل بھی بھانت بھانت کے شاعر تھے اور آج بھی 'رنگ رنگ کے شاعر' ہیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں تمام شعرا زمانی قیود کو توڑ کر چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ساجد جلال پوری نے اپنی تحریروں کو کلاسیکی شعرا کے ذکر سے سجایا بھی ہے۔ ذوق، داغ، محمد حسین آزاد، حالی، میر، غالب اور اقبال کے ذکر سے انشائیوں کا قد اقبال بلند کیا ہے تو سودا، ناسخ، امیر مینائی، شاد اور رنگین کی حکایات سے نثر کو رنگینی بھی عطا کی ہے۔ اس طرح موصوف معاصر شعرا کے خشم و غضب سے بھی گلوخلاصی کرنے میں کامیاب ہیں۔ اسلامی تاریخ کے لطیف واقعات سے بھی مضامین لیے ہیں اور اپنے اساطیری ذوق اور فن دونوں کو طشت از بام کیا ہے۔ ان ادبی اور تاریخی واقعات سے ساجد صاحب کی محنت شاقہ اور کثرت مطالعہ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ساجد جلال پوری کے انشائیے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی کافی لطیف ہیں۔ زبان شستہ اور اسلوب شگفتہ ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی باندھ کر رکھنے والی زبان پڑھنے کے بعد حیرت سی ہوتی ہے کہ الفاظ ادق بھی نہیں ہیں اور ایسے پست بھی نہیں ہیں کہ ادبی شان مجروح ہو جائے۔ ایک سادہ نثر ہے جو لطافت سے مکمل ہم آہنگ ہے۔ اکثر جگہوں پر مقفیٰ عبارت نے زبان کے حسن کو چار چاند بھی لگائے ہیں اور مضامین کو متنوع بھی بنایا ہے جیسا کہ انشائیہ نگار نے مقفیٰ الفاظ کے سہارے ہی جا بجا اپنی فکر کے پروں کو پھیلایا ہے۔ خوشگوار تعجب یہ ہوتا ہے کہ مقفیٰ الفاظ کی تلاش میں بھی ساجد صاحب سادگی اور شستگی کی سرحد کو عبور نہیں کرتے۔ ایسی ہی قافیہ بند تحریر کا ایک اقتباس دیکھیے:

''استادی کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ اس کا جسمانی قد بلند ہو، معتبر استاد کا فرزند ارجمند ہو، فارغ بخارا و سمرقند ہو۔ بلند اقبال ہوں یا فارغ البال ہوں۔ مہینوں فارغ غسل ہوں یا روز قابل غسل ہوں۔ خوش پوشاک ہوں یا دانت محتاج مسواک ہوں بلکہ ذاتی صلاحیت، دماغ کی قدر و قیمت، فکر کی بلندی دیکھی جاتی ہے۔'' (استاد الشعرا)

مجموعی طور پر کتاب 'رنگ رنگ کے شاعر' طنز و ظرافت کا بہترین نمونہ اور ادبی و تاریخی نگار خانہ ہے۔ بیان و سخن کی راہ کبھی بند نہیں ہوتی۔ اس قول کی روشنی میں کتاب کے مضامین سے بحث کی جا سکتی ہے کیونکہ تنقید کا مطلب کسی فن پارے پر خط بطلان کھینچنا نہیں ہوتا بلکہ تنقید سے سخن کی راہ مزید ہموار ہوتی ہے بشرطیکہ تنقید صحت مند ہو کسی بیمار ذہنیت کی نمائندہ نہ ہو۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

ہندوستان مختلف تہذیبوں، زبانوں اور مذاہب کے ماننے والوں کا احترام کرتا ہے: ڈاکٹر کرشن گوپال جی

موہن بھاگوت جی کی کتاب 'بھوشیہ کا بھارت' کے اردو ایڈیشن 'مستقبل کا بھارت' کی رسم اجرا

نئی دھلی: ہندوستان کا ہزاروں سالہ ماضی بہت تابناک رہا ہے۔ تعلیم، معیشت، تہذیب اور ثقافت کے شعبوں میں ہندوستان نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ہندوستان محبت، اخوت، اور یگانگت میں یقین رکھتا ہے، وہ مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور زبانوں کو قبول کرتا ہے اور ان کے ماننے والوں اور بولنے والوں کا احترام کرتا ہے۔ اسی لیے ہندوستان قدیم زمانے سے ہی بہت سی بولیوں، مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ ماضی کی طرح ہندوستان کا مستقبل بھی روشن ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر کرشن گوپال جی سہ کاریہ واہ آر ایس ایس نے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے سر سنگھ چالک ڈاکٹر

ہے۔ انھوں نے کہا کہ دیش بھکتی عام آدمی میں بھی ہونی چاہیے۔ کیونکہ سنگھ کا خیال ہے کہ اگر عام آدمی صحیح ہوگا تو جماعتیں صحیح ہوں گی اور سماج و ملک مضبوط ہوگا۔ انھوں نے لفظ 'ہندو' کے وسیع تر مفہوم پر بھی روشنی ڈالی اور اور ہندوتوا کے بنیادی نظریات پر بھی بات کی۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے استقبالیہ تقریر میں کہا کہ ہندوستان بہت مقدس زمین ہے۔ اسے ساری دنیا میں محبت و یکجہتی کے لیے جانا جاتا ہے اور یہاں کثرت میں وحدت پائی جاتی ہے۔ یہاں سبھی مذاہب و نظریات کو عزت دی جاتی ہے اور سبھی طبقات کو مساویانہ حقوق حاصل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وقت کی ضرورت کو محسوس

موہن بھاگوت کی کتاب 'بھوشیہ کا بھارت' کے اردو ایڈیشن 'مستقبل کا بھارت' کے اجرا کے موقع پر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے ملٹی پرپس ہال میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ موہن بھاگوت جی کی یہ کتاب بھارت کے مستقبل کی تصویر کشی کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ بھارت کا پیغام سچ کا پیغام ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب دراصل ان خطبات پر مشتمل ہے جو بھاگوت جی نے چند سال قبل تین دن تک پیش کیے تھے اور اس میں انھوں نے بھارت کے مستقبل کے حوالے سے تفصیلی بحث کی تھی۔ ان خطبات میں انھوں نے آر ایس ایس سے متعلق کیے گئے سوالات کے جوابات بھی دیے تھے۔ ڈاکٹر کرشن گوپال جی نے آر ایس ایس کے نظریات پر تفصیل اور تحقیق سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آر ایس ایس ملک کی سب سے منظم تنظیم ہے جو تمام ہندوستانیوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتی ہے، سب کی ترقی چاہتی ہے۔ آر ایس ایس یہ بھی چاہتی ہے کہ بھارت کے تمام لوگ بھارت سے سچا پیار کریں، سچے دیش بھکت ہوں۔ اسی پر بھارت کی ترقی کا انحصار ہے۔ انھوں نے کہا کہ سنگھ کے بنیاد گزاروں نے دیش کی ترقی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا تھا۔ آج سنگھ اسی کو آگے بڑھا رہا

کرتے ہوئے انھوں نے بھاگوت جی کی کتاب 'بھوشیہ کا بھارت' کا ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب کے ذریعہ ہم بھارت کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ مسلمانوں اور سنگھ کے درمیان بات ہونی چاہیے اور ان کے درمیان جو دوریاں ہیں وہ ختم ہونی چاہیے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر جناب سراج قریشی نے شیخ عقیل احمد کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب سے ہمیں بہت کچھ سیکھنا چاہیے، مسلمانوں کو بھاگوت جی کو سمجھنا چاہیے۔ کچھ ایسے مواقع ہونے چاہئیں کہ ان میں کمیونٹی کے لوگ بیٹھ سکیں۔ آر ایس ایس دنیا کی سب سے منظم جماعت ہے، ہمیں اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس سے سیکھنا چاہیے۔

آخر میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے سبھی مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں سماجی اور علمی شخصیات موجود رہیں۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 اپریل 2021

ہر زبان کا اپنا لٹریچر اور مزاج ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی کونسل کے صدر دفتر میں لسانیات اور سماجی لسانیات پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے اثرات قبول کیے ہیں اور ان پر اپنے اثرات بھی ڈالے ہیں۔ان زبانوں کے باہمی رشتے ایک دوسرے کو مضبوط بناتے ہیں۔ ہر زبان کا اپنا لٹریچر ہے اور اپنا مزاج بھی۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف زبانوں کی اہم کتابوں کے وسیع پیمانے پر ترجمے کیے جائیں تاکہ ہندوستان کی ہر زبان کے دائرۂ ادب میں وسعت پیدا ہو اور ایک دوسرے سے لین دین کے عمل اور استفادے کی رفتار میں تیزی آئے ۔ان خیالات کا اظہار قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ لسانیات اور سماجی لسانیات پینل کی میٹنگ میں کیا۔انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل کے مذکورہ پینل کے تحت

ہندوستان کی مختلف زبانوں کے حوالے سے کام ہو رہا ہے، اس پینل کے تحت متعدد پروجیکٹس کو منظوری دی گئی ہے اور کئی اہم کتابیں اشاعت کے مرحلے میں ہیں۔

پروفیسر اودیش کمار مشرا نے کہا کہ علاقائی ادب پر قومی اردو کونسل جو کام کر رہی ہے، وہ قابل تحسین ہے۔اس کے ذریعے دیگر علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے جوڑا جاسکتا ہے۔ پروفیسر اشرف نے پنجابی کے لٹریچر کا اردو میں ترجمہ کرانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو اور پنجابی کا رشتہ بہت قریبی اور گہرا ہے۔اس رشتے کو مزید مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

لسانیات اور سماجی لسانیات کے پینل کی میٹنگ میں 16 پروجیکٹس پر غور وخوض کیا گیا۔جن میں ادبی اصطلاحات، وضاحتی فرہنگ اور اردو کے علاقائی روپ اہمیت کے حامل ہیں۔کئی اہم ڈکشنری پر کام کا فیصلہ بھی لیا گیا ہے جیسے تیلگو اردو ڈکشنری، اردو ملیالم ڈکشنری، اردو کشمیری ڈکشنری وغیرہ۔اردو مراٹھی ڈکشنری پر کام کے لیے ماہرین کی ایک ٹیم تشکیل دی گئی، جلد ہی اس پر ورکشاپ بھی منعقد کی جائے گی۔اس کے علاوہ کشمیر کے اہم علاقائی ادب اور کہانیوں (فوک لٹریچر) کا کشمیری سے اردو زبان میں ترجمہ کرانے کو منظوری دی گئی۔علاوہ ازیں علاقائی زبانوں جیسے پنجاب، بنگال، آسام، اڑیسہ پر کتابیں تیار کرانے کے سلسلے میں بھی بات کی گئی۔

میٹنگ میں پروفیسر ابوذر عثمانی، پروفیسر اے آر فتیحی، پروفیسر اعجاز محمد شیخ، نظیر احمد، پروفیسر محمد اشرف کے علاوہ قومی اردو کونسل سے وابستہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر)، فیروز عالم (ایجوکیشن آفیسر) محمد شہاب الدین قاسمی (ریسرچ اسسٹنٹ) نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 25 مارچ 2021

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوقِ کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

مولانا مظہرالحق توسیعی خطبہ

دربھنگہ: ساحر ایک ایسا شاعر ہے جو ساری زندگی امن کی بات کرتا رہا۔ ساحر کی شاعری اردو ادب کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا کا بھی ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ ساحر کی شاعری کو آج پھر سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ندیم احمد نے سی ایم کالج دربھنگہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے منعقدہ پہلے مولانا مظہرالحق توسیعی خطبے میں کہیں۔ انھوں نے ساحر کی انسان دوستی اور ہمدردی پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ساحر کے عشق نے انھیں کامیابی عطا کی۔ اس توسیعی خطبے میں بطور مہمان خصوصی للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے رجسٹرار اور معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر مشتاق احمد نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ ساحر ایک انقلابی شاعر تھے اور انھوں نے ترقی پسند نظریات کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ ان کی نظمیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عورتوں کو کتنی عزت دی ہے۔ توسیعی خطبے کی صدارت کرتے ہوئے سی ایم کالج دربھنگہ کے پرنسپل پروفیسر بشواناتھ جھا نے ساحر لدھیانوی کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ سی ایم کالج کے لیے آج کا دن تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ ہمارے کالج میں ساحر لدھیانوی کے صد سالہ یوم پیدائش پر اس توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ مالی تعاون کے لیے قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں اسی طرح سے سرکار کا تعاون ملا تو سی ایم کالج میں ہم ایک اردو بھون یا اردو مرکز کا قیام کرنا چاہیں گے جس کے تحت اردو زبان کی تعلیم و تربیت اور اردو زبان و ادب کے حوالے سے مزید پیش رفت کی جائے گی۔ اس سے قبل پروگرام کے آغاز میں سی ایم کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر ظفر عالم نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ساحر کی شاعری پڑھتے ہوئے کہیں بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا، ساحر کی شاعری ہر انسان کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ توسیعی خطبے کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ایم کالج کے استاد ڈاکٹر عبدالحی نے مختصراً مولانا مظہرالحق اور ساحر کی خدمات پر گفتگو کی۔ توسیعی خطبہ ڈاکٹر مسرور صغری کے کلمات تشکر پر ختم ہوا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 مارچ 2021

اردو کے فروغ میں متھلانچل کے غیر مسلم شعرا و ادبا کا حصہ

دربھنگہ: متھلا میں اردو زبان کی روشن تاریخ رہی ہے۔ ودیاپتی، ناگارجن جیسے شاعروں کی تخلیقات میں اردو کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ امیر خسرو نے بھی غالباً متھلا کا سفر کیا۔ ان کے کچھ اشعار میں میتھلی کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ بہاری لال فطرت کی کتاب آئینہ ترہت میں اردو کے غیر مسلم شعرا کا مفصل تذکرہ ملتا ہے۔ یہ باتیں سی ایم کالج دربھنگہ کے پرنسپل پروفیسر بشواناتھ جھا نے گذشتہ روز سی ایم کالج میں این سی پی یو ایل کے مالی تعاون سے منعقد یک روزہ قومی سمینار 'اردو کے فروغ میں متھلانچل کے غیر مسلم شعرا و ادبا کا حصہ' میں صدارتی خطاب میں کہیں۔ سمینار میں بطور مہمان خصوصی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ندیم احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ متھلانچل مشترکہ تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے، اور یہاں اردو کی ترقی دیکھ کر اچھا لگتا ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مانو کولکاتا کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر امام اعظم نے کہا کہ اردو کے فروغ میں ودیاپتی، ناگارجن، منشی آشارام ذوق، دیوان جیون لال تحقیق، منشی اجودھیا پرشاد، بہار منشی، مہادیو پرشاد منتظر، منشی کیول پرشاد فقیر، منشی مہاراج سنگھ دربھنگوی، جنگ بہادر جنگ اور بہاری لال فطرت وغیرہ کی خدمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ متھلا میں بھلے ہی میتھلی خوب پھلی پھولی لیکن اردو زبان ہی عوام و خواص کی زبان رہی ہے۔ اسی زبان میں یہاں لوگ گفتگو کرتے ہیں۔ اردو کی چاشنی نے سب کو اپنا اسیر کر رکھا ہے۔ انھوں نے سہ ماہی فکر و تحقیق میں للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر مشتاق احمد کے حال ہی میں شائع ہوئے ایک مضمون کا بھی حوالہ دیا اور کہا کہ یہ مضمون اس موضوع پر بہت جامع ہے۔ سمینار کے مہمان اعزازی صدر شعبہ اردو متھلا یونیورسٹی کے پروفیسر آفتاب اشرف نے متھلانچل کے ادیبوں اور شاعروں کا مختصراً تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ متھلا کی سرزمین ایسی ہے کہ یہاں سبھی عقائد کے ماننے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اردو کے فروغ میں متھلانچل کے ادیبوں کی قابل قدر خدمات رہی ہیں۔ دوسرے مہمان اعزازی پروفیسر محمد کاظم نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسا موضوع وقت کا تقاضہ ہے اور فروغ اردو کی کوششوں میں ہمیں سبھی مذاہب کے لوگوں کی خدمات کو یاد رکھنا چاہیے۔ سمینار میں سی ایم کالج کی صدر شعبہ انگریزی پروفیسر اندرا جھا نے بھی اظہار خیال کیا اور انگریزی نظم سے اردو نظموں کے رشتوں کی بھی نشاندہی کی۔ سمینار میں ڈاکٹر ارشد حسین، ڈاکٹر مظفر اسلام، ڈاکٹر نفاست کمالی، ڈاکٹر مسرور صغریٰ، فیروز عالم، ڈاکٹر شاہنواز عالم، ڈاکٹر محمد امان اللہ، خالد رضا خاں، محمد زبیر خان، فاروق احمد اور ڈاکٹر عبدالحی وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر مسرور صغریٰ نے کی جبکہ کلمات تشکر ڈاکٹر عبدالحی نے پیش کیے۔ کثیر تعداد میں دانشوران اور شائقین اردو شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 مارچ 2021

اسلام سے قبل ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات

نئی دھلی: سینٹر آف پرشین اینڈ سینٹرل ایشین اسٹڈیز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ایک روزہ بین الاقوامی سمینار 'اسلام سے قبل ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات' کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ یہ سمینار افتتاحی تقریب کے علاوہ کل تین اجلاس پر مشتمل تھا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر مظہر آصف چیئرپرسن وایسوی ایٹ ڈین سینٹر آف پرشین اینڈ سینٹرل ایشین اسٹڈیز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہندوستان اور افغانستان کے رشتے صدیوں پرانے ہیں۔ دونوں علم و دانش، زبان و ادب، انسان اور انسان دوستی اور گل و بلبل کے عاشق رہے ہیں۔ دونوں ممالک ہم زبان، ہم آہنگ اور ہم نژاد ہونے کے ساتھ ساتھ چانکیہ کی سیاست، گندھاری پسر دوستی، پانینی کی دانشمندی اور بودھ کے نروان کے عینی شاہد بھی رہے ہیں۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر مہیش چندر شرما نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ سچائی ایک ہے مگر اس کی قسمیں

مختلف ہیں۔ انھیں سچائیوں میں سے ایک افغانستان میں گندھارا ہے جو بودھ، مہاویر، اشوک اور ابراہیم بن ادہم جیسی عظیم ہستیوں کا مرکز رہا ہے۔ افتتاحی اجلاس میں پروفیسر خالق رشید نے ایک پرمغز کلیدی خطبہ پیش کیا۔ مہمان اعزازی پروفیسر سید عین الحسن نے ہندو افغان کے رشتوں پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ افغانستان کی زبان و بیان، کلچر اور وہاں کی آرمی سسٹم کو مضبوطی فراہم کرانے میں ہندوستان کا اہم کردار رہا ہے۔ اس سمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شہباز عالم اسسٹنٹ پروفیسر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے سمینار کا تعارف کرایا اور موضوع سے متعلق اہم گفتگو کرتے ہوئے اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی نظامت پروفیسر انور خیری نے کی جبکہ کلمات تشکر ڈاکٹر محمد مظہر الحق نے ادا کیے۔ افتتاح کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر خالق رشید نے فرمائی۔ اس اجلاس میں کل دس مقالے پیش کیے گئے۔ اس سیشن میں پروفیسر قیوم (افغانستان)، پروفیسر احمد غنی خسروی (افغانستان)، پروفیسر اخلاق آہن (دہلی)، پروفیسر انور خیری (دہلی)، عبدالرحمن نیازی (افغانستان)، پروفیسر محمود مرہون (افغانستان)، ڈاکٹر علاء الدین (دہلی)، ڈاکٹر محمد مظہر الحق (دہلی)، ڈاکٹر ایم این راجیش (حیدرآباد)، اور ڈاکٹر اخلاق آزاد (دہلی) نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے سیشن کی صدارت ڈاکٹر مہیش رنجن دیباتا نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر دیباسیش نندی، سنیتا دویدی، ناظر احمد یوسف، پرنیا شرما، ڈاکٹر شیلندر کمار سوائن، ڈاکٹر پرویش کمار گپتا، ڈاکٹر ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر الکا، ڈاکٹر مکیش کمار سنہا اور ارش پریت کور نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تیسرے سیشن کی صدارت شعبۂ پشتو کے سینئر استاد پروفیسر انور خیری اور شعبۂ فارسی کے سینئر استاد ڈاکٹر علاء الدین شاہ نے فرمائی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر محمد اجمل، ڈاکٹر محسن علی، ڈاکٹر ذوالفقار علی انصاری، ڈاکٹر عبدالواسع، ڈاکٹر اریہنت کمار وردھن، ڈاکٹر محمد عرفان، مسٹر پربھات چندر جھا، ڈاکٹر نند کشور، قرۃ العین، محمد عالم، سیما بھارتی، محمد شہواز عالم اور سنیل کمار وغیرہ نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ ویبینار کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر شہباز عالم، اسسٹنٹ پروفیسر (جے این یو) کا اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں اہم رول رہا۔ انھوں نے ٹیکنیکل ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تمام شرکائے سمینار کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 مارچ 2021

ہندوستان میں عربی زبان کی تدریس: حقیقت و امکانات

نئی دهلی: عربی زبان ایک زندہ و پائندہ زبان ہے، اس میں ہر زمانے کے ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود ہے، اس زبان کو سمجھنے اور بولنے والے دنیا کے بیشتر خطوں میں موجود ہیں۔ اس کی ترویج و اشاعت میں ہندوستان کا غیر معمولی کردار ہے۔ ان خیالات کا اظہار مملکت قطر کے ہندوستان میں سفیر مسٹر محمد بن خاطر الخاطر نے کیا۔ وہ آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے مالی تعاون سے اور شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے اشتراک سے 'ہندوستان میں عربی زبان کی تدریس: حقیقت و امکانات' کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ ورچوئل قومی سمینار کی افتتاحی تقریب میں بہ حیثیت مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ قبل ازیں صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے استقبالیہ کلمات میں برطانوی ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں دینی مدارس کی خدمات پر مفصل روشنی ڈالی۔ ایسوسی ایشن کے قومی صدر پروفیسر حبیب اللہ خان نے ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے سمینار کے موضوع کا تعارف کرایا۔ تقریب کی نظامت ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری پروفیسر رضوان الرحمن، چیئرپرسن سینٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز جے این یو نے کی۔ صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کے سابق ڈین استاذ الاساتذہ پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی نے کی۔ بعد ازاں پانچ اکیڈمک نشستوں میں ممبئی یونیورسٹی، بردوان یونیورسٹی، مغربی بنگال، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو، دہلی یونیورسٹی، ذاکر حسین دہلی کالج کے اساتذہ و اسکالرس نے مختلف موضوعات پر اٹھارہ مقالات پیش کیے۔ پہلی اکیڈمک نشست کی صدارت انڈیا عرب کلچرل سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد ایوب ندوی نے کی، دوسری نشست کی صدارت پروفیسر عبدالماجد قاضی صدر شعبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی، تیسری نشست کی صدارت پروفیسر رضوان الرحمن نے کی۔ چوتھی نشست کی صدارت پروفیسر سید حسنین اختر استاذ شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی نے کی، آخری اکیڈمک نشست کی صدارت ایسوسی ایشن کے صدر پروفیسر حبیب اللہ خان نے کی۔ جب کہ اختتامی تقریب کی صدارت ایسوسی ایشن کے سابق صدر پروفیسر محمد نعمان خان شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے کی۔ ایسوسی ایشن کے خازن ڈاکٹر مجیب اختر استاذ شعبۂ عربی ڈی یو نے سمینار کی رپورٹ پیش کی۔ صدر ایسوسی ایشن کے کلمات تشکر کے ساتھ بحسن و خوبی دو روزہ سمینار اختتام کو پہنچا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مارچ 2021

کووڈ 19: اردو و عربی زبان کو درپیش نئے چیلنجز

نئی دهلی: دنیا میں مختلف قسم کی بیماریاں آئیں اور گئیں، انسانی تاریخ میں ایسی کوئی بیماری نہیں آئی، جس نے پوری دنیا کے نظام کو درہم برہم کر دیا ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کووڈ 19 نے پوری دنیا کو اپنی زد میں لے کر طرز زندگی کے ساتھ ساتھ نظام تعلیم بھی بدل دیا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر حبیب اللہ خان، سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے این سی پی یو ایل کے مالی تعاون سے شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام 'کووڈ 19: اردو و عربی زبان کو درپیش نئے چیلنجز' کے موضوع پر شعبہ کے سمینار ہال میں منعقدہ دو روزہ قومی سمینار کی افتتاحی تقریب میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ کووڈ 19 نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمیں نئے دور کے نئے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھنا ہوگا، ہمیں ایسا نصاب مرتب کرنا ہوگا جو موجودہ مارکیٹ کی ڈیمانڈ کو پورا کرتا ہو۔ قبل ازیں شعبہ کے سینئر استاذ پروفیسر سید حسنین اختر نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے سمینار کے موضوع کا تعارف کرایا، صدر شعبہ پروفیسر نعیم الحسن اثری نے تقریب کی نظامت کی۔ انڈیا عرب کلچرل سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد ایوب تاج الدین ندوی نے صدارت کی۔ مہمان اعزازی پروفیسر ارتضی کریم ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں کووڈ 19 اور تعلیمی اداروں کو درپیش چیلنجز سے آگاہ کرتے ہوئے مرزا اسداللہ خان غالب سے منسوب ایک مکالماتی رسالہ سے شرکا کو محظوظ کیا۔ کلمات تشکر شعبہ کے استاذ ڈاکٹر مجیب اختر نے پیش کیے۔ بعد ازاں تین اکیڈمک نشستوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ و اسکالرس نے الگ الگ موضوعات پر دو درجن سے زائد مقالات پڑھے۔ سمینار کی پہلی اکیڈمک نشست کی صدارت جے این یو کے سینٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز کے استاذ ڈاکٹر عبیدالرحمن طیب نے کی۔ دوسری نشست کی صدارت ڈاکٹر نسیم اختر ندوی نے کی اور تیسری و آخری اکیڈمک نشست کی صدارت جے این یو کے شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر رضوان الرحمن نے کی۔ شعبۂ عربی ڈی یو کے استاذ ڈاکٹر اصغر محمود کے کلمات تشکر کے ساتھ سمینار اختتام کو پہنچا۔ اس موقعے

پر شعبہ کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔ اخیر میں سمینار کے کنوینر صدر شعبہ پروفیسر نعیم الحسن اثری نے شرکائے سمینار بطور خاص جے این یو کے شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر رضوان الرحمٰن کا ٹکنیکل سپورٹ کے لیے شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مارچ 2021

مفتی نسیم احمد فریدی کی ادبی خدمات

امروهه: آزاد ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی امروہہ کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے مالی تعاون سے ایک روزہ سمینار بعنوان 'مفتی نسیم احمد فریدی کی ادبی خدمات' ہاشمی گرلس ڈگری کالج، ہاشمی نگر امروہہ میں زیر سرپرستی ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی (چیئر مین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ) منعقد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت مفتی رفاقت صاحب (استاذ حدیث مدرسہ اسلامیہ عربی، جامع مسجد، امروہہ) نے فرمائی۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر سید محمد ہاشم (رکن اتر پردیش اردو اکادمی)، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، ڈاکٹر شاکر حسین اصلاحی (ایچ او ڈی شعبۂ اردو، مسلم گرلس ڈگری کالج، مراد آباد) موجود رہے۔ سمینار کی نظامت کے فرائض جواں سال شاعر، ادیب، صحافی سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ سمینار کا آغاز ڈاکٹر شاکر حسین اصلاحی نے نعتِ پاک پڑھ کر کیا جس کے بعد مقامی و بیرونی مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے کہا کہ مولانا مفتی نسیم احمد فریدی بہترین عالم دین، قادر الکلام شاعر اور صاحب طرز ادیب تھے۔ اتر پردیش اردو اکادمی کے سابق رکن سید محمد ہاشم نے مولانا مفتی نسیم احمد فریدی کی حیات اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ گذارش کی ہمیں ان کی خدمات کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کردار کو بھی زندگی میں جذب کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ مولانا مفتی نسیم احمد فریدی ایک بہترین عالم و فاضل اور ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مصلحِ قوم وملت تھے۔ ان کے علمی مقالات آج ہمارے لیے مشعل راہ اور رہنمائے ادب ہیں۔ ڈاکٹر شاکر حسین اصلاحی نے کہا کہ مولانا مفتی نسیم احمد فریدی صاحب امروہہ کی ایک اہم شخصیت تھے۔ اللہ کی حمد وثنا کے لیے جس پرتاثیر اور گداز لہجے کی درکار ہوتی ہے وہ حضرت مفتی صاحب کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے علاوہ ناصر امروہوی، سید شیبان قادری نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ صدارت فرمارہے مفتی رفاقت حسین نے کہا کہ حضرت مولانا نسیم احمد فریدی کی پوری زندگی علمی جدو جہد کی زندگی تھی۔ اللہ تعالی نے حافظہ بہت اچھا عطا فرمایا تھا۔ جو پڑھتے تھے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہو جاتا تھا۔ پروگرام کے تمام مہمانان کا گل پوشی کر کے استقبال کیا گیا۔ آخر میں غزالہ تبسم نے بھی کا شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 28 مارچ 2021

ہندوستان اور عرب دنیا: تہذیب اور امکانات

نئی دهلی: انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے منعقد ہونے والی 'ہندوستان اور عرب دنیا: تہذیب اور امکانات' کے زیرعنوان دو روزہ آن لائن نیشنل کانفرنس کا افتتاح عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر محمد اسدالدین، ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ سینٹر فار عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کلیدی خطبہ پیش کیا جب کہ ڈاکٹر عقیل احمد ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ کانفرنس کے کوآڈینیٹر ڈاکٹر آفتاب احمد نے تمام شرکا کا استقبال کیا اور کانفرنس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے موضوع کا تعارف پیش کیا۔ موصوف نے انڈیا عرب کلچرل سینٹر میں پڑھائے جانے والے مختلف کورسیز اور سینٹر کی جانب سے ترجمہ کی جانے والی مختلف کتابوں کا تذکرہ کیا، ہند و عرب کے درمیان مختلف ادوار میں تعلقات پر روشنی ڈالی اور دو روزہ قومی کانفرنس کے موضوع اور غرض و غایت کو واضح کیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے سینٹر فار عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے عرب و ہند تعلقات کے آغاز وارتقا، نیز ہندوستانی علما کی عرب و ہند تعلقات پر مختلف ادوار میں لکھی گئی کتابوں کا تذکرہ کیا نیز زمانہ قدیم سے ہند و عرب کے درمیان تجارتی اور ثقافتی تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے دونوں خطوں پر تہذیب وثقافت، علوم وفنون، ادب وفلسفہ، نیز حکمت سے متعلق ہندوستان اور عرب مورخین، ادبا اور رائٹرس کی تحریروں کا جائزہ لیا۔ موصوف نے خاص طور سے جاحظ، ابن ندیم، سلیمان التاجر کی کتاب نیز یعقوبی، مسعودی، مقدسی، ابو زید بلخی، البیرونی، ادریسی، قزوینی، ابن بطوطہ، شہرستانی وغیرہ مورخین کی کتابوں ے حوالے سے اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی کہ عرب مورخین ہندوستان کو کس نظریے سے دیکھتے ہیں، آپ نے ہندوستانی زبانوں کے عربی زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوستان کی سائنس، طب، ادب اور دوسرے علوم میں لکھی جانے والی کتابوں کے ترجمہ کا جائزہ پیش کیا۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی

مرزا شاہد نوحی: حیات وخدمات

دیو بند: قومی اردو کونسل نئی دہلی کے تعاون سے ایک سمینار کا انعقاد تعمیر ملت سمینار ہال مملانہ روڈ مظفر نگر میں کیا گیا۔ اس موقعے پر مظفر نگر کے بزرگ شاعر مرحوم مرزا شاہد نوحی

کی حیات و خدمات پر اسکائی لارک ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام سمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے چائلڈ ڈیولپمنٹ پروجیکٹ آفیسر راجیش کمار نے شرکت کی۔ سمینار میں میرٹھ کے فیض عام ڈگری کالج کے پروفیسر ڈاکٹر اسلم نے بتایا کہ مرزا شاہد نوحی ایک اردو مصنف تھے اور انھوں نے اردو ادب میں اہم کردار ادا کیا۔ سمینار میں ڈی اے وی ڈگری کالج کی پروفیسر محترمہ روحی جاوید نے بتایا کہ مرزا شاہد نوحی ایک کامیاب استاد اور مصنف تھے۔ انھوں نے اردو ادب میں آنے والی تبدیلیوں کے لیے جدید دور میں اسلامی کام کیا۔ سمینار میں راجیش کمار نے کہا کہ اردو زبان ملک کی گنگا جمنی تہذیب ہے۔ اردو کے موضوع پر سمینار کا انعقاد مستقبل میں بھی کیا جانا چاہیے۔ سمینار میں اردو مصنف اور شاعر ایاز احمد طالب نے کہا کہ اردو کے روشن مستقبل کے لیے اردو میڈیم اداروں کی اہم ضرورت ہے۔ ادارے قائم ہونے پر ہی ہم اور ہماری نئی نسل اردو سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ سمینار میں صداقت دیو بندی نے کہا کہ ہمیں گھر میں پڑھنے کے لیے اردو اخبار خریدنا چاہیے تب ہی نئی نسل اردو سے

فیضیاب ہوگی۔ سیمینار میں معروف شاعر عبدالحق سحر، روزنامہ اخبار مشرق سے چیف بیورو شاہد حسینی، معراج الدین وغیرہ مقررین نے مذکورہ عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار کا اختتام مولانا سفیر احمد کی دعا پر ہوا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 22 مارچ 2021

خورشید فارق میموریل لیکچر

نئی دہلی: دہلی قدیم تاریخ وتہذیب کا گہوارہ رہا ہے، ہر دور میں یہاں کی فضاؤں میں تہذیب و ثقافت کے آفتاب و ماہتاب نے اپنی روشنی سے سب کو فیض یاب کیا ہے، آزادی ہند کے قبل سے لے کر آج تک دہلی جہاں دیگر زبان وادب کے فروغ کا گہوارہ رہا ہے، وہیں عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کا بھی مرکز رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار عربی دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام شعبہ کے سیمینار ہال میں منعقد چودہویں خورشید فارق میموریل لکچر میں 'عربی ادبیات کے افق پر دہلی کے تابندہ ستارے' کے موضوع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر شفیق احمد خان ندوی نے اپنے لکچر میں کیا۔ انھوں نے اپنے لیکچر میں مدرسہ غازی الدین سے لے کر موجودہ ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے معروف و مشہور اساتذہ کے علمی کارناموں کا احاطہ کرتے ہوئے مذکورہ موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ قبل ازیں مہمان مقرر کا تعارف ڈاکٹر مجیب اختر نے کرایا۔ نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر اصغر محمود نے کی۔ لکچر سیریز کا تعارف پروفیسر محمد نعمان خان نے پیش کیا۔ استقبالیہ کلمات شعبہ کے صدر پروفیسر نعیم الحسن اثری نے پیش کیے، جب کہ کلمات تشکر شعبہ کے استاذ ڈاکٹر محمد اکرم نے ادا کیے۔ تقریب کی صدارت پروفیسر عبدالماجد قاضی نے کی، انھوں نے دہلی کے علمی مراکز سے وابستہ علمی وادبی شخصیات کی خدمات کی ستائش کی۔ تقریب کے مہمان اعزازی پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے کلمات سے شرکا کو مستفید کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 مارچ 2021

داستان کی جمالیات

لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی اشتراک سے خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی میں مجاز لیکچر سیریز کے تحت 'داستان کی جمالیات' کے موضوع پر ایک خطباتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابن کنول نے اپنا خصوصی خطبہ پیش کیا۔ صدارت فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر مسعود عالم نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر اکمل شاداب نے انجام دیے۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر سید شفیق اشرفی نے کہا کہ داستانیں اساطیری روایتوں کی امین اور ہمارے اجتماعی لاشعور کا گنجینہ ہیں۔ مابعد جدید دور میں ان کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے۔ ترقی پسندی کے حقیقت پسندانہ رجحان میں داستانیں ایک عرصہ تک ادبی کینوس سے دور نظر آتی ہیں لیکن اب ان کی کثیر الجہات معنویت کو محسوس کرلیا گیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے امیر حمزہ پر بیس سال سے زیادہ کا وقت صرف کر کے اس کے خزینوں کو انڈیل دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ داستانیں دکن اور شمالی ہند، دونوں جگہ نظر آتی ہیں لیکن ان کو جو فروغ لکھنؤ میں ملا اس کی مثال کہیں نہیں ملتی، داستان کے فروغ میں مطبع منشی نول کشور کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر اور تصدق حسین ہمارے بڑے داستان گو ہیں لیکن ان کی زندگی کی سوانحی داستانیں چند اوراق پر سمٹی ہوئی ہیں ہمارے تحقیق کے میدان کے طلبہ کو اس طرف دھیان دینے کی اشد ضرورت ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ داستانوں کے مطالعے سے ہمیں اس کلچر سے واقفیت ہوتی ہے جس کلچر میں اردو ادب کی مختلف اصناف کو ترقی ملی اور اس ترقی میں معاشرے کا کوئی مخصوص طبقہ نہیں بلکہ ہر فرد کوشاں نظر آتا ہے۔ افسانہ اور ناول لاکھ مغربی ادب کی دین ہوں لیکن ان کی جڑیں داستانوں سے اپنی غذا کشید کرتی ہیں۔ داستانیں اردو کی حکائی ادبی روایات کا ایک اہم جزو ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 22 مارچ 2021

ادب اور سماج کا رشتہ

لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے وینس پرشلشن کلا کیندر کے زیر اہتمام سینٹ روز پبلک اسکول گڑھی پیر خاں ٹھاکر گنج میں بعنوان 'ادب اور سماج کا رشتہ' ایک روزہ سیمینار ہوا۔ اس علمی وادبی تقریب کا آغاز عرفان مہدی کی نعت پاک سے ہوا۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر قمر جہاں سابق صدر شعبۂ اردو بنارس یونیورسٹی نے کی جبکہ بطور مہمان خصوصی نہال روی سابق چیئرمین فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، مہمان ذی وقار سید مہتاب حیدر صفی پوری اور مہمان اعزازی انا اعظمی شریک ہوئے۔ موضوع منتخبہ پر ڈاکٹر ہارون رشید، رضوان فاروقی، سید مہتاب حیدر صفی پوری، شکیل گیاوی اور ڈاکٹر منصور حسن خاں نے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر قمر سیتاپوری، ڈاکٹر منصور حسن خاں، رضوان فاروقی، شکیل گیاوی، جلال لکھنوی، انا اعظمی نے شعری کلام بھی پیش کیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر ثروت تقی نے کی۔ اظہار تشکر سوسائٹی کی جنرل سکریٹری جذبی رضا نے ادا کیا۔ شرکا میں نغمہ صبا، نغمہ پروین، رضوان ملیح ابادی، مصور احمد اور اختر جمال کے نام قابل ذکر ہیں۔ صدر تقریب پروفیسر قمر جہاں نے کہا کہ ادب کا سماج سے گہرا رشتہ ہے اور اس رشتہ کو کسی خاص عہد سے جوڑ کر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ ہر دور کا ادب اپنے سماج کی نمائندگی کرتا ہے۔ ادب ہمیں راستہ دکھاتا ہے کہ ہمیں کس طرح اور کس طرف چلنا ہے۔ جس موضوع پر مقالات پڑھے گئے اس میں تاریخی حوالوں کی روشنی میں کافی مواد تھا جو ہمیں ادب کے سابقہ اور موجودہ روایات اور قدروں سے متعارف کرا رہے تھے۔ مہمان ذی وقار سید مہتاب حیدر نے کہا کہ ادب اور سماج کا رشتہ لازم وملزوم ہے۔ سماج سے ادب کی تخلیق ہوتی ہے اور ادب سے سماج کی تعمیر ہوتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 مارچ 2021

پروفیسر اسلوب احمد انصاری فن اور شخصیت

بجنور: پروفیسر اسلوب احمد انصاری بنیادی طور پر انگریزی کے استاد تھے۔ اردو انگریزی کے عالمی شہرت یافتہ نقاد بھی۔ انگریزی میں آپ کا محبوب شاعر شیکسپیئر اور اردو میں علامہ اقبال تھے۔ مندرجہ بالا خیالات کا اظہار ڈاکٹر شبنم خان ہیڈ مسٹریس اجمل خاں سینئر سیکنڈری اسکول دہلی نے ہیلپنگ ہینڈ ٹرسٹ و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی اشتراک سے پروفیسر اسلوب احمد انصاری فن اور شخصیت کے عنوان کے تحت منعقدہ سیمینار اسکائی لائن انسٹیٹیوٹ آف کمپیوٹر کیمپس چاندپور میں کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ مہمان خصوصی دیوان وجے کمار اور نظامت کے فرائض معروف افسانہ نگار، شاعر صحافی ندیم رائی مراد آبادی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ سیمینار کا افتتاح معروف وسماجی کارکن اردو داں الیاس انجم نے کیا۔ مہمانان ذی وقار ڈاکٹر علیشا خانم دہلی، ڈاکٹر شمع پروین پرنسپل لچھمن لال پی جی کالج، ریحانہ خلیل، بیورو چیف روزنامہ انقلاب

جناب حسنین نقوی بجنور تھے۔ ریسرچ اسکالر طیبہ، دیوان وجے کمار، شب نور، شمع پروین، ریحانہ خلیل نے اسلوب احمد انصاری کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کیا۔ ندیم راعی مرادآبادی نے اپنے مقالے میں پروفیسر اسلوب کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں انگریزی کے ساتھ اردو زبان بھی سیکھنی چاہیے تاکہ ہم اپنے اسلاف کی تخلیقات کا مطالعہ بخوبی کرسکیں۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی نے اپنے مقالے میں فرمایا کہ پروفیسر اسلوب احمد کے مجموعہ 'نقش ہائے رنگ' میں مرزا غالب کے فکروفن کا بھرپور تجزیہ ملتا ہے، زیادہ تر مضامین میں ان کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو نقاد حالی اور بجنوری کے طریقہ کار پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ ڈاکٹر شاہ شکیل (ایسوسی ایٹ پروفیسر عبدالرزاق پی جی کالج جویا) نے اپنے مقالے میں فرمایا کہ دنیائے اردو ادب کے عظیم شاعر فراق گورکھپوری نے پروفیسر اسلوب کے تنقیدی مضامین کا ذکر اپنی کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ سماجی کارکن و ادیب الیاس انجم نے پروفیسر اسلوب کو اردو انگریزی کا ایک نایاب ہیرا بتایا۔ اسکائی لائن انسٹیٹیوٹ آف کمپیوٹر کے طالب علم حیدر علی کو خطاطی و ٹیلی گرافی کے لیے انجینئر ایم سمیع احمد علیگ ایوارڈ دیا گیا، ریسرچ اسکالرس اور مقالہ نگاروں کو بھی انجینئر ایم سمیع احمد علیگ ایوارڈ سے نوازا گیا، نیز مہمان کو نشان یادگار (مومنٹو) دیا گیا۔ آخر میں ایڈوکیٹ اتش انجم سکریٹری ہیلپنگ ہینڈ ٹرسٹ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 مارچ 2021

اسماعیل میرٹھی توسیعی خطبہ

میرٹھ: میرٹھ کا نام نہ صرف تحریک آزادی کا پہلا بگل بجانے بلکہ نظم جدید کی تحریک میں اولیت کا کردار ادا کرنے کے لیے بھی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے رقم کیے جانے کے قابل ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد اور حالی کی مساعی سے 1874 میں شروع ہونے والی نظم جدید کی تحریک اور اس تحریک کے نظریات پر مبنی ادب کی اشاعت سے دس سال قبل یعنی 1864 میں ہی یہاں کے مولا بخش قلق میرٹھی کا پندرہ انگریزی نظموں کے تراجم

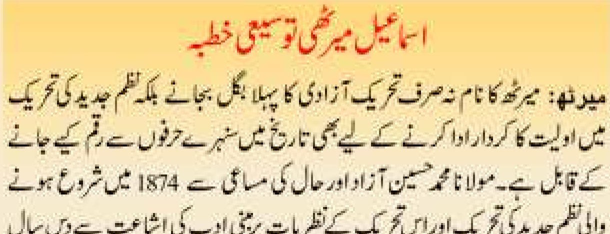

پر مشتمل مجموعہ 'جواہر ریزے' کے نام سے منظر عام پر آچکا تھا۔ ساتھ ہی اسماعیل میرٹھی نے 'چڑیا کے بچے' اور 'تاروں بھری رات' جیسی معریٰ نظمیں پیش کر کے نظم میں ہیئتی تجربوں کا آغاز دوسروں سے پہلے کردیا تھا۔ یہ باتیں ڈاکٹر فرحت خاتون شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پریم چند سیمینار ہال میں نویں اسماعیل میرٹھی خطبے میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ سرزمین میرٹھ کی خوش نصیبی یہ ہے کہ قلق میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی کی جاری کردہ اس روایت کو افسر میرٹھی، روش صدیقی اور ساغر نظامی نے زندہ رکھا ہے۔

واضح ہو کہ کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے ہر سال اسماعیل میرٹھی توسیعی خطبے کا اہتمام ہوتا ہے۔ آج کے یادگاری خطبے میں بطور صدر جمال احمد صدیقی، ڈپٹی لائبریرین، سی سی ایس یو میرٹھ بطور مہمان خصوصی محترم شاہد صدیقی آئی، آر ایس اور بطور مہمان مکرم افسانہ نگار مسعود اختر شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی، تعارف اسماعیل میرٹھی کے فرائض ڈاکٹر شاداب علیم، استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم تابش فرید نے ادا کی۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر پرگیہ پاٹھک نے پروگرام کے روح رواں اور صدر شعبۂ اردو، پروفیسر اسلم جمشید پوری، شعبے کے اراکین اور کہانی کاروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ تینوں کہانیاں اپنے اپنے موضوع پر اچھوتی اور جذبات واحساسات کو مرتعش کرنے والی تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 مارچ 2021

ملک زادہ منظور احمد یادگاری خطبہ

لکھنؤ: شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ زبان کے مالی اشتراک سے 'ملک زادہ منظور احمد' یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔

خطبہ خواں پروفیسر علی جاوید دہلی یونیورسٹی نے 'غالب اور انسان دوستی' عنوان سے خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ میر تقی میر کے بعد سے اب تک اپنے عہد میں جو اہم رجحان ساز شعرا سرفہرست ہیں ان میں غالب انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی وراثت اس فلسفیانہ اساس کو اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ غالب ترک رسوم کی وکالت کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کی روشن خیالی اور مذہبی رواداری فکری و ادبی اسلوب ندرت کی حامل ہے۔ ملک زادہ منظور احمد یادگاری خطبے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر عباس رضا نیر نے کہا کہ اس خطبے کی ہمہ جہت خصوصیات ہیں۔ پروفیسر ملک زادہ ہمارے شعبے کے عالم گیر شہرت یافتہ استاد رہے ہیں۔ غالب کی انسان دوستی ان کی شاعری ہی نہیں زندگی سے بھی نمایاں ہے۔ غالب کی شاعری ہندوستان کی مشترکہ روایات سے عبارت ہے۔ اس یادگاری خطبے کی نظامت ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی اور کلمات تشکر ڈاکٹر جاں نثار عالم نے ادا کیے۔ اس موقعے پر تمام طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 مارچ 2021

موجودہ مرحلے میں اردو زبان کا تحفظ اور فروغ

کھتولی: مظفر نگر عیدگاہ روڈ پر جامعہ خیر النسا کانفرنس ہال میں گولڈن پیک فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 'موجودہ مرحلے میں اردو زبان کا تحفظ اور فروغ' کے افتتاح کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر اسلم نے کہا کہ اردو میڈیم اداروں کو اردو کے روشن خیال لوگوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اگر یہ قائم ہوجائیں تو ہم اردو کے ساتھ اپنی ذمے داریاں بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ مولانا جمشید نے کہا کہ اردو زبان کو مدرسوں اور مکتبوں اور مسلمانوں کی زبان نہ سمجھیں بلکہ ہمیں اس کی اہمیت اور شیرینی کو اپنے غیر مسلم بھائیوں کو بتانا چاہیے تب ہی ملک میں اردو زبان تیزی سے پھلے پھولے گی۔ اس موقعے پر مولانا اکرام الدین نے کہا کہ ہمیں گھر میں پڑھنے کے لیے اردو اخبار اور رسالے خریدنے چاہئیں تب ہی ہندوستان میں اردو کا تحفظ اور اردو کا فروغ ممکن ہے۔ پروفیسر محمد آصف نے کہا کہ اردو کو روزی روٹی سے جوڑنا بھی ضروری ہے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے اردو زبان فروغ کے لیے اہم کورسز چلائے جارہے

ہیں اور ہندوستان کی تمام ریاستوں میں اردو کو فروغ دینے کا کام کر رہی ہے جو قابل تعریف ہے اور اردو تعلیم کے لیے سمینار خود ہی ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ سمینار میں ماسٹر محمد شہزاد، ڈاکر روحی جاوید، وسیم احمد، ڈاکٹر جاوید وغیرہ مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت ماسٹر عمرو دین اور صدارت مولانا جمشید علی نے کی۔ آخر میں ٹرسٹ کی سکریٹری شازیہ نے سمینار میں شریک تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 مارچ 2021

دکن میں فارسی زبان و ادب اور تہذیب وثقافت

حیدرآباد: شہر حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری عربی و فارسی قلمی نسخوں کے اعتبار سے برصغیر کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے جس میں قلمی نسخوں کی تعداد 50 ہزار سے زائد ہے۔ آخری آصف جاہی حکمراں میر عثمان علی خان کی علم دوستی کی بہترین مثال جامعہ عثمانیہ ہے۔ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے دینی تعلیم اور دیگر کے لیے اخلاقی تعلیم لازمی تھی۔ اس میں دارالترجمہ کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ اس ادارے نے 500 کتابیں ترتیب دیں۔ اس کے باعث حیدرآباد کا نام دنیا بھر میں نمایاں ہوا۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز اسکالر پروفیسر اشتیاق احمد، مرکز برائے مطالعاتِ فارسی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی نے آج دکن کی مشہور و معروف شخصیت راجہ دھن راجگیر سے موسوم ایک یادگاری خطبے میں کیا۔ شعبۂ فارسی کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے منعقدہ یادگاری خطبے کا عنوان 'دکن میں فارسی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت' تھا۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، وائس چانسلر انچارج نے صدارت کی۔ پروفیسر اشتیاق احمد نے کہا کہ عمومی طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مغلوں کے دور میں فارسی پر کافی کام ہوا ہے، لیکن دکن کے حوالے سے کی گئی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہاں فارسی زبان و ادب پر کام مغلوں سے کم نہیں ہے۔ کسی بھی معاشرے کو سمجھنے کا سب سے آسان طریقہ اس کا ادب ہوتا ہے۔ اس میں رسوم و رواج، رہن سہن، تہذیب وثقافت کی تفصیل مل جاتی ہے۔ پروفیسر اس ایم رحمت اللہ وائس چانسلر انچارج نے کہا کہ راجہ دھنراج گیر جو کہ مشہور و معروف فرزندانِ دکن میں شامل ہیں ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اس یادگاری لیکچر کے لیے شعبۂ فارسی مبارکباد کا مستحق ہے۔ آج کا خطبہ ریسرچ اسکالرس کے لیے خصوصی طور پر اہمت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں، کوآرڈینیٹر میموریل لیکچر نے سب کا استقبال کیا۔ پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی نے کارروائی چلائی۔ پروفیسر عزیز بانو صدر شعبۂ فارسی نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 24 مارچ 2021

پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اسلوب نقد

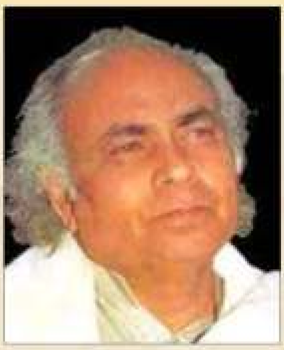

دربھنگہ: اردو میں جمالیات اور جمالیاتی تنقید کو متعارف کرانے کا سہرا پروفیسر شکیل الرحمٰن کے سر ہی جاتا ہے۔ یہ باتیں بہار یونیورسٹی مظفر پور کے صدر شعبہ اردو اور نامور ادیب پروفیسر حامد علی خاں نے ملت کالج کے کانفرنس ہال میں کہیں۔ وہ کالج کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فرغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی اشتراک سے منعقد علامہ جمیل مظہری توسیعی خطبہ بعنوان پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اسلوب نقد پیش کر رہے تھے۔ حامد علی خاں نے مزید کہا کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اردو جمالیات کے حوالے سے درجنوں کتابیں لکھی ہیں جن میں کئی کتابوں نے بڑی شہرت پائی۔ انھوں نے ہند مغل جمالیات کے علاوہ غالب، میر، منٹو، پریم چند وغیرہ کے ادب میں موجود جمالیاتی عکاسی کو اپنی تنقید میں بخوبی پیش کیا۔ حامد علی خان نے کہا کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن اس لیے بھی منفرد نظر آتے ہیں کہ انھوں نے مشرق وسطی اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے پس منظر میں روایات اور دیومالائی تصورات کے پیش نظر اردو ادب میں جمالیات کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے فنون لطیفہ، شعر و ادب، سنگ تراشی، مصوری اور موسیقی میں کارفرما جمالیات سے بھی اردو دنیا کو روشناس کرایا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ایل این ایم یو کے رجسٹرار ڈاکٹر مشتاق احمد نے پروفیسر شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ عربی، فارسی، ہندی، اردو اور انگریزی کے علاوہ سنسکرت ادب پر بھی گہری نظر تھی۔ ہند دیومالائی اور صنمیات کو جس خوبصورتی کے ساتھ اردو ادب میں پیش کیا اس کی مثال نایاب ہے۔ مہمان اعزازی کے طور پر شریک صدر شعبہ اردو ایل این ایم و پروفیسر آفتاب اشرف نے شعبہ اردو ملت کالج کے تئیں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اس پروگرام کو سراہتے ہوئے صدر شعبۂ اردو کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر ایس ایم رضوان اللہ نے بھی خطاب کیا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اروند سنگھ نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس طرح کے توسیعی خطبات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ پروگرام کے کنوینر صدر شعبۂ اردو ملت کالج ڈاکٹر عبدالرافع نے گلدستے اور شال سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ شعبے کی استاد ڈاکٹر ناصرین ثریا نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے جب کہ پروگرام کی نظامت شعبے کے استاد ڈاکٹر شہنواز عالم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مارچ 2021

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی اردو خدمات

مرادآباد: این سی پی یو ایل و نہرو یوا منڈل بروالا مجھرہ کے مشترکہ اشتراک سے ایک قومی سمینار مائی فیئر کالج پنڈت نگلہ میں ڈاکٹر چھٹن خاں پرنسپل مئے فیئر کالج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی کے طور پر اتر پردیش اردو اکادمی کی سابق چیئرپرسن ترنم عاقل شریک رہیں۔ پروگرام کی نظامت سینئر صحافی سید محمد ہاشم نے انجام دی۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے دی بار ایسوی ایشن اینڈ لائبریری کے جنرل سکریٹری راکیش کمار گرو کل آئی ٹی آئی وزسنگ کالج کے چیئرمین حاجی رضوان قریشی، این سی پی یو ایل کے اعزازی ممبر محمد مظاہر خاں نے اپنی شرکت درج کرائی۔ سیمینار میں مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر محمد آصف، ڈاکٹر شیخ نگینوی، ترنم پروین بدایوں نے اپنے مقالوں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی سوانح بتاتے ہوئے ان کے گھرانے کو اردو ادب کا گہوارہ بتایا اور کہا کہ اردو کی بہت بڑی خدمت ہم سب کے سامنے ہے۔ انھوں نے بہت ساری کتابیں لکھیں جس کا فائدہ ہمارا سماج اٹھا رہا ہے۔ سمینار کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر شاکر حسین صدر شعبۂ اردو ایم ایم ڈگری کالج و ریحانہ پروین ریسرچ اسکالر نے کہا کہ مولوی صاحب نے اپنی زندگی میں اردو کو ترقی دینے کے لیے بہت زیادہ کوششیں اور کاوشیں کی ہیں۔ پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے این سی پی یو ایل کے اعزازی رکن محمد مظاہر خاں نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کا ہر انسان کو استعمال کرنا چاہیے یہ بھائی چارے کی زبان کہلاتی ہے۔ ترنم عقیل نے اردو کی ترقی کے لیے اس طرح کے پروگرام کرتے رہنے پر زور دیا اور انھوں نے کہا کہ اردو کو بغیر بھید بھاؤ کے آپس میں بولتے رہنا چاہیے۔ یہ قومی یکجہتی کی پہچان ہے۔ پروگرام میں دی بار

ایسوی ایشن اینڈ لائبریری کے جنرل سکریٹری بننے پر راکیش وششٹ کو نشان یادگار وشال اوڑھا کر ان کا استقبال کیا گیا۔ پروگرام میں غزالہ تبسم نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 21 مارچ 2021

رثائی ادب اور لکھنؤ کی مرثیہ نگاری

لکھنؤ: زبان و بیان، تہذیب وتمدن سمیت متعدد اصناف و ہنر کی طرح لکھنؤ کی مرثیہ نگاری بھی ایک منفرد مقام ہے۔ لکھنؤ میں غیر مسلم مرثیہ نگاریوں کی خاصی بڑی تعداد ملتی ہے جو مشترکہ تہذیب کی علامت ہیں۔ مرزا سلامت علی دبیر اور میر انیس کا نام مرثیہ نگاری میں بہت اہم ہے۔ ان ناموں کو اس وقت معتبریت و اہمیت حاصل ہوگئی جب علامہ شبلی نعمانی نے موازنہ انیس و دبیر لکھ کر تمام قلموں کو ایک نئی راہ دکھائی۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر خورشید جہاں گرلس اینڈ بوائز انٹر کالج سمیتی لکھنؤ کے تحت نیز قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے بعنوان 'رثائی ادب اور لکھنؤ کی مرثیہ نگاری' پر ہوئے سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشید جہاں نے کیا۔ قیصر باغ واقع قدیم اردو اکادمی (اکادمی آف ماس کمیونی کیشن) میں ہوئے سمینار کے صدر نواب میر جعفر عبداللہ نے کہا کہ مرثیے کا تعلق عرف عام میں واقعات کربلا سے ہے جس میں حضرت امام حسین ودیگر شہدائے کربلا کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد وجاہت فاروقی علیگ نے کہا کہ مرثیہ میں زبان وتہذیب کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ سمینار میں مقالہ نگاران ڈاکٹر یاسر جمال، ڈاکٹر مسیح الدین خاں مسیح، ضیاء اللہ صدیقی، قمر جہاں وغیرہ نے کہا کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو شعرا نے بھی مراثی لکھے بس فرق زاویہ نظر کا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مارچ 2021

قاضی اطہر مبارکپوری توسیعی خطبہ

مبارکپور / اعظم گڑھ: اسلامی تاریخ وتہذیب کے حوالے سے اعظم گڑھ نے جو چند نادر جوہر تابندہ پیدا کیے ہیں، ان ہی قاضی اطہر مبارکپوری ایک نمایاں نام ہیں۔ وہ ایک نامور عالم، صحافی، شاعر، علوم اسلامی کے ماہر، مورخ اور محقق تھے۔ ان کی علمی فتوحات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ کسی ایک پہلو پر ہی گھنٹوں گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اختر الواسع، وائس چانسلر مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور وایمریٹس پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے مبارکپور گرلس ڈگری کالج میں منعقدہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری توسیعی خطبہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ قاضی اطہر مبارکپوری ایک عالم باعمل، سراپا عجز وانکسار مگر عظمت علم کے کوہ وقار، کشادہ دل اور وسیع المشرب تھے۔ تعصب وتنگ نظری اور تحزب وفرقہ آرائی سے وہ ہمیشہ میلوں دور رہے۔ ان کے علاوہ عمار ادیبی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں ادارہ ہذا کے منیجر ونگر پالیکا کے سابق چیئرمین ڈاکٹر شمیم احمد نے جملہ حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی صدارت سابق چیئرمین الحاج ڈاکٹر شمیم احمد اور نظامت عامر فہیم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مارچ 2021

اردو زبان کے فروغ میں سوشل میڈیا کا کردار

چمپارن: آج سوشل میڈیا کا دور ہے، منٹوں نہیں سیکنڈوں میں ترسیل کا عمل نہایت آسانی سے انجام پاتا ہے، خواہ وہ خبروں کی ترسیل کا معاملہ ہو یا واقعات وحادثات سے آگاہی کی بات سوشل میڈیا کی اہمیت وافادیت زندگی کے ہر گوشے میں نہایت تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت تعلیم، حکومت ہند کے مالی تعاون سے غیاث فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 'اردو زبان کے فروغ میں سوشل میڈیا کا کردار' کے موضوع پر منعقدہ یک روزہ قومی سمینار میں مقررین نے کیا۔ سمینار کی صدارت مولانا عبدالحق اثری نے کی، نظامت جے این یو کے اسکالر نثار احمد نے کی جبکہ مہمان وشرکا کا استقبال غیاث فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر بدرالحسن نے کیا۔ کلیدی خطبہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر نعیم الحسن اثری نے پیش کیا۔ سمینار میں ڈاکٹر فاروق اعظم، ڈاکٹر فخر عالم، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (بتیا)، ڈاکٹر دانش کمال (مانو)، اشفاق عمر (جے این یو)، اظہار انصاری (جے این یو)، نثار احمد (جے این یو)، محمد اسلم (مغربی چمپارن) نے اپنے مقالات پڑھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 مارچ 2021

انور اعظمی ایک بازیافت

نئی دهلی: پوروانچل کے عظیم شاعر انور اعظمی پر ایک اہم سمینار بعنوان 'انور اعظمی ایک بازیافت' آج انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی (کیمپس جماعت اسلامی ہند) میں 'دی مسلم ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی اعظم گڑھ'، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے منعقد ہوا۔ سمینار کی صدارت ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی سابق صدر شعبہ عربی انفلو یونیورسٹی حیدر آباد نے کی۔ کلیدی خطبہ معروف محقق و ناقد پروفیسر احمد محفوظ نے پیش کیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی نے انور اعظمی اور دوسرے اعظمی شعرا وادبا کا ذکر کیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ اعظم گڑھ میں تذکرہ نگاری کی روایت نہیں، بصورت دیگر کئی اہم شاعر وادیب کی بازیافت ممکن ہوئی۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر فیضان احمد اصلاحی تھے، کلمات تشکر ڈاکٹر نازش احتشام اعظمی نے ادا کیے۔ استقبالیہ وتعارفی کلمات ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی نے ادا کیے۔ افتتاحی جلسے کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ دوسری نشست میں مقالات کا سلسلہ شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر ندیم احمد اور پروفیسر صفدر امام قادری نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ثاقب عمران نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 اپریل 2021

اردو ہندی- کا رشتہ اور ہندوستانی تہذیب

بلرام پور: مدرسہ عائشہ صدیقہ گرلز اسکول کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے 'اردو- ہندی کا رشتہ اور ہندوستانی تہذیب' کے موضوع پر

منعقدہ سمینار میں صدارتی خطاب میں دہلی یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر علی احمد ادریسی صاحب نے کہا کہ اردو- ہندی کو الگ الگ نظریے سے دیکھنا اپنی تہذیب و ثقافت کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ انھوں نے خطبہ صدارت کے دوران اردو

ہندی کے رشتے اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے تعلق سے اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ امیر خسرو نے دونوں زبانوں کو ہندوی بتایا۔ لاکھوں کی تعداد میں اردو نے فارسی، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ قبول کر لیے۔ بسنت لال اسمارک انٹر کالج کے منیجر وویک کمار گوئل نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں ہماری زبان ہیں، ہمیں زبان کو مذہب میں نہیں تقسیم کرنا چاہیے۔ ایک طرف ہم اپنی بول چال کی زبان میں ہندی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں وہیں بہت سے اردو کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، اس لیے ہمیں زبانوں کو بانٹنا نہیں چاہیے۔ معروف شاعر ڈاکٹر افروز طالب نے اردو اور ہندی میں صرف اتنا فرق ہے کہ ہم خواب دیکھتے ہیں اور وہ سپنا دیکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سعید اختر انصاری، ریسرچ اسکالر حبیب الرحمٰن، ریسرچ اسکالر، نثار احمد خان صحافی کشور شریواستو نے بھی اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر محمد صادق اور تنویر ثاقب بلرام پوری نے اپنی شاعری کے ذریعے تعلیم کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ پروگرام کے اخیر میں مدرسہ عائشہ صدیقہ گرلز اسکول کے وائس پرنسپل امتیاز احمد نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں مقامی لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 مارچ 2021

بیکل اتساہی اور ہندوستانی تہذیب

بلرام پور: مدرسہ الہدیٰ سوسائٹی کی پانچویں تعلیمی بیداری کانفرنس کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'بیکل اتساہی اور ہندوستانی تہذیب' کے موضوع پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سابق راجیہ سبھا کے رکن، پدم شری بیکل اتساہی پر ترتیب دی گئی 'بیکل اتساہی یہ حرف و لفظ یہ حسن کلام آپ کے نام' کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ کانفرنس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے انجام دیے جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر شراوستی کے رکن پارلیمنٹ رام شرومنی ورما، سابق وزیر ڈاکٹر ایس پی یادو، بی جے پی کے سابق ضلع صدر راکیش سنگھ نے شرکت کی جب کہ مہمان اعزازی کے طور پر سابق وزیر اور سماجوادی پارٹی کے سینئر لیڈر سلیل سنگھ ٹیٹو، تلسی پور کے بلاک پرمکھ شفیق احمد خان، تلسی پور کے چیئرمین فیروز خان پپو کے علاوہ بیکل اتساہی کی فیملی نے بھی شرکت کی۔ اس موقعے پر ضلع مجسٹریٹ (ڈی ایم) محترمہ شروتی کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 12 مارچ 2021

اردو میں سائنسی اور سماجی علوم

نئی دھلی: الحکمہ فاؤنڈیشن نے 'اردو میں سائنسی اور سماجی علوم' کے عنوان سے سمینار کا انعقاد کیا۔ کانفرنس میں جاوید وسیم، سی ای او، ہمدرد دواخانہ نے بطور مہمان خصوصی کہا کہ ملک و ملت کی ہمہ جہت ترقی کے لیے الحکمہ جیسی تنظیموں کی ضرورت ہے۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن الحکمہ فاؤنڈیشن کی سماجی خدمات کے کاموں اور روزگار سے جوڑنے والے تعلیمی کورس کے لیے تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس موقعے پر فاؤنڈیشن کے سرپرست ڈاکٹر سید فاروق نے الحکمہ کی سماجی خدمات کو سراہا اور اس کارواں میں شامل ہونے کی اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں سماجی اور سائنسی علوم کی اہمیت و افادیت کے ساتھ ضروری ہے کہ ہم اردو زبان سے اپنا رشتہ مضبوط کریں اور نوجوان نسل کے تلفظ پر توجہ دیں۔ معروف شاعر فصیح اکمل قادری نے کہا کہ نئی نسل کو اس میدان کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو تلفظ پر زور دیا اور سائنٹفک نقطۂ نظر کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سائنس داں صاحب نظر انسان کو کہتے ہیں۔ انھوں نے افسوس ظاہر کیا کہ آج ہم اردو بولنے اور لکھنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سائنسی اور سماجی علوم ہمارے دین کا حصہ ہیں۔ سائنس محض ایک مضمون ہی نہیں ہے بلکہ ایک انداز فکر بھی ہے۔

الحکمہ فاؤنڈیشن کے بانی اور چیئرمین ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے مہمانوں، مقالہ نگاروں اور شرکا کا استقبال کرتے ہوئے الحکمہ فاؤنڈیشن کی کارکردگی کا تعارف کرایا اور کہا کہ الحکمہ کا قیام 1990 میں عمل میں آیا اور تب سے لے کر آج تک فاؤنڈیشن اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے لگاتار سرگرم عمل ہے۔ افتتاحی پروگرام کی بعد ٹیکنیکل سیشن شروع ہوا جس میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں، اداروں اور تنظیموں سے وابستہ اسکالرس، اساتذہ اور ماہرین تعلیم نے مقالات پیش کیے جنھیں سیشن کے اختتام پر الحکمہ کی جانب سے سرٹیفکٹ دیا گیا اور الحکمہ کے تحت چلنے والے سلائی کڑھائی سینٹر کی ذمے دار ریحانہ علی اور کمپیوٹر ٹریننگ کے استاد سرور عالم، طارق عبداللہ اور سعود عالم کو بھی سرٹیفکٹ سے نوازا گیا۔ آغاز مفتی شاہد سرور کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور نظامت ڈاکٹر شکیل احمد نے کی۔ کانفرنس کے آرگنائزنگ سکریٹری سید شعیب احمد کے شکریہ کے ساتھ سمینار کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مارچ 2021

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

غزل پر دوروزہ سمینار

علی گڑھ: غزل اردو کا سرمایہ افتخار ہے۔ یہ وہ صنف سخن ہے جس کی آبیاری ابتدائے زبان سے کی جارہی ہے، اس زبان کا حسن اسی صنف میں پوشیدہ ہے۔ یہ باتیں سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شعبہ اردو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے تحت غزل کے موضوع پر ہوئے دو روزہ ویبینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ نے کہیں۔ انھوں نے اردو غزل کا تاریخی و فکری جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب کی تاریخ ایک مسلسل توسیعی تواتر کا نام ہے، جو غزل میں بھی موجود ہے۔ یہ توسیع فکر و فن دونوں سطح پر ہوئی ہے۔ انھوں نے قلی قطب شاہ سے لے کر زمانہ حال کے شعرا کی غزلوں میں فکر و فن کے حوالے سے کہا کہ اگر ان کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو جہاں ان میں علوم و معارف کے دریا بہائے گئے ہیں، اپنے تجربات کو شعری آہنگ میں پیش کیا گیا ہے، وہیں غزل کے دوش پر فکر بھی آگے بڑھی ہے۔ غزل وہی رہی، اس کی ہیئت بھی وہی رہی لیکن اس میں رچی بسی فکر تبدیل ہوتی رہی، انھوں نے کہا کہ ان غزلوں میں ایک رجحان دوسرے کی نفی کرتا ہے اور دوسرا اپنی ہی ضد میں مبارزت کے بعد ایک تیسرے رجحان کو راہ دیتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ مرور زمانہ کے ساتھ غزل کی نئی لفظیات بھی تشکیل پاتی رہی ہے جس جانب توجہ کم دی گئی ہے۔ نئی لفظیات نے استعارے، تشبیہات و تلازمات نے قدیم و جدید غزل کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاعر کے برتاؤ نے قدیم لفظیات میں ہی جدید معانی و مفاہیم کی ایک دنیا آباد کردی ہے۔ اردو زبان و ادب میں غزل سے زیادہ کسی دوسری صنف نے لفظیات کو نئے معانی و مفاہیم نہیں دیے ہیں۔ یہ اردو غزل کا ایک بڑا امتیاز ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ ترقی پسند تحریک نے پہلی دفعہ فکر نہیں بلکہ نظام فکر کو ادب سے ہم آہنگ کیا تھا۔ عموماً غالب کو ایک فلسفی شاعر کے طور پر مقدم خیال کیا جاتا ہے۔ اور لاحقے کے طور پر اقبال کو اس سے نتھی کردیا جاتا ہے۔ غزل کے ارتکاز و ایجاز اور غالب کی فراست کے مابین ایک ایسی استبعادی لکیر کا گمان ہوتا ہے جو ان کی تخلیقی کشمکش کا مثبت جواز ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ غالب کے یہاں شعری اخفا اور پیچیدگی کا سبب غزل کی ریزہ کارانہ ہیئت ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے غزلیہ شاعری کے اوصاف سمیٹتے ہوئے اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے فارسی کی قدیم و جدید شاعری کا احاطہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ فارسی روایت نے ہی اردو شاعری کو ہندوستان میں استحکام بخشا۔ اگر ابتدائی اردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو نہ صرف لفظی سطح پر بلکہ فکری سطح پر بھی اس کے نمایاں اثرات دکھائی دیں گے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے فارسی کے عظیم اور قدیم شاعر رودکی سے لے کر نظیری تک اور پھر جدید شعرا کے امتیازی اوصاف پر بالتفصیل روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 1 اپریل 2021

جنوب ایشیائی نوآبادیات اور پس نوآبادیات میں لسانی تصورات، بولی اور عوامی دائرۂ اثر

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ انگریزی نے 'جنوب ایشیائی نوآبادیات اور پس نوآبادیات میں لسانی تصورات، بولی اور عوامی دائرۂ اثر' سے متعلق زوم پر مورخہ 15 تا 17 مارچ 2021 کو ایک آن لائن بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس پروگرام کے انعقاد کے لیے وزارت تعلیم حکومت ہند کی علمی اور تحقیقی اشتراک کے فروغ کی اسکیم نے تعاون دیا تھا۔ جرمنی کی ہیڈل برگ یونیورسٹی کے جنوب ایشیا انسٹیٹیوٹ کے اشتراک سے یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدر اور آن لائن بین الاقوامی کانفرنس کی صدر پروفیسر محترمہ نشاط زیدی نے مہمانوں اور مندوبین کا خیر مقدم کیا۔ شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر نجمہ اختر نے افتتاحی خطبہ ارشاد فرمایا اور کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی ستائش کے ساتھ ساتھ منتظمین اور شرکائے کانفرنس کے لیے حوصلہ افزا کلمات کہے۔

کانفرنس کے شریک صدر جناب پروفیسر ہنس ہارڈر ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ /CATS ہیڈل برگ یونیورسٹی نے کانفرنس کے مرکزی خیال کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ افتتاحی تقریر کا عنوان 'ہندوستان میں دیسی اور مقامی بولیوں اور زبانوں کا تصور: ایک تاریخی جائزہ' تھا۔ ایم ایس یونیورسٹی، بڑودہ کے شعبۂ انگریزی کے سابق پروفیسر جی۔ این۔ ڈیوے جو کئی کتابوں کے مصنف اور تہذیبی ناقد ہیں، اس موضوع پر پُر مغز تقریر کی۔ ان کی تقریر تاریخی جائزے پر مبنی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ کس طرح چوتھی صدی بی سی پانینی کے زمرہ بندی کے نظام کے آغاز سے اور اس کے بعد آگے بڑھتے ہوئے بھرت ہری کے تصور لسان تک کبھی کوئی زبان، بولی تسلیم کی گئی اور کبھی کوئی دوسری زبان کو زبان کا درجہ دیا گیا۔ شعبۂ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر سروج کے مہانندا نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ کانفرنس میں ملک اور بیرون ملک کے اہم اور نمایاں اسکالروں جیسے کہ مارگرٹ پیرانو، نیلیش بوس، چارو گپتا، وینا نریگال، اور ٹورسٹین ٹشاچر نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 مارچ 2021

امیر خسرو کی تصانیف میں ہندوستان کی جھلک

نئی دہلی: شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو روزہ انٹرنیشنل ویبینار 'امیر خسرو کی تصانیف میں ہندوستان کی جھلک' منعقد ہوا۔ ویبینار کے ڈائرکٹر اور صدر شعبۂ فارسی پروفیسر مظہر آصف نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ خطبۂ استقبالیہ میں پروفیسر مظہر آصف نے تمام شرکا کا استقبال کیا اور اس ویبینار کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پشتو کے استاد پروفیسر اے کے رشید نے امیر خسرو کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ خسرو صرف ہندوستان کے ہی شاعر نہیں تھے۔ وہ ہندوستان کے علاوہ افغانستان، تاجکستان اور دوسرے ممالک میں بھی مقبول ہیں۔ انھوں نے خسرو کو جمال و کمال کا شاعر قرار دیا۔ شعبہ اردو کے سینئر استاد پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ خسرو پر صرف فارسی والوں کا

ہی حق نہیں ہے۔ امیر خسرو اردو والوں کے اتنے ہی ہیں جتنا کہ فارسی والوں کے ہیں۔ خسرو نے پوری انسانیت کو روشنی بخشی اور باہمی اخوت ومحبت کا پیغام دیا۔ افتتاحی سیشن کی نظامت شعبۂ فارسی کے سینئر استاد پروفیسر اشتیاق احمد نے کی۔ شعبۂ فارسی کے سینئر استاد ڈاکٹر علاء الدین شاہ نے کلمات تشکر ادا کیے۔ یہ سیشن 11 بجے اختتام کو پہنچا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد پہلے سیشن کا آغاز ٹھیک 11 بجے ہوا۔ اس سیشن کی نظامت شعبۂ پشتو کے سینئر استاد پروفیسر اے کے رشید نے فرمائی۔ پہلے سیشن کے بیشتر مقالہ نگار بیرون ملک سے تھے۔ اس سیشن میں 13 مقالے پڑھے گئے۔ دوسرے سیشن کا آغاز 1:30 بجے ہوا۔ اس میں کل 10 مقالے پڑھے گئے۔ یہ سیشن 3:30 بجے اختتام پذیر ہوا۔ تیسرا اور آخری سیشن 3:30 بجے شروع ہوا۔ جس کی صدارت پروفیسر انور خیری نے کی۔ اس سیشن میں کل 14 مقالے پڑھے گئے۔ شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر شہباز عامل اس وبینار کے کوآرڈینیٹر تھے۔ انھوں نے اس وبینار کو کامیاب بنانے میں بڑی توانائی صرف کی۔ اخیر میں شکریے کی رسم کے وبینار کے ڈائرکٹر اور صدر شعبۂ فارسی پروفیسر مظہر آصف نے تمام حاضرین اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 مارچ 2021

زرد رنگ کا گدھ

نئی دھلی: بزم آگہی کی جانب سے اوکھلا وہار جامعہ نگر میں مذاکرے کا انعقاد ہوا، جس میں مختلف تعلیمی درسگاہوں کے طلبہ و ریسرچ اسکالرز نے ڈاکٹر شفق سوپوری کے افسانے 'زرد رنگ کا گدھ' پر گفتگو کی۔ محمد شاہد کی تلاوت قرآن سے بزم کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر شفق سوپوری کا مختصر تعارف نامہ طاہر عزیز نے پیش کیا۔ اس موقعے پر شفق کے افسانے کی قرأت جاوید رسول نے کی۔ پروگرام میں چار مقالات پڑھے گئے جو مذکورہ علامتی افسانے کی تفہیم کے ہمہ جہت گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ پہلا مقالہ ڈی یو کے ریسرچ اسکالر محمد اشرف یاسین نے 'زرد رنگ کا گدھ: چند معروضات' کے عنوان سے پڑھا۔ دوسرا جے این یو کے ریسرچ اسکالر کلیم احمد نے 'زرد رنگ کا گدھ: تفہیم وتجزیہ' کے عنوان سے پیش کیا۔ تیسرا پیپر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد حنیف خان نے 'انسانی جبلت کی علامت' کے عنوان سے پیش کیا جبکہ چوتھا اور آخری پیپر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر فیضان الحق نے 'زرد رنگ کا گدھ: چند تفہیمی نکات' کے عنوان سے پڑھا۔ ڈاکٹر شفق سوپوری پر گفتگو کرتے ہوئے بزم آگہی کے سرپرست مصطفیٰ علی نے کہا کہ شاعری میں 'دل خاک بسر، بیتے موسموں کے دکھ، مدیر شب خون شمس الرحمٰن فاروقی کا منتخبہ 107 غزلوں کا مجموعہ 'دشت میں دور کہیں' کے علاوہ 'ریشم سراب خواب' آپ کی شاعرانہ شخصیت کا چوتھا سنگ میل ہے، جب کہ 2016 میں بنگال کے آدی واسی سماج کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے متعلق ناول 'نیلیما' سے آپ نے باضابطہ فکشن نگاری کا آغاز کیا۔ سوال و جواب کی نشست میں مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالرز نے افسانے اور پیپر سے متعلق اپنے سوالات قائم کرکے مذاکرے میں جان ڈال دی۔ واضح رہے کہ بزم آگہی ادب نے اپنا نام بدل کر بزمِ آگہی کرلیا ہے۔ یہ پروگرام آن لائن اور آف لائن دونوں موڈ میں ہوا، جس کی وجہ سے حیدرآباد، بنگال، میرٹھ، مرادآباد، ممبئی، آگرہ، لکھنؤ، بنارس اور کانپور جیسے دور دراز علاقوں سے بھی لوگوں نے شرکت کی۔ نظامت مصطفیٰ علی نے کی جبکہ ضیاء الرحمٰن کے کلمات تشکر پر ادبی مذاکرے کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 مارچ 2021

آسٹریلیا میں اردو ادب کا عصری منظر نامہ

نئی دھلی: آسٹریلیا میں اردو زبان کی ترویج واشاعت کے حوالے سے روشنی ڈالتے ہوئے رضا شاہد نے کہا کہ آسٹریلیا میں اردو زبان کے پھلنے پھولنے کے وسیع امکانات ہیں مگر لازم ہے کہ ہم اس طرف صدق دلی سے توجہ دیں۔ انھوں نے یہ بات بزم صدف انٹرنیشنل کے آسٹریلیا شاخ کے زیر اہتمام 'آسٹریلیا میں اردو ادب کا عصری منظر نامہ' عنوان سے ایک عالمی وبینار اور سمینار میں کہی۔ ریحان علوی نے بتایا کہ آسٹریلیا اقوام جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، انھیں اردو سے جوڑنا اردو کی اس خطے میں بقا کے لیے لازم ہے۔ پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے بزمِ صدف کے چیئرمین شہاب الدین احمد نے عالمی سطح پر اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے درپیش مسائل کا تذکرہ کیا۔ محترمہ تہمینہ راو نے بزمِ صدف کی عالمی سطح پر خدمات کی تفصیل بتائی۔ آسٹریلیا میں مقیم افضل رضوی نے اسکول کی سطح پر درس وتدریس کے ماحول کی ضرورت بتائی اور جنوبی آسٹریلیا میں اردو کی خاص طور سے ترویج واشاعت کے مراحل پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے یہ بات بھی گوش گزار کی کہ یہاں کثیر لسانی ماحول ہے اور اس سے اردو والوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 10 مارچ 2021

اتر پردیش

برقی دور میں تدریس زبان کے لیے وسائل کی فراہمی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات نے 'برقی دور میں تدریس زبان کے لئے وسائل کی فراہمی' پر دو روزہ وبینار کا انعقاد کیا۔ جناب امت کھرے (IAS) سکریٹری وزارت تعلیم حکومت ہند نئی دہلی نے اس موقع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر طارق منصور نے کی۔ شعبۂ لسانیات کے چیرمین اور وبینار کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد جہانگیر وارثی نے استقبالیہ پیش کیا۔ اس پروگرام کے افتتاحی جلسے میں لسانیات کی صد سالہ پروفائل کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروفیسر ویشنا نارنگ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے کلیدی خطاب پیش کیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ہم کووڈ-19 سے قبل بالمشافہ تدریس کے لیے تیار تھے لیکن اس وبا نے تو تعلیم وتدریس کا نقشہ ہی بدل دیا اور اساتذہ کو آن لائن تدریس کے لیے مجبور کردیا۔ اس کی وجہ سے دونوں طرز تعلیم میں کافی بے ربطگی اور عدم مماثلت پیدا ہوگئی۔ آپ نے اساتذہ کو نفسیاتی طور پر اپنے طلبہ کو آن لائن کلاسز کے لیے آمادہ کرنے پر کافی زور دیا۔ فیکلٹی آف آرٹس کی ڈین پروفیسر سیدہ نزہت زیبا نے کہا کہ شعبہ لسانیات روز اول ہی سے لسانیات کی بہترین تدریس اور اردو کی معیاری لسانیاتی تحقیق پیش کرتا رہا ہے۔ جناب امت کھرے IAS، سکریٹری، وزارت تعلیم، حکومت ہند، نئی دہلی نے اپنے افتتاحی خطاب میں علمی دنیا کو درپیش مابعد کووڈ-19 کے چیلنجز کی طرف اشارہ کیا اور شعبہ لسانیات کی طرف سے اس وبینار کے انعقاد کو ایک خوش آئند قدم بتایا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے اپنے صدارتی خطاب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عظیم الشان صد سالہ تعلیمی سفر مکمل ہونے پر طلبہ اور اساتذہ کو مبارکباد پیش کی اور یونیوسٹی کی نمایاں کامیابیوں پر بھی گفتگو کی۔

شعبہ لسانیات کے چیرمین اور وبینار کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد جہانگیر وارثی کے اپنے استقبالیہ خطبے میں بتایا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات کا قیام نامور ماہرین لسانیات پروفیسر مسعود حسین خان نے 1968 میں کیا تھا اس شعبے نے لسانیات میں تعلیم وتحقیق کے میدان میں اور خاص طور سے اردو کے حوالے سے امتیازی خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ اس وبینار کا

مقصد تدریس زبان کے مشترک مسائل پر تبادلہ خیال ہے نیز اس کی حیثیت ایک آفاقی پلیٹ فارم کی ہے جو محققین اور ماہرین تعلیم کو تبادلہ خیال اور آنے والے ایک بہتر کل کے لیے ماحول فراہم کرے گا۔

ویبینار کے انتظامی سکریٹری ڈاکٹر ناظرین بی لسکر اور ڈاکٹر عبدالعزیز خان نے اس پروگرام کو کامیابی سے کوآرڈینیٹ کیا۔ اس سیشن کا اختتام یونیورسٹی ترانہ کے بعد قومی ترانہ پر ہوا۔

دوپہر کا تعلیمی سیشن: ویبینار کے پہلے علمی سیشن میں کل چھ قومی اور بین الاقوامی اسکالرس نے خطبے پیش کیے۔ پہلا پلینری ٹاک حیدرآباد یونیورسٹی کے سینئر پروفیسر پنچانن موہنتی کے ذریعہ عمل میں آیا۔ آپ کا موضوع 'زبان کی تدریس و تعلیم: برقی دور میں سیکھنے والا خود مختاری نقطہ نظر' تھا۔ اجلاس کی صدارت شعبہ لسانیات کے سینئر پروفیسر امتیاز حسنین نے کی۔ فاضل مقرر نے اب تک موجودہ زبان تدریس کے مختلف مراحل کا تجزیاتی خاکہ پیش کیا۔ آپ نے طلبا کو بااختیار بنانے والے طریقے (Learner Autonomy Approach) پر کافی زور دیا اور اسے وقت کی ضرورت بتایا۔

پروفیسر اما رانی پپوسوامی، مرکزی ادارہ برائے ہندستانی زبان، میسور نے ''برقی دور میں آوٹ آف کلاس کی تدریس'' کے موضوع پر لکچر دیا۔ اس اجلاس کی صدارت بنارس ہندو یونیورسٹی (BHU) کے سینئر استاد جناب راج ناتھ بھٹ نے کی۔ پروفیسر اما رانی نے اپنے خطبے کا آغاز 'آوٹ آف کلاس لینگویج ٹریننگ سے کیا' اور آپ نے اپنی گفتگو میں 2015 کے ورلڈ ایجوکیشن فورم کی تھیم پر تبادلہ خیال کیا جو زندگی بھر سیکھنے پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات پر زور دیتا ہے کہ زبان سیکھنے کا عمل صرف کلاس روم تک محدود نہیں بننا چاہیے۔ سعودی عرب کی قاسم یونیورسٹی کے ڈاکٹر عارف الاحسن 'انگریزی برائے غیر ملکی زبان (EFL) میں تیز رفتار تحقیقی ڈکٹیٹیشن: عرب کلاس روم کا ایک تنقیدی جائزہ' پر لکچر دیا۔ اس سیشن کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معروف اور سینئر پروفیسر اے۔ آر قدوائی نے کی۔ ڈاکٹر حسن نے بتایا کہ تدریس میں ٹکنالوجی تین ٹی (T) یعنی سوچ ٹکنالوجی اور تدریس پر مبنی ہے۔ آپ کا لکچر تجرباتی تحقیق پر مبنی تھا۔

واشنگٹن یونیورسٹی کی پروفیسر سنڈی برانٹی میر کی تقریر کا موضوع 'بعید زبان کے اکتساب میں کووڈ-19 اور عالمی مصروفیت: آئیں گفتگو کریں اور پڑھائی کریں' تھا اس سیشن کی صدارت شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چیرمین پروفیسر محمد جہانگیر وارثی نے کی۔ پروفیسر سنڈی نے موثر نظام تعلیم زبان کے لئے زبان کی فہم کی ضرورت پر کافی زور دیا نیز آپ نے بتایا کہ زبان سیکھنے کو بہتر بنانے کے لیے زبان کے نصاب میں ٹکنالوجی کو شامل کیا جانا چاہیے۔

گلبہار بیکٹ (Prof. Gulbahar Beckett)، آیووا اسٹیٹ یونیورسٹی نے پیش کیا۔ آپ کے لکچر کا موضوع 'مبنی بر پروجیکٹ اکتساب: 21ویں صدی کی تعلیم زبان کے لیے حسب ضرورت، لچکدار اور بین المضامین طریقہ' تھا۔ اس اجلاس کی صدارت ایمٹی یونیورسٹی کے سینئر پروفیسر اودے نارائن کر رہے تھے۔ گلبہار نے بتایا کہ مبنی بر پروجیکٹ اکتساب (PBL) طالب علم پر مرکوز ایک تدریس کا نام ہے جو طلبا کو موضوع کی گہرائی اور گیرائی سے روشناس کراتا ہے نیز اسے سیکھنے کی ترغیب فراہم کرتا ہے۔

دوسرے دن کا پہلا لکچر پروفیسر گبریلا، نیویارک یونیورسٹی، USA نے پیش کیا۔ آپ کے لکچر کا عنوان 'ذہن سازی: برقی مواد کی ترقی تک رسائی کا ایک طریقہ' تھا۔ اس لکچر کی صدارت کا فریضہ پروفیسر محمد جہانگیر وارثی، صدر شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انجام دیا۔ پروفیسر گبریلا نے لکچر کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ تدریس زبان میں طلبہ اور اساتذہ دو اہم اسٹیک ہولڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے مجازی مواد تیار کرتے وقت اساتذہ کو طلبہ کے ذہن، رویوں اور ضروریات کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ آپ نے برقی مواد کے تناظر میں بلوم کی درجہ بندی کا ذکر کیا۔ آپ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ زبان کی تدریس میں سیاق وسباق اور ثقافت کو اہمیت دینی چاہیے۔

پروفیسر پسپندر سیال، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ کی گفتگو کا عنوان 'برقی دور میں اساتذہ کے ذریعہ تدریسی پروگرام کے تصور کو درپیش چیلنجز' تھا۔ اس اجلاس کی صدارت کا فریضہ پروفیسر پردیپ کمار داس، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے انجام دیا۔ پروفیسر سیال نے بتایا کہ کووڈ-19 نے تدریس اور سیکھنے کے تصور کو نیا رویہ پیش کیا ہے۔ صرف موضوع کا علم اب موثر تعلیم کے لیے کافی نہیں ہے۔ آپ نے آن لائن تدریس زبان میں ساختیات اور مابعد ساختیات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

پروفیسر جنیش اورا، یونیورسٹی برائے انگریزی اور غیر ملکی زبانیں (EFLU) لکھنؤ کی تقریر کا عنوان ''تدریس زبان میں آن لائن تعلیم بطور اختراع'' تھا۔ اس لکچر کی صدارت پروفیسر شبانہ حمید، استاد شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کی۔ پروفیسر اورا نے تدریس زبان کا قدیم ترین طریقہ گرامر ترجمہ طریقہ کار پر تنقید کرتے ہوئے بتایا کہ صرف جملے کی میکانکی تبدیلی سیکھنے والوں کی ضرورت کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس لیے ہم کو ابلاغی طریقہ کار پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ پروفیسر روندر گرگیش، ثمرکند اسٹیٹ یونیورسٹی آپ کا موضوع 'برقی دور میں تدریس زبان' تھا۔ پروفیسر گرگیش نے آن لائن مواد تیار کرتے وقت اساتذہ کو طلبہ کے تئیں اپنا رویہ تبدیل کرنے پر کافی زور دیا۔ آپ نے اس بات کو بڑی شدومد سے پیش کیا کہ طلبا کو گرامر سکھانے کے بجائے انہیں جامع ان پٹ فراہم کرنی چاہیے۔

اس دو روزہ ویبینار کے اختتامی اجلاس کا آغاز صدر شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ویبینار کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد جہانگیر وارثی کے خطبہ سے ہوا۔ نائب شیخ الجامعہ پروفیسر ظہیر الدین نے صدارتی کلمات پیش کیے۔ پروفیسر پشپک بھٹا چاریہ، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، بمبئی نے اختتامی خطاب کیا۔ آپ کا عنوان ''خودکار مضمون درجہ بندی'' تھا۔ اپنے خطاب میں آپ نے قدرتی زبان کی پروسیسنگ (NLP) کے مختلف طریقوں اور درپیش چیلنجز پر تفصیلی گفتگو کی اور یہ بتایا کہ اس سیاق میں گہرا عصبی نیٹورک (Deep Neural Network) کتنا معنی خیز ہے۔ آپ نے کووڈ-19 کے دور میں خودکار مضمون درجہ بندی (AGA) کی اہمیت کو بھی بتایا اور بتایا کہ AGA متن اور زبانوں پر مشمول ہے جس کے اندر ابہام جیسی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پروفیسر امتیاز حسنین نے بطور کارگذار ڈین اپنے خطبے میں یہ بتایا کہ کووڈ-19 نے تدریس کے لیے نئے راستے اور چیلنجز فراہم کیے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ تدریس مشق کا پھر سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور ابھی بہت کچھ تلاش کرنا باقی ہے۔ پروفیسر ظہیر الدین، نائب شیخ الجامعہ، اے ایم یو نے اپنے صدارتی کلمات میں شعبہ لسانیات کی علمی کاوشوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ شعبہ لسانیات برصغیر ہند (جنوبی ایشیا) کے بہترین شعبوں میں سے ایک ہے۔ جس میں اردو کی تحقیق پر خاص زور دیا جاتا ہے۔

شعبہ لسانیات کے صدر اور ویبینار کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد جہانگیر وارثی نے اپنے خطاب میں بتایا کہ شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فعال اور متحرک شعبہ جات میں سے ایک ہے۔ پروفیسر وارثی نے یہ بھی بتایا کہ اس دو روزہ بین الاقوامی ویبینار کا بنیادی مرکز آن لائن تدریس کے منظر نامے میں اضافہ اور تخلیق کرنا نیز زبان، ادب اور ترجمے کے شعبے میں محققین اور متعلقہ اسٹیک ہولڈرز کو ایک پلیٹ فارم فراہم کرنا تھا۔

ڈاکٹر ناظرین بی لسکر نے کامیابی کے ساتھ پروگرام کو کوآرڈینیٹ کیا اور ڈاکٹر عبدالعزیز خان نے اظہار تشکر کیا۔

پروگرام کا اختتام یونیورسٹی ترانہ کے بعد قومی ترانہ پر ہوا۔

پریس ریلیز: پروفیسر ایم جے وارثی، صدر شعبہ لسانیات علی گڑھ، 1 اپریل 2021

جاں نثار اختر: فن اور شخصیت

لکھنؤ: امپیریل کمپیوٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اور اتر پردیش اردو اکادمی کے تعاون سے مورخہ 26 مارچ 2021 کو ایک سمینار جاں نثار اختر فن اور شخصیت کے موضوع پر 7:30 بجے شب خورشید منزل، راجیو نگر، لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ سمینار کی شروعات اکادمی کے سپرنٹنڈنٹ جناب محمد معاذ اختر احسن نے کی۔ نظامت کی ذمہ داری ڈاکٹر سیما صدیقی نے سنبھالی۔ اس سمینار میں چار مقالہ نگاروں نے جاں نثار اختر کی شاعری، فن اور شخصیت پر مقالے پیش کیے۔ مقالہ نگاروں میں جناب ضیاء اللہ صدیقی، جناب نثار احمد، محترمہ تبسم فاروقی اور جناب ممتاز احمد شامل تھے۔ سبھی مقالے بہت پسند کیے گئے سمینار کی صدارت شری ایس پی سکسینہ نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب رضوان احمد، سابق ڈی جی پی اور ڈائرکٹر اردو آئی اے ایس اسٹڈی سینٹر شریک ہوئے اور مہمان اعزازی جناب ایس رضوان سکریٹری اردو اکادمی بھی اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ مہمان خصوصی جناب رضوان احمد نے اپنے مخصوص انداز میں شعر و شاعری سے شروعات کرتے ہوئے جاں نثار اختر کی رومانی شاعری پر روشنی ڈالی اور مہمان اعزازی اکادمی کے سکریٹری جناب ایس رضوان نے پند و نصائح سے لبریز کلمات کا اظہار کرتے ہوئے امپیریل کمپیوٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے کرائے گئے انتظامات کی تعریف کی اس کے بعد صدر محفل نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے سوسائٹی کے بہتر مستقبل کے لیے دعائیں دیں۔ سوسائٹی کے نائب صدر جناب ظل الرحمٰن نے پروگرام میں آئے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سمینار کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 مارچ 2021

مولانا عرشی کی غالب شناسی

رامپور: عالمی شہرت یافتہ رامپور رضا لائبریری میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی یاد میں چوتھے میموریل لیکچر 'مولانا عرشی کی غالب شناسی' کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا

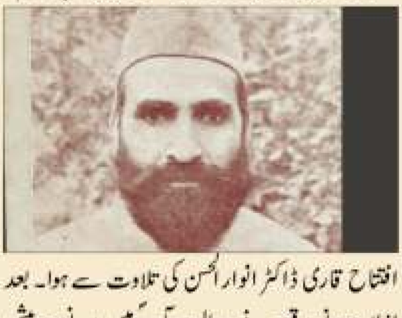

افتتاح قاری ڈاکٹر انوار الحسن کی تلاوت سے ہوا۔ بعد ازاں سید نوید قیصر نے رسالت مآبؐ میں ہدیہ نعت پیش کیا۔ مقرر خصوصی پروفیسر شافع قدوائی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے 'مولانا عرشی کی غالب شناسی' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مولانا عرشی نے تحقیقی میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ نہ صرف قابل قدر ہیں بلکہ نسل نو کے لیے قابل رشک بھی ہیں۔ متنی تنقید کا کام مولانا ہی کا اختصاص ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا عرشی متنی تنقید کے شہسوار ہیں۔ شافع قدوائی نے کہا کہ مولانا نے متن کو بھی من وعن قبول نہیں کیا بلکہ انھوں نے متن سے مقابلہ و مکالمہ کرنے کی روایت قائم کی۔ مکاتیب غالب اور نسخہ غالب میں ان کے مقدمے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب کے حالات، ان کی شخصیت اور دوسری باتوں کو صرف اسی لیے جوں کا توں قبول نہیں کیا اس لیے متعدد مقامات پر غالب کے اقوال پر اختلاف اس کا بین ثبوت ہے۔ بعد ازاں ڈاکٹر ممتاز عرشی نے اپنے صدارتی خطاب میں مولانا کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی۔ اس موقعے پر مفتی فراز، مولانا اسلم جاوید قاسمی، مسعود رضا خاں، س ش عالم، ناصر الدین خاں، ڈاکٹر الف ناظم، ڈاکٹر تنویر، ڈاکٹر محمود، عتیق جیلانی سالک، ڈاکٹر ارشد رضوی، رمیش کمار جین سمیت متعدد سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔ جب کہ پروگرام کے ناظم و لائبریری کے انفارمیشن آفیسر ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 مارچ 2021

جشنِ ساحر

سہارنپور: یہاں اداکار گروپ اور ساتوک انٹرٹیزس کے اشتراک سے ہوٹل راج محل میں ترقی پسند رومانی، انقلابی اور عوامی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرنے والے ممتاز شاعر ساحر لدھیانوی کے صد سالہ یوم پیدائش پر موسیقی سے سجی اور نغموں سے آراستہ ایک تقریب 'جشن ساحر' کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی کے طور پر اظہار خیال کرتے ہوئے عالمی شہرت یافتہ معروف شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے ساحر کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ساحر کی شاعری نے ہمارے شعر و ادب اور ہماری فلموں کو اپنے سحر سے ایسا مسحور کیا جس سے ہم کیا ہماری آنے والی نسلیں بھی انکار نہیں کرسکتی ہیں۔ مشرف خطیب نے کہا کہ ساحر کی شاعری عشقیہ شاعری کے نازک جذبوں کا اظہار اور استحصالی قوتوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ اس موقعے پر اداکار گروپ کے صدر اور اسٹیج اداکار جاوید سروہہ نے ساحر لدھیانوی کی زندگی کے کچھ واقعات کا ان کے نغموں سے رشتہ جوڑتے ہوئے ساحر کی حقیقی زندگی اور ادبی سفر کو اپنے تصورات کا جامہ پہنایا۔ جب کہ معروف کلاسیکل گلوکار سنجیو جھنگرن نے ممبئی کے موسیقی کار سجیت کمار جی کے ساز کے ساتھ ساحر کے فلمی نغموں کو اپنی آواز سے آراستہ کیا اور داد و تحسین حاصل کی۔ اس تقریب میں دہرہ دون ماذھوری، سہارنپور کے دل بہار ملک نے بھی ساحر کے یادگار فلمی نغموں کو اپنی خوبصورت آواز میں پیش کیا۔ 'جشن ساحر' میں پیانو راؤنڈ میں ساحر کے 10 یادگار گیتوں کا گلدستہ 'سمفنی' پیش کیا گیا۔ پروگرام کے کنوینر وشوجیت پنڈیر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ شہر کے ادب نواز اور موسیقی کے دلدادہ لوگوں نے اس جشنِ ساحر میں شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 مارچ 2021

اے ایم یو میں تحقیق کے طریقہ کار پر ورکشاپ

علی گڑھ: پابندی کے ساتھ مطالعہ کی عادت سے نئے خیالات و تصورات جنم لیتے ہیں، جن سے تحقیق و اختراع کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ اگر آپ اچھے مدرس و محقق بننا

چاہتے ہیں تو آپ کے اندر کا طالب علم ہمیشہ زندہ رہنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار نامور ماہر اقتصادیات پروفیسر محمد مزمل، سابق وائس چانسلر، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی، آگرہ نے کیا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ جغرافیہ کے زیر اہتمام سوشل سائنس میں ریسرچ میتھڈولوجی کے موضوع پر دس روزہ ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس سے بطور مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ ورکشاپ کو انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ (آئی سی ایس ایس آر) نے اسپانسر کیا ہے۔ پروفیسر مزمل نے کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اسکول کے دنوں سے ہی بچوں کے اندر سائنسی مزاج و رجحان کی شناخت پر زور دیا گیا ہے تاکہ ملک میں معیاری تحقیق و اختراع کو طاقت ملے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ ہمارے ملک میں تعلیمی و تحقیقی اداروں میں بہتر بنیادی ڈھانچہ اور علم دوست ثقافت کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستان ریسرچ اور ڈیولپمنٹ میں عالمی رہنما بن سکے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 اپریل 2021

کہانی کی ایک شام

میرٹھ: شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پریم چند سمینار ہال میں پروفیسر اسلم جمشید پوری کے زیر سرپرستی 'کہانی کی ایک شام' کے نام سے ایک ادبی شام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر پرگیہ پاٹھک ایسوسی ایٹ پروفیسر، این اے ایس کالج، میرٹھ) اور مہمانان میں محترم حاجی عمران صدیقی (میرٹھ) اور محترم نوشاد عالم قمر (جمشید پور) شریک ہوئے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر آصف علی، استقبال ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریہ ڈاکٹر الکا وششٹھ نے ادا کیا۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر پرگیہ پاٹھک نے کہا کہ قدیم زمانے سے ہی لڑکیوں پر سوالیہ نشانات لگتے رہے ہیں، لڑکی کے ماں باپ اس کی سسرال کو ہی اصل گھر سمجھتے ہیں جب کہ بعض لڑکی سسرال والے اسے بے عزت کرکے گھر سے باہر نکال دیتے ہیں۔ اس طرح کی سماجی پیچیدگی کو اجاگر کرنے میں تخلیق کاروں نے فنکاری سے کام لیا ہے۔ مالیرکوٹلہ پنجاب سے آئے تینوں کہانی کاروں کے یہاں فنی چابک دستی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پروگرام میں کہانی کاروں پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ عوام کے درمیان خوشگوار ماحول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ تخلیق کار اپنی کہانیوں کے ذریعے محبت کے پیغام کو عام کریں۔ آج نوجوان نسل کو ہمارے تخلیق کار ہی اپنی تخلیقات کے ذریعے امن اور بھائی چارے کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ 'کہانی کی ایک شام' میں تین کہانی کاروں نے اپنی اپنی کہانیاں پیش کیں۔ پہلی کہانی ناصر آزاد (پنجاب) نے 'واپسی' پیش کی۔ دوسری کہانی ارشد منیم (پنجاب) نے 'سوال کی صلیب' پیش کی جب کہ تیسری کہانی مالیرکوٹلہ پنجاب کے سینئر افسانہ نگار بشیر مالیرکوٹلوی نے 'گہری سازش' پیش کی۔ تینوں افسانہ نگاروں نے اپنی اپنی کہانیاں منفرد انداز میں سنا کر سامعین کو متاثر کیا۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے تینوں کہانیوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ان تینوں کہانیوں میں سماج کے مسائل کو دور کرنے کی ترغیب دی گئی ہے جس کے لیے تینوں کہانی کار حقیقتاً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اپریل 2021

بہار

فروغ اردو سمینار

پورنیہ: محکمہ اردو ڈائرکٹوریٹ بہار کی ہدایت پر پورنیہ ضلع اردو سیل کے زیر اہتمام ایک روزہ فروغ اردو سمینار، مشاعرہ و اردو عمل گاہ ضلع اسکول پورنیہ میٹنگ ہال میں منعقد ہوا۔ افتتاح شمع روشن کر کے کیا گیا۔ اس موقعے سے بزم اردو پورنیہ کے نام سے ایک یادگاری مجلّہ کا بھی اجرا کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت ضلع اسکول پورنیہ کے پرنسپل شعیب عالم نے کی جب کہ نظامت کے فرائض سیمانچل کے مشہور شاعر و صحافی ہارون رشید غافل نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر پورنیہ ضلع ایڈیشنل کلکٹر جاوید حسن انصاری، پروفیسر احمد حسن دانش، پروفیسر اصغر راز فاطمی، پروفیسر پرویز شاہین ماسٹر شمیم و عاصم اختر، مولانا منظور نعمانی قابل ذکر ہیں۔ فروغ اردو سمینار و مشاعرہ میں اسکول و مدارس اساتذہ کرام کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبا و طالبات نے حصہ لیا اور ہونہار طلبہ و طالبات کو حوصلہ افزا انعامات سے بھی نوازا گیا۔ اس موقعے سے اے ڈی ایم جاوید حسن انصاری نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں زبانیں ہندوستان کی تہذیبی روایت اور گنگا جمنی تہذیب کی علامت بھی ہیں۔ پروفیسر احمد دانش نے کہا کہ اردو ہندی دونوں سگی بہنیں ہیں اور اردو ہماری مادری زبان ہے۔ مادری زبان سیکھے بغیر ہم دوسری زبانوں پر عبور حاصل نہیں کر سکتے۔ اس موقعے سے دوسرے ادیب و شعرا کرام نے فروغ اردو پر اشعار کہے اور اردو زبان کے فروغ پر زور دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 مارچ 2021

زبیر الحسن غافل کی شخصیت اور فن

پٹنہ: مشہور شاعر اور سابق جج زبیر الحسن غافل کی شاعری اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے معروف ادیب پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ سدابہار اور ادبی شخصیت کو پہلے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی، لیکن وقت بڑا منصف ہوتا ہے، وہ دیر سویر حق دار کو حق ضرور دیتا ہے۔ بہار اردو اکادمی میں 'زبیر الحسن غافل کی شخصیت اور فن' پر منعقدہ سمینار میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کی تہہ دار شخصیت کو صرف ایک سمینار میں نہیں سمجھا جاسکتا۔ غافل کی شاعری، ان کے تصورات اور موضوعات کی پیش کش، مزاح اور سنجیدگی کی نئی بازیافت ہے۔ معروف ادیب آلوک دھنوا نے کہا کہ مسٹر غافل کی سادگی ان کی ذات اور کلام سے جھلکتی ہے، انھوں نے سیمانچل میں اپنوں کے درمیان رہ کر جو محسوس کیا اسے پیش کیا۔ اس سے قبل پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ واقعے اور مسائل کو شعر میں ڈھالنے کا ہنر انتہائی انوکھا ہے، سنجیدہ ظرافت ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ کلیدی خطبہ میں ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کہا کہ زبیر الحسن غافل کا شعری مزاج کلاسیکی ادبی ماحول کا پروردہ ہے، انھوں نے جو محسوس کیا اس کو ادب کا حصہ بنا دیا۔ معروف شاعر خورشید اکبر نے کہا کہ زبیر الحسن غافل کی شاعری پیچیدہ نہیں ہے، ان کی سنجیدہ اور ظریفانہ شاعری کے کئی زاویے ہیں، جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اپنے مقالے میں کہا کہ ان کی شاعری میں طنز کے ساتھ فکر کی توانائی ہے، رضا نقوی واہی کے بعد دبستان بہار میں ظریفانہ شاعری کو وقعت بخشتی ہے۔ معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے کہا کہ دل میں میل نہ رکھنے والا شخص ہی ظریف ہوسکتا ہے، زبیر بھائی تو اپنا عہدہ کورٹ میں چھوڑ آتے تھے، زمین دار گھرانے اور اونچے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود سادہ تھے اور ان کی شاعری میں فکر و فن کے ساتھ یہ سادگی جھلکتی ہے، وہ طنز بھی کہتے ہیں تو سنجیدگی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ پروفیسر مولانا شکیل احمد قاسمی نے کہا کہ وہ جج کے عہدے سے سبکدوش ہوئے لیکن سماجی زندگی میں قلم، زبان اور عمل کے ذریعہ سرگرم رہے۔ ڈاکٹر زاہد الحق نے کہا کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے سیمانچل کے فنکاروں اور نئی نسلوں کو جگایا اور ٹیم تیار کی اور اپنے لوگوں کے درمیان ادب کی آبیاری کی۔ کلمات تشکر پیش کرتے ہوئے زبیر الحسن غافل کے لائق فرزند کمشنر اسلم حسن نے کہا کہ وہ لٹریچر کے

دریچے سے سماج کو دیکھتے اور اس میں اتر کر کام کرتے تھے۔ اس موقعے پر بہار اردو اکادمی کے سکریٹری عظیم اللہ انصاری نے غافل صاحب کو بعد از مرگ ایوارڈ سے نوازا۔ سمینار سے خطاب کرنے والوں میں سنجے کمار کندن، رمیش کنول، صحافی احمد جاوید وغیرہ کے نام شامل ہیں، نظامت کی ذمہ داری فخر الدین عارفی نے انجام دی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 مارچ 2021

فروغ اردو سمینار

جہان آباد: بلاشبہ اردو ہندوستان کی زبان ہے، کیونکہ اس کی پیدائش اور نشو ونما یہیں ہوئی۔ لہٰذا اسے مخصوص مذہب سے منسلک کرنا اور غیر ملکی زبان کہنا اس شیریں زبان اردو کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار ضلع مجسٹریٹ نوین کمار نے اردو ڈائرکٹوریٹ بہار اور ضلع انتظامیہ کے مشترکہ تعاون سے گرام کمپلکس جہان آباد میں فروغ اردو کی غرض سے منعقد ایک روزہ سمینار، ورکشاپ اور مشاعرہ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے زبان اردو کی موجودہ صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے لیے اردو داں طبقات کو ہی پیش رفت کرنی ہوگی، کیونکہ فقط حکومت یا انتظامیہ کے سہارے کوئی زبان فروغ نہیں کرسکتی۔ اس موقعے پر محکمہ اقلیتی فلاح کی ضلع افسر اور انچارج افسر شعبہ اردو سیل نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ یہ دو دلوں کو جوڑنے کا ذریعہ بھی ہے۔ محترمہ نے فروغ اردو کے تئیں اپنے محکمہ کے ذریعے کی جاری کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے زبان اردو کے تئیں اپنی محبت کا اظہار کرنے کی کوشش کرتی نظر آئیں۔ اس موقعے پر فروغ اردو کی غرض سے مختلف دانشوران اور ماہر تعلیم نے زبان اردو کے فروغ سے متعلق اپنے مشورے اور تجاویز کے توسط سے حکام کی توجہ اس سمت مبذول کرانے کی کامیاب کوشش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 22 مارچ 2021

محفل گنگ وجمن

پٹنہ: اردو اور ہندی دونوں ایک ہی بولی ہیں، ایک ہی زبان اور دونوں کی تہذیب و کلچر بھی ایک ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی سگی بہنیں ہیں۔ فرق ہے تو بس اسکرپٹ یعنی رسم الخط کا۔ دائیں جانب سے ایک خاص رسم الخط میں لکھنے کی وجہ سے یہ زبان اردو کہلاتی ہے جب کہ بائیں جانب سے ایک خاص رسم الخط میں لکھنے کے سبب وہی باتیں ہندی کہلاتی ہیں۔ دونوں زبانوں کا مقابلہ و موازنہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دونوں زبانیں گنگا جمنی تہذیب کی علامت اور پہچان ہیں۔ یہ باتیں اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے کہیں۔ وہ آج اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار کے زیر اہتمام بہار ریاستی ابھیلیکھا گار ڈائرکٹوریٹ کے کانفرنس ہال میں اردو ہندی کے فروغ میں لسانی ہم آہنگی کی اہمیت پر منعقد مذاکرہ اور محفل گنگ وجمن سے خطاب کررہے تھے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے شفیع مشہدی نے کہا کہ اردو ہندی کے فروغ میں لسانی ہم آہنگی کی اہمیت کے موضوع کو بہت اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس موضوع پر باضابطہ سمینار ہونا چاہیے اور ماہرین لسانیات کو اس موضوع کے مسائل اور امکانات پر بات کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان کی پہچان گرامر اور قواعد سے ہوتی ہے۔ ہندی اور اردو کے قواعد تقریباً ایک ہی ہیں۔ دونوں زبانوں میں یکسانیت ہے۔ صرف رسم الخط کا فرق ہے۔ اس سے دونوں کے آپسی رشتے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خورشید اکبر نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی ترقی کے لیے دونوں میں لسانی ہم آہنگی کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور ہندی کی آپسی رشتہ کو مزید مضبوط بنانے کے لیے ماہر لسانیات کو مل بیٹھ کر دونوں زبانوں کے بیچ معمولی فرق کو پاٹنے یا دور کرنے کی سمت میں مثبت طریقہ کار اپنانا چاہیے۔ سنجے کمار کندن نے کہا کہ اردو محبت اور پریم کی زبان ہے۔ لوگوں میں محبت اور پریم جب تک ہے اردو زندہ رہے گی وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ اس موقعے پر کتاب 'بہار کا اردو ادب' کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب کی نظامت اسلم جاوداں نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 مارچ 2021

تلنگانہ

سجاد حیدر یلدرم پر گفتگو

حیدر آباد: سجاد حیدر یلدرم اردو میں رومانی رنگ و آہنگ کے بنیاد گزار افسانہ نگار تھے وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز، افسانہ نگار اور مترجم کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے افسانوی ادب کے رائج فنی اور فکری ضابطوں سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی۔ وہ رومانیت کے علمبردار تھے۔ رومانیت باقاعدہ تحریک نہیں تھی بلکہ آسکر وائلڈ کے نظریہ ادب برائے ادب کے اثر کو اردو ادیبوں نے قبول کیا۔ رومانی رجحان علی گڑھ تحریک کی عقلیت پسندی، مقصدیت اور اسلوب کی سادگی کے خلاف شدید ردعمل تھا۔ یلدرم ترکی زبان کی نفاست، شیرینی اور خیالات کی رعنائی کو پسند کرتے تھے۔ وہ تخیل پرست تھے اور خوب صورت اور شاعرانہ زبان لکھتے تھے۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے مرد اور عورت کو سماج میں محبت کا وہ حق دلانا چاہتے تھے جو فطری ہونے کے ساتھ ساتھ رسم ورواج اور بندھنوں سے آزاد ہو۔ افسانہ 'صحبت ناجنس' میں انھوں نے بے جوڑ شادی اور زن وشو کے اختلاف ذوق کو پیش کیا، ان خیالات کا اظہار نامور افسانہ نگار، سابق صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدر آباد اور بازگشت آن لائن ادبی فورم کے سرپرست پروفیسر بیگ احساس نے بازگشت کی جانب سے ممتاز افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم کے افسانے 'صحبت ناجنس' کی پیش کش اور گفتگو پر مبنی گوگل میٹ پر منعقدہ پروگرام میں اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ معروف افسانہ نگار اور ناول نگار جناب نورالحسنین نے جلسے میں بہ حیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ 'صحبت ناجنس' کی اشاعت کو سو برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس کی زبان اور اسلوب آج بھی متاثر کن ہے۔ اس افسانے میں دو تہذیبوں کا ٹکراؤ پیش کیا گیا ہے۔ ایک مقامی تہذیب ہے اور دوسری کا تعلق انگریزی ماحول سے ہے۔ مشہور افسانہ نگار اور اے جے کے ماس کمیونی کیشن اینڈ ریسرچ سنٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد پروفیسر غیاث الرحمن سید نے کہا کہ عموماً لڑکیاں زیادہ پڑھی لکھی ہوتی ہیں اور لڑکے کم تعلیم یافتہ۔ اس کی وجہ سے ان کے مابین کشمکش اور ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یلدرم کے دور میں قصہ پن پر زیادہ زور دیا جاتا تھا جب کہ آج کے افسانے سے قصہ پن غائب ہوتا جارہا ہے۔ یلدرم نے اس دور کے اعتبار سے خطوط کی تکنیک کا استعمال کیا جو ان دنوں جدید کہلاتی تھی۔ ابتدا میں اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر اسود گوہر جنھوں نے یلدرم کی افسانہ نگاری پر ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے، نے افسانہ 'صحبت ناجنس' کی پیش کش نہایت عمدگی سے کی۔ پروگرام کی کنوینر بازگشت آن لائن ادبی فورم کے مجلس منتظمہ کی رکن ڈاکٹر گل رعنا، استاد شعبہ اردو، تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد نے حاضرین کا خیر مقدم کیا اور جناب نورالحسنین اور ڈاکٹر اسود گوہر کا تعارف کرایا۔ مجلس منتظمہ کی رکن ڈاکٹر حمیرہ سعید، پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن، سنگاریڈی نے پروگرام کے آخر میں جامع اظہار تشکر کیا۔ اس اجلاس میں ملک و بیرون ملک کے شائقین ادب، اساتذہ اور طلبا و طالبات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 مارچ 2021

شاعر جمالیات شاذ تمکنت

حیدرآباد: شاذ کا نام جوں ہی زبان پر آتا ہے ذہن ازخود اس نکتے پر مرکوز ہوجاتا ہے کہ مختصر سی عمر اور سوئے عدم کا سفر۔ اس کے باوجود شاذ اپنی شعری اور نثری تخلیقات میں سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایسے انمٹ نقوش چھوڑ گئے جس کی تحقیق مستقبل میں ہوتی رہے گی اور وہ اپنے لفظوں کے رنگ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز شاعر اور شاذ کے ہمعصر جناب مصحف اقبال توصیفی نے کیا۔ وہ مرزا غالب اکیڈمی حیدرآباد کے ماہانہ ادبی اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے، جو 20 مارچ بروز ہفتہ 8 بجے رات اردو گھر مغلپورہ میں منعقد ہوا تھا۔ انہوں نے سلسلہ خطاب جاری رکھتے ہوئے شاذ کی معیت میں گذرے ہوئے خوشگوار لمحات کو یاد کیا اور کہا کہ مخدوم، جامی اور شاذ سے حیدرآباد جانا اور پہچانا گیا۔ قبل ازیں پروفیسر رحمت یوسف زئی سابق صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے اپنے پرمغز مقالے میں شاذ کے فکر و فن کے حوالے سے کئی انکشافات کیے اور کہا کہ نصیر الدین ہاشمی اپنے معاصرین میں تحقیق و تنقید کے میدان کی اہم شخصیت تصور کیے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں شاذ کا ذکر کیا ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاذ اہل علم، صاحب بصیرت اور دیدۂ بینا رکھنے والوں کی نظر میں شاعری کے آغاز سفر ہی سے تھے۔ شاذ کی شاعرانہ حیثیت جس قدر مستحکم ہے اتنی ہی مستحکم ان کی نثر بھی تھی۔ انھوں نے کہا کہ شاذ کو انتقادی اور تجزیاتی قوت بھی حاصل رہی۔ نظم ہو کہ نثر ان کا ایک خاص ڈکشن تھا۔ مشہور کالم نگار جناب سید امتیاز الدین نے پیش کردہ مقالے کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کیا۔ انھوں نے کہا کہ شاذ بنیادی طور پر روحانی شاعر ہیں، لیکن اپنے عصر کے مسائل انسانی، دکھ درد، زندگی کی ناکامیاں اور عدم مساوات کا احساس بھی ان کے کلام میں موجود ہیں۔ نیز منظر نگاری، رات کا حسن، کلیوں کی چٹک، پرندوں کی دلفریب چہچہاہٹ، موسیقی کی دلکشی، ساز و آواز کا آہنگ، معصوم بچوں کی کھلکھلاہٹ، خوبصورت چہروں کی دل آویزی، زلف دراز کا جادو، آنکھوں کی دلکشی، غرض شاعری اظہار بیان کے جتنے وسیلے ڈھونڈتی ہے۔ وہ شاذ کی شاعری میں موجود ہے۔ قبل ازیں محبوب خان اصغر معتمد عمومی مرزا غالب اکیڈیمی نے شاذ کا سوانحی خاکہ پیش کیا اور شہ نشین کے تمام مہمانوں کا تعارف کروایا۔ بعدازاں آغا سروش کی صدارت میں محفل شعر سجائی گئی جس میں مصحف اقبال توصیفی، رحمت یوسف زئی، محبوب خان اصغر، سیف نظامی، ظفر فاروقی، شکیل ظہیر آبادی، ممتاز لکھنوی، اسریٰ منظور، تجمل گلریز، فرحان عزیز اور ریاست علی اسرار نے اپنا کلام پیش کیا۔ اجلاس و مشاعرے کی کارروائی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ محبوب خان اصغر نے چلائی۔

پریس ریلیز: محبوب خان اصغر، معتمد عمومی مرزا غالب اکادمی حیدرآباد 30 مارچ 2021

عزیز احمد پر سمینار

حیدرآباد: عزیز احمد ایک منفرد فکر و نظر کے کثیرالجہت قلمکار تھے۔ ان کے فن تک رسائی بہت غور و فکر کی طلبگار ہے۔ ان خیالات کا اظہار سابق صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، پروفیسر خالد سعید نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے منعقدہ ایک روزہ سمینار میں کیا۔ تمام حاضرین جلسے کا استقبال کرتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین تلنگانہ کے صدر پروفیسر فاروق بخشی نے کہا کہ عزیز احمد جیسے ہمہ جہت قلمکار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک بڑے ناول نگار، شاعر اور مترجم کے ساتھ ساتھ بے پناہ تنقیدی نظر کے مالک تھے۔ اہل حیدرآباد کو اپنے اس قلمکار پر فخر کرنا چاہیے۔ سمینار کا کلیدی خطبہ انجمن ترقی پسند اردو تلنگانہ کے معتمد عبدالرحیم خاں نے پیش کیا۔ موصوف نے اپنے کلیدی خطبے میں عزیز احمد کی سوانح کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تربیت کے داخلی اور خارجی سرچشموں کی نشاندہی کی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین تلنگانہ کے سرپرست سابق ممبر پارلیمنٹ سید عزیز پاشا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے اتنی عظیم شخصیت کو اتنی جلد بھلا دیا۔ مہمان خصوصی معروف فکشن نگار قمر جمالی نے عزیز احمد کے افسانوی ادب کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ سمینار میں ڈاکٹر رؤف خیر نے عزیز احمد کی شاعری، ڈاکٹر اسلم فاروقی نے عزیز احمد کے فن پر علاقائی اثرات اور ڈاکٹر ابوشہیم خاں نے عزیز احمد کی شخصیت اور فن کو موضوع بحث بنایا۔ اس مکمل ادبی تقریب کی نظامت کے فرائض معروف شاعر ڈاکٹر محبوب اصغر نے انجام دیے۔ سمینار کا اختتام انجمن ترقی پسند مصنفین، تلنگانہ کی سکریٹری انچارج ڈاکٹر نکہت آرا شاہین کے شکریہ کے کلمات کے ساتھ ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مارچ 2021

مغربی بنگال

ڈیجیٹل عہد میں اردو کی ادبی صحافت

اسلام پور: سہ ماہی اردو ریسرچ جرنل کے سات سال مکمل ہونے پر 'ڈیجیٹل عہد میں اردو کی ادبی صحافت' کے موضوع پر یک روزہ سمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ نئے زمانے سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ہمیں جدید ٹکنالوجی کا سہارا لینا پڑے گا۔ یہ رسالہ اردو کا رشتہ جدید ٹکنالوجی سے جوڑنے کا کام کر رہا ہے۔ جامعہ ازہر مصر کے صدر شعبہ اردو، پروفیسر احمد القاضی نے کہا کہ جدید ٹکنالوجی کی بدولت اب آن لائن ادبی رسالے بھی نکل رہے ہیں جو ملکی سرحدوں سے پرے پوری دنیا کو ایک دھاگے میں پرونے کا کام کر رہے ہیں۔ تہران یونی ورسٹی کے غیر ملکی زبانوں کے شعبہ کی استاد، ڈاکٹر فرزانہ لطفی صاحبہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے پوری دنیا میں بکھری اردو آبادی کو ایک ساتھ مل کر کام کرنے پر زور دیا۔ پروفیسر شفیق احمد اشرفی صدر شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لسان یونی ورسٹی لکھنؤ نے اپنے پیغام میں پروفیسر ابن کنول کی سرپرستی میں نکلنے والے اس رسالے کے سات سال پورے ہونے پر مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ رسالہ ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر رضی شہاب نے رسالے کی بہتری کے لیے چند مشوروں سے نوازا۔ چودھری قیصر امام نے کہا کہ یہ جدید

ٹکنالوجی کا زمانہ ہے۔ زبان کو اگر ترقی سے ہمکنار کرنا ہے تو ہمیں جدید ٹکنالوجی کا سہارا لینا پڑے گا۔ شکیل کامران صدیقی ایڈیشنل ،ڈسٹرکٹ سب رجسٹرار، اسلام پور نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ریسرچ جرنل ایک آن لائن رسالہ ہے جس سے پوری دنیا کی اردو آبادی فائدہ اٹھاتی ہے لیکن اس کے ساتھ آف لائن بھی یہ کام ہونا چاہیے تاکہ بڑی آبادی اس سے فیض حاصل کر سکے۔ چوپڑا کالج شعبہ اردو کے صدر علیم الدین شاہ اور طارق عزیز نے بھی اظہار خیال کیا۔ اردو ریسرچ جرنل کے بانی و ایڈیٹر ڈاکٹر عزیر نے تعارفی تقریر میں رسالے کو جاری کرنے کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ یہ پروگرام دو نشستوں پر مشتمل تھا۔ پہلی نشست آن لائن تھی جس میں ملک اور بیرون ملک کے مقالہ نگاروں نے آن لائن خطاب کیا جب کہ دوسری نشست آف لائن تھی۔ نظامت کے فرائض پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر محمد شہواز عالم نے اور شکریے کی رسم ماہ نسرین نے ادا کیا۔

پریس ریلیز: عزیر احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، نارتھ بنگال یونیورسٹی، مغربی بنگال، 5 اپریل 2021

اعزاز واکرام

تقسیم اکادمی ایوارڈ برائے تراجم 2019

نئی دهلی: ساہتیہ اکادمی کے ذریعہ منعقدہ جشن ادب 2021 کے دوسرے دن کمانی آڈیٹوریم، نئی دہلی میں تقسیم اکادمی ایوارڈ برائے تراجم 2019 عمل میں آیا۔ ہندی کی معروف ادیبہ چترا مدگل مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئیں جبکہ پروگرام کی صدارت اکادمی کے صدر چندر شیکھر کمبار نے کی۔ چترا مدگل نے اپنے خطبے میں کہا کہ مترجم ایک حد تک خود مصنف ہوتا ہے۔ ایک اچھا مترجم وہ ہوتا ہے جو مصنف کی روح میں سما کر اُس کے طریقے سے سوچ کر اس کی نگارشات کو اپنی زبان کا رنگ دیتا ہے۔ ادبی کتابوں کا ترجمہ مزید احتیاط کی مانگ کرتا ہے تاکہ متن کی معنویت بنی رہے۔ انھوں نے سبھی انعام یافتگان کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ آنے والے وقت میں ترجمہ نگاروں کا اہم رول نظر آرہا ہے۔

اس سے پہلے ساہتیہ اکادمی کے صدر چندر شیکھر کمبار نے کہا کہ ہماری کثیر جہتی ثقافت کے اتحاد کی اساس ترجمہ ہی ہے۔ پورے براعظم ہند میں جو ثقافتی یکجہتی دکھائی دیتی ہے وہ مختلف زبانوں اور ان سے ہوئے تراجم کی وجہ سے ہی ہے۔ ہماری کئی قدیم پُران کتھاؤں نے ترجمہ کے ذریعہ ہی اپنی پہچان بنائی۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے شری نواس راؤ نے سبھی انعام یافتگان و دیگر مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ترجمہ کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ترجمہ ہی علم کی کنجی ہے۔ آخر میں اکادمی کے نائب صدر جناب مادھو کوشک نے شکریے کی رسم ادا کی اور کہا کہ مترجمین ادب کے سب سے بڑے مشنری ہیں۔ وہ مصنفین کی تصنیفات میں موجود خاموشی کو بھی پڑھ لیتے ہیں اور اُسے معنی خیز اظہار کا پیکر عطا کر دیتے ہیں۔

ساہتیہ اکادمی انعام برائے ترجمہ 2019 سے سرفراز ادیبوں کے نام اس طرح ہیں: نوکمار سندکیے (آسامی)، تپن بندوپادھیائے (بنگلہ)، رتن لال بسوترا (ڈوگری)، سوبن ڈینیل (انگریزی)، آلوک گپت (ہندی)، وٹھل ٹی گائکواڑ (کنڑ)، رتن لال جوہر (کشمیری)، جینت نایک (کونکنی)، کیدار کانن (میتھلی)، سنی پرانچے (مراٹھی)، یچین رائی 'دومی' (نیپالی)، اجے کمار پٹنایک (اڑیہ)، دیو کوٹھاری (راجستھانی)، پریم شنکر شرما (سنسکرت)، کھیروال سورین (سنتالی)، ڈھولن راہی (سندھی)، کے وی جے شری (تمل)، پی ستیہ وتی (تیلگو) اور اسلم مرزا (اردو)۔ انعام کے طور پر پچاس ہزار روپے نقد اور امتیازی نشان پیش کیا گیا۔

پریس ریلیز: موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 13 مارچ 2021

نیوز 18 اردو کو 'نیوز چینل آف دی ایئر اردو'

نئی دهلی: ای این بی اے 2020 ایوارڈ میں اس برس سے شامل کیے گئے اردو نیوز چینلوں کی کیٹگری میں 'نیوز چینل آف دی ایئر' کا ایوارڈ نیوز 18 اردو نے حاصل کرکے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان کی شناخت اردو رسم الخط اور اردو زبان کی چاشنی سے ہی ہوتی ہے۔ ہندوستانی نیوز میڈیا کے ذریعے کی گئی بہترین کارکردگی کا جشن مناتے ہوئے اپنی ساکھ اور لگن کو برقرار رکھتے ہوئے عالمی وبا کے درمیان، ایکسچینج 4 میڈیا نیوز براڈ کاسٹنگ ایوارڈ (ای این بی اے) کے 13 ویں ایڈیشن کا اہتمام سنیچر کے روز دہلی کے پانچ ستارہ ہوٹل میں کووڈ ضابطوں کے تحت ایک شاندار تقریب میں کیا گیا۔ ہر سال کی طرح ای این بی اے نے ملک کی نیوز میڈیا انڈسٹری میں بہترین کارکردگی کے لیے بے باک صحافت کو اعزاز سے نوازا۔ ای این بی اے ایوارڈ تقریب میں نیوز 18 اردو نے اپنی بادشاہت پر مہر لگا دی۔ نامور صحافی، شاعر اور نیوز 18 اردو کے سینئر ایڈیٹر اور چینل ہیڈ تحسین منور نے سال کے بہترین نیوز چینل کا ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے اپنے خطاب میں اس جیت کے لیے اپنے سینئرز اور اپنی ٹیم کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے خاص طور پر اپنے گروپ ایڈیٹر راجیش رینا کی ہر لمحہ رہنمائی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ ایوارڈ تقریب میں نیوز 18 اردو کی بے باک صحافت اور انٹرٹینمنٹ کو بھی وہ مقام عطا کیا گیا جس کا وہ ہمیشہ سے حقدار رہا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اپریل 2021

تنویر اجمل دیوبندی

دیوبند: دیوبند ٹوڈے کی جانب سے ایک اعزازی پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر نواز دیوبندی اور سید وجاہت شاہ اور ڈاکٹر پربھات کمار کے بدست جہان ادب اکادمی کے چیئرمین تنویر اجمل دیوبندی کو ان کی ادبی خدمات پر اردو ادب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر تنویر اجمل دیوبندی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ تنویر اجمل بڑی لگن کے ساتھ اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کو ایوارڈ دیا جانا ادبی حلقوں کے لیے باعث فخر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کا جوش اور جذبہ دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف ادبی پروگراموں کے انعقاد کے لیے مسلسل کوشاں رہتے ہیں۔ معروف قلم کار اور پروگرام کے کنوینر سید وجاہت شاہ نے بھی تنویر اجمل دیوبندی کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ تنویر اجمل لگ بھگ پندرہ بیس سالوں سے اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ ہم سب اور پورے شہر کے لیے فخر کی بات ہے۔ شمیم کرتپوری نے کہا کہ تنویر اجمل کو ایوارڈ ملنا صرف میرے لیے ہی نہیں بلکہ پورے جہان ادب اکادمی کے لیے خوشی کی بات ہے۔ ہم مستقبل میں ان کی مزید کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ ایس ڈی او دہرادون انجینئر مزمل حسن نے بھی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تنویر اجمل کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 مارچ 2021

جامعہ ملیہ کے پروفیسروں کو ایوارڈ

نئی دهلی: پروفیسر نجمہ، شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جامعہ کے ملازمین کو ایکسیلنس ایوارڈ برائے تعلیم موصول ہونے پر اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے اور موقر انعام یافتگان ڈاکٹر جعفری، پروفیسر توقیر اور ڈاکٹر ایم عرفان قریشی کو جامعہ کا سر فخر سے اونچا کرنے کے لیے بہت مبارکباد دی۔ ڈاکٹر ناظم الجعفری مستحکل اور کنٹرولر امتحانات جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر توقیر احمد، شعبۂ کیمیا جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ڈاکٹر محمد عرفان قریشی ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ بائیوٹکنالوجی اور جامعہ ٹیچرس ایسوی ایشن کے معتمد کو 2020 کا مولانا ابوالکلام آزاد ایکسیلنس ایوارڈ برائے تعلیم دیا گیا ہے۔ شکشک کلیان فاؤنڈیشن کی جانب سے سالانہ دیا جانے والا یہ انتہائی موقر انعام ہے۔ پروفسر انل ڈی سہر سا بودھے چیئر مین آف آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن (اے آئی سی ٹی ای) اور پروفیسر سری دھر سری واستو، ڈائرکٹر، این سی ای آر ٹی نے 28 فروری 2021 کو نیشنل سائنس ڈے کے موقعے پر این سی ای آر ٹی کمپلیکس نئی دہلی میں منعقدہ تقسیم انعامات تقریب کے دوران یہ انعامات ان کو دیے۔ انعامات کی اس تقریب کے کنوینر ڈاکٹر جگدیش کمار وگ تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 مارچ 2021

رسم اجرا

ساحر فن اور شخصیت

لکھنؤ: عوامی، سماجی، فلمی نغمہ نگار عبدالحی 'ساحر لدھیانوی' کے یوم پیدائش پر جلسہ آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی کے تحت کیفی اعظمی سیمنار ہال میں ہوا، جس میں علی جاوید مہمان خصوصی تھے۔ شکیل صدیقی نے پروگرام کی صدارت کی۔ جلسہ میں کیفی اعظمی اکادمی کے جنرل سکریٹری سعید مہدی نے مہمانوں کو گلدستہ پیش کیا۔ اس جلسے میں ساحر لدھیانوی پر ڈاکٹر نغمہ پروین کانپوری کی کتاب 'ساحر فن اور شخصیت' کا اجرا ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر پروین کو کیفی اعظمی اکیڈمی کی جانب سے اعزاز کے طور پر گیارہ ہزار روپے کا چیک، سند، شال اور یادگاری نشان اکیڈمی کے جنرل سکریٹری سعید مہدی نے پیش کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی الہ آباد یونیورسٹی نے ترقی پسند تحریک کی روایات کو غالب اور فراق سے جوڑتے ہوئے ساحر لدھیانوی کے بارے میں کہا کہ ساحر لدھیانوی کی شاعری چاہے فلمی ہو یا عوامی، وہ اپنے اصولوں پر ہے۔ انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر ریشمہ پروین نے ساحر کی نظموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج بھی ان کی نظمیں اسی طرح ان مسائل کی ترجمانی کرتی ہیں جو موجودہ صورت حال میں انھوں نے لکھی تھیں۔ ڈاکٹر نکن رنجن سنگھ نے ساحر کو صرف فلمی نغمہ نگار کہنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ غلط فہمی ہے کہ یہ صرف فلمی شاعر تھے بلکہ وہ ایک بڑے عوامی، سماجی اور فلمی نغمہ نگار تھے لیکن ادب کے معیار سے ہٹ کر انھوں نے کبھی کوئی شعر نہیں لکھا۔ ان کی شاعری معیاری شاعری تھی۔ ڈاکٹر نغمہ پروین کانپور نے ساحر لدھیانوی پر تفصیلی مقالہ پیش کیا۔ شکیل صدیقی نے ان کی یادیں تازہ کرتے ہوئے تالکٹورہ، لکھنؤ انڈسٹریل ایریا کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے ساحر لدھیانوی کے شامل ہونے کی بات بتائی اور انھوں نے محنت کشوں، مزدوروں کی یونین سے ان کی دلچسپی کا ذکر کیا۔ نظامت پروفیسر صابرہ حبیب نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 مارچ 2021

طلسماتی دنیا

دیوبند: گذشتہ شب عیدگاہ روڈ پر واقع ہاشمی روحانی مرکز فاؤنڈیشن میں استاذ العالمین مولانا حسن الہاشمی کی حیات وخدمات پر مشتمل ماہنامہ 'طلسماتی دنیا' کی خصوصی اشاعت مولانا حسن الہاشمی کی نمبر کی تقریب رسم اجرا منعقد ہوئی، جس میں علمائے کرام، محدثین، نامور قلمکاروں اور ادبی شخصیات کے علاوہ شہر کی معزز شخصیات اور ہندی و اردو کی صحافی برادری نے شرکت کی۔ خصوصی نمبر کی رسم اجرا کے بعد مقررین نے مولانا حسن الہاشمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مولانا کی حیات وخدمات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ پروگرام کی صدارت شیخ القراء قاری ابوالحسن اعظمی نے کی اور نظامت کے فرائض مولانا محمود الرحمٰن قاسمی نے انجام دیے۔ رابطہ عالم اسلامی کے رکن و شیخ القراء، قاری ابوالحسن اعظمی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ان کا قلم بہت رواں دواں، ان کا اسلوب تحریر و انداز تعبیر اپنے اندر ادبی ذوق کی ترجمانی کرتا رہا۔ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کہا کہ مولانا حسن الہاشمی کا رشتہ قلم و قرطاس سے بہت مضبوط تھا، وہ ایک ادیب اور پختہ قلم کار تھے، انھیں نظم ونثر میں یکساں عبور حاصل تھا۔ استاذ مولانا مفتی عارف قاسمی نے کہا کہ مولانا عامر عثمانی کے انتقال کے بعد تجلی رسالہ کو جاری رکھنے والے اور ماہنامہ طلسماتی دنیا کی 27 سال تک ادارت سنبھالنے والی شخصیت کا قلم وقرطاس سے کتنا مضبوط رشتہ ہوگا، آپ خود اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ معہد انور کے استاذ حدیث مولانا فضیل احمد ناصری نے کہا کہ مولانا حسن الہاشمی متحرک، فعال، ہمدرد اور سخی انسان تھے۔ انھوں نے ساری زندگی خدمت خلق کے لیے وقف کردی۔ دارالعلوم وقف دیوبند کے استاذ مولانا واصف حسین نے کہا کہ شخصیات وہی زندہ رہتی ہیں جو حسن عمل اور حسن کردار کا مجسم ہوتی ہیں۔ معروف قلم کار سید وجاہت شاہ نے کہا کہ مولانا حسن الہاشمی بلند کردار انسان تھے، دیوبند کے ضرورتمندوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ہمدردانہ تعاون سے مستفیض ہوتی تھی۔ نئی روشنی پبلک اسکول کے منیجر فائز سلیم صدیقی نے کہا کہ مولانا حسن الہاشمی مرحوم یہ چاہتے تھے کہ خداوند عالم نے جو صلاحیت و استعداد اور جو جوہر ان کی ذات میں ودیعت فرمائے ہیں اور عوام کو جو فائدہ ان کی ذات سے ہو رہا ہے اس کو اور زیادہ عام کریں۔ فائز سلیم صدیقی نے کہا کہ مولانا حسن الہاشمی ایک بابصیرت عالم دین، صاحب طرز نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب ادراک شاعر بھی تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالسمیع فاروقی، ندیم شمسی، مشتاق احمد، وقاص ہاشمی، ربیع ہاشمی اور عاطف ہاشمی نے بھی مولانا مرحوم کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 مارچ 2021

مدح باقی ہے

امروهه: بزم ادب امروہہ کے زیر اہتمام ایک محفل نعت کا اہتمام برٹش انگلش اسکول محلہ بگلہ میں ہوا۔ محفل میں جواں سال شاعر شاہ فہد نسیم (امن جنید) کے نعتیہ مجموعے 'مدح باقی ہے' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، مسلم کمیٹی کے سابق صدر حاجی خورشید انور، جنید اکرم فاروقی، تنویر حسن نقوی، سید شیبان قادری، عظیم ایڈوکیٹ کے ہاتھوں اجرا کیا گیا۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ امن جنید بڑی فنکاری کے ساتھ ادب میں اپنے والدین، استاد شہر، کا نام روشن کر رہے ہیں ہم ان کے روشن مستقبل کی دعا کرتے ہیں۔ مشہور شاعر جاوید اکرم فاروقی نے کہا کہ سرزمین مصحفی امروہہ سے اٹھنے والی ایک قابل قدر اور قابل فخر آواز کا نام ہے، شاہ فہم نسیم (امن جنید) جنھوں نے نوعمری میں ہی اردو ادب میں اپنی صلاحیتوں سے اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ساتھ ہی جنید اکرم فاروقی، ڈاکٹر ناصر امروہوی، وسید شیبان قادری نے بھی کتاب کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 29 مارچ 2021

تشکیل

شاهجانپور: مشہور شاعر اختر شاہجہاں پوری کے پانچویں شعری مجموعہ 'تشکیل' کا اجرا عمل میں آیا۔ شہر کے پلازمہ میرج لان میں منعقد تقریب میں مہمانان نے رسم رونمائی کے بعد شعری مجموعہ اور شاعر اختر شاہجہاں پوری کے فن اور شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے ان کو عالمی شاعر بتایا۔ تقریب میں مہمانان خصوصی پروفیسر سید محمد نعمان، مہمان اعزازی قاضی شہر سید مسعود حسن، سید مشہور جمال، صدر جلسہ پروفیسر آفتاب اختر نے شعری مجموعہ 'تشکیل' کا

اجرا کیا۔ اس دوران مقررین نے اختر شاہجہاں پوری کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر آفتاب اختر نے اپنے خطاب میں کہا کہ اختر شاہجہاںپوری نے اردو شعر و ادب میں اپنی کامیاب اور معتبر شناخت بنائی ہے۔ انھوں نے یہ مقام اپنی محنت اور لگن سے حاصل کیا ہے۔ ان کا کلام صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان، امریکہ اور اور لندن کے رسائل میں بھی انتہائی اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ پروفیسر سید محمد نعمان نے کہا کہ اختر شاہجہاںپوری نے ادبی دنیا میں قابل قدر مقام بنایا ہے۔ ان کی شاعری کو عالمی شہرت حاصل ہے۔ سید مشہور جمال نے کہا کہ اختر شاہجہاںپوری کی غزل میں اسلوب کی طلسم کاری ہے۔ احساس کی دھوپ چھاؤں ہے، فکر کی شعری رفعت ہے۔ سید مسعود حسن نے کہا کہ اختر شاہجہاںپوری حقیقت اور سچائی کے پرستار ہیں۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ اس کا عکس ملتا ہے۔ او سی ایف کے جی ایم انوپ کمار شکلا نے کہا کہ اختر شاہجہاںپوری کی غزلوں میں فکر و احساس کی ندرت کو ایسے شعری پیکروں میں پیش کیا گیا ہے جو روایت اور جدید اظہار و ادا کے لطیف امتزاج سے عبارت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ہری اوم ترپاٹھی نے بھی ان کی شخصیت پر خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 مارچ 2021

مرادآباد کی کچھ ان سنی کہانیاں اور عظیم شخصیات

مراد آباد: آج کے دور میں انسانی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ وہ اتنا وقت بھی نہیں نکال پاتا کہ اپنے بچوں کو تاریخ سے روشناس کرا سکے۔ نوجوان نسل اپنے مشاغل میں مصروف ہو کر ان تاریخی حقائق اور ہستیوں کو فراموش کرتی جا رہی ہے جن کا جاننا اس کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ مرادآباد کے نوجوان نے مرادآباد کی ان شخصیات کو اپنی کتاب کے احاطہ میں لانے کی کوشش کی ہے جو کچھ ان سنی اور ان کہی ہیں۔ مختصر طور پر لکھی گئی اس نوجوان کی کتاب مرادآباد کی کچھ ان سنی کہانیاں اور عظیم شخصیات کا اجرا محلہ طویلہ اسٹریٹ میں واقع مشہور ایکسپورٹر اکرم شمسی کی رہائش گاہ پر عمل میں آیا۔ زیر سرپرستی امام شہر حکیم سید معصوم علی آزاد اور زیر صدارت نیشنل سوشل آرگنائزیشن کے بانی الحاج مرزا ارشد بیگ سینئر صحافی و مشہور نعت خواں سید محمد ہاشم قدوسی کی مخصوص نظامت میں تقریب کا آغاز تلاوت کلام الٰہی اور نعت رسول مقبول سے ہوا۔ اس تقریب کو ناگرک جن کلیان کمیٹی کی پانچویں یوم تاسیس کے نام سے منسوب کیا گیا۔ کتاب کے نوجوان مصنف فیروز خاں کی حوصلہ افزائی اور مبارکباد پیش کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ انھوں نے اپنی جائے پیدائش کی تاریخ کو اپنی کتاب میں رقم کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ فیروز خاں نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیشہ سے میری یہ جستجو رہی ہے کہ میں شہر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کروں اور آنے والی نسلوں کے لیے اس کو یکجا کر کے مرتب کروں تاکہ ہمارے بچے اپنے اس آبائی شہر کے بارے میں جان سکیں۔ اس موقعے پر ناگرک جن کلیان کمیٹی کی جانب سے اجرا کی اس تقریب کے موقعے پر صحافیوں، سماجی خدمت گاروں او دیگر میدانوں میں اپنی خدمات انجام دینے والی شخصیات کو توصیفی سند و میڈل دے کر اعزاز سے نوازا۔ امام شہر نے مصنف کو اپنی دعاؤں سے نوازا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 23 مارچ 2021

میرے دلی جذبات

امروهه: راشدہ بیگم مسلم ڈگری کالج میں کالج کے بانی و سرپرست مرزا ناصر حسن صدیقی کی تازہ کتاب 'میرے دلی جذبات' کا اجرا ایک سادہ اور پروقار تقریب میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر شہر کے معزز ادبا، شعرا، نیز دیگر اہم سماجی اور ادبی شخصیات موجود رہیں۔ مسلم کمیٹی امروہہ کے صدر نسیم خان کی صدارت میں منعقدہ اس تقریب میں سید اسلوب حسین زیدی مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے جب کہ شجاعت علی خان مہمان ذی وقار رہے۔ محسن امیر صاحب اور کوثر علی عباسی بھی مسند پر جلوہ افروز رہے۔ تقریب کی نظامت جواں سال شاعر اور ادیب ڈاکٹر ناصر امروہوی نے کی۔ پروگرام کا آغاز مفتی محمد عثمان قاسمی نے تلاوت کلام اللہ شریف سے کیا بعدازیں معروف نعت گو شاعر مرزا زبیر ابن سیفی نے بارگاہ رسالت پناہ میں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ صاحب کتاب مرزا ناصر حسن صدیقی نے کہا کہ اس کتاب میں میں نے وہ سب کچھ لکھا ہے جو میرے دلی جذبات ہیں۔ میں نہ اردو کا کوئی ادیب ہوں نہ ماہر، لیکن میں نے اپنے دلی جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر آپ سب کے سامنے پیش کر دیا۔ ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے کہا کہ میں ناصر صدیقی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے نہایت صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے کلیجے کے زخموں سے خود ہی مرہم بھی تلاش کیا۔ بہت کم لوگوں کو یہ معراج میسر ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ سید تنویر حسن نقوی، ڈاکٹر ابوارشد اعظمی، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے کتاب اور صاحب کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نسیم خان نے اس موقعے پر صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کی اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ناصر صاحب شہر کے ایک معروف استاد اور ہر دلعزیز شخصیت ہیں۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 22 مارچ 2021

میری سیاسی سرگزشت

علی گڑھ: راجیہ سبھا کے سابق رکن ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی (مرحوم) کی 'میری سیاسی سرگزشت' خودنوشت (اردو) کی رسم اجرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے ابن سینا اکیڈمی میں کی۔ اس موقعے پر منعقد جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ ڈاکٹر ہاشم قدوائی ایک مجاہد آزادی اور اے ایم یو میں علم سیاسیات کے استاد تھے۔ اپنی خودنوشت میں انھوں نے 1946 تک تحریک آزادی میں اپنی جد و جہد کی داستان رقم کی ہے۔ طارق منصور نے ڈاکٹر ہاشم قدوائی سے اپنی طویل وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ خودنوشت ڈاکٹر ہاشم قدوائی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے افکار پر روشنی ڈالتی ہے۔ کانگریس کے ایک سپاہی کے طور پر انھوں نے طویل وقت گزارا اور اپنی قوم پرست سیاسی سرگرمیوں کو انھوں نے مذکورہ کتاب میں قلمبند کیا ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ ڈاکٹر ہاشم قدوائی قوم کے لیے وقف ایک سیاسی کارکن تھے اور آخر دم تک انھوں نے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 8 مارچ 2021

آنکھوں میں چبھتے خواب

امروهه: بزم زندہ دلانِ امروہہ کے زیر اہتمام جواں سال شاعر ڈاکٹر ناصر امروہوی کے شعری مجموعے 'آنکھوں میں چبھتے خواب' کا اجرا ماڈرن پبلک اسکول، محلہ بگلہ امروہہ میں ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، ڈاکٹر جمشید کمال کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ محفل کی صدارت شانِ حیدر بے باک نے فرمائی۔ مہمانانِ خصوصی سید مسرور جوہر، جنید اکرم فاروقی رہے۔ مہمانانِ ذی وقار کے پروفیسر ناشر نقوی، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، ڈاکٹر مہتاب امروہوی۔ نظامت کے فرائض سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ سینئر شاعر مسرور جوہر، مشہور ناقد ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، ڈاکٹر جمشید کمال، سید شیبان قادری، جنید اکرم فاروقی، شانِ حیدر بیباک نے ناصر امروہوی کی شاعری پر اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 5 اپریل 2021

سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے افکار کی عصری معنویت

دیو بند: خانقاہ بوڑیہ کے روح رواں الحاج پیر جی حافظ حسین کے دست مبارک سے مولانا فتح محمد ندوی کی تصنیف کردہ کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے افکار کی عصری معنویت کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی جامع کمالات شخصیت عالم اسلام کی ایک عظیم ممتاز شخصیت تھی۔ خوش قسمتی ہے کہ نوجوان فاضل مولانا فتح محمد ندوی نے ان افکار کو ہم تک پہنچانے کی سعی مشکور کی ہے۔ مشہور خاکہ نگار مولانا نسیم اختر شاہ قیصر استاذ دارالعلوم وقف دیو بند نے کہا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شخصیت کو صحیح خراج عقیدت یہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات اور زندگی کو اپنے لیے ایک نمونہ سمجھا جائے۔ بڑوں کی زندگی ہمیشہ چھوٹوں کو آمادہ عمل کرتی ہے۔ مولانا مفتی سید محمد ریاض ندوی کھجناوری ناظم جامعۃ الحسنین صبری پور نے کہا کہ مولانا فتح محمد ندوی کی اولین کوشش زیور طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے ہاتھوں تک پہنچی ہے ان کی محنت اور بہترین سعی کے لیے دلی مبارکباد!

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 5 اپریل 2021

رشید احمد اور اسماعزیز کی کتاب کی رونمائی

امروھہ: مہاراجہ ہریش چند پی جی کالج میں شعبۂ اردو کی جانب سے ایک روزہ سمینار کا اہتمام کیا گیا جس میں رشید احمد کی کتاب خاکہ نگاری اور ڈاکٹر اسما عزیز کی کتاب منتخبات شریف کی رونمائی بھی عمل میں لائی گئی۔ پروگرام کا افتتاح مہمان خصوصی ادارہ مذکورہ کے منیجر ڈاکٹر کاویہ سور بھ رستوگی اور مقرر خصوصی ڈاکٹر شریف احمد نے شمع روشن کر کے کیا۔ اس دوران منیجر ڈاکٹر رستوگی نے عالمی یوم خواتین کے ذیل میں اظہار خیال پیش کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر اسما عزیز کو ان کی تازہ تصنیف کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔ سمینار کے سلسلہ میں اظہار خیال پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس طرح کے پروگرام سے طلبہ کے علم میں اضافہ اور اظہار بیانی میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری پر تفصیلی خطبہ دیا۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی، 9 مارچ 2021

شکستہ پر

نوح / میوات: جوان العمر ادیب راشد امین ندوی کے شعری مجموعہ 'شکستہ پر' کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت یٰسین میوڈگری کالج کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر نصیر الدین ازہر نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نصیر الدین ازہر نے کہا کہ راشد امین ندوی جیسے جواں سال ادیب کی یہ عمدہ کاوش ہے، نثر و نظم میں لکھنے کا انھیں خاصا ذوق ہے۔ مہمان خصوصی کے طور پر بولتے ہوئے ایس ڈی ایم وکیل احمد نے کہا کہ نوجوانان میوات میں اہلیت کی کوئی کمی نہیں ہے، البتہ ان کی درست رہنمائی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ راشد امین نے حالات حاضرہ پر معیاری اشعار کہے ہیں۔ مزدور اور کسانوں کے مسائل پر بھی کتاب میں کئی نظمیں ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الحق نے کہا کہ راشد امین ندوی نے شکستہ پر نامی کتاب میں بیٹی، ماحولیات، صحافت، کسان، مزدور وغیرہ سے جڑے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے، جو نیک فال ہے، میوات کارواں کے صدر ڈاکٹر اشفاق عالم صدیق احمد اور صابر قاسمی نے بھی کتاب کی پذیرائی کی ہے۔ راشد امین نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مارچ 2021

جے پرکاش یونیورسٹی کا خبر نامہ

چھپرہ: جے پرکاش یونیورسٹی چھپرہ کے شعبۂ اردو نے اپنی تین سالہ سرگرمیوں کی بنیاد پر شعبے کے خبر نامہ کی اشاعت کی جس کا اجرا شیخ الجامعہ پروفیسر فاروق علی کے دفتر میں ان کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ خبر نامہ کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہوئے یونیورسٹی کے وائس

چانسلر پروفیسر فاروق علی نے شعبے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ جاتی سرگرمیوں میں اس شعبے نے بہت ہی فعال کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے خبر نامہ کی رونمائی کے دوران اسے یونیورسٹی کے لیے بھی ایک نیک فال کہا اور امید ظاہر کی کہ دوسرے شعبے بھی اس قسم کی مثبت پہل کریں گے۔ وائس چانسلر پروفیسر فاروق علی نے کہا کہ خبر ناموں کی اشاعت کے لیے چانسلر ہاؤس سے کئی بار ہدایتیں موصول ہوئی ہیں لیکن اس سلسلے میں کسی بھی شعبہ کی جانب سے پہل نہیں کی گئی۔ انھوں نے صدر شعبہ پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ خبر نامہ کی اشاعت محض شعبے کے لیے نہیں، یونیورسٹی کے لیے بھی بہت ہی اہم ہے۔ یہ پہلو مزید قابل تعریف ہے کہ صدر شعبہ اور شعبے کے دوسرے استاد ڈاکٹر مظہر کبریا کی کوششوں سے اس یونیورسٹی میں پہلی بار کسی شعبے کا خبر نامہ شائع ہوا ہے۔ انھوں نے خبر نامہ کی ترتیب اور اس میں پیش کی گئیں تفصیلات کی بھی تعریف کی۔

پریس ریلیز: ارشد مسعود ہاشمی، جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرہ، بہار 15 مارچ 2021

وفیات

مولانا ولی رحمانی

نئی دھلی: معروف عالم دین، مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری اور امارت شرعیہ کے امیر مولانا ولی رحمانی کا 3 اپریل کو پٹنہ کے ایک اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ کچھ دن قبل انھیں اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا، جہاں وہ آئی سی یو میں داخل تھے۔ ان کی عمر 77 سال تھی۔ پسماندگان میں ایک بیٹا فہد رحمانی اور دو بیٹیاں ہیں۔ وہ ذی استعداد عالم دین اور تمام حالات پر گہری نظر رکھنے والے تھے۔ مولانا نے 1947 سے 1996 تک بہار قانون ساز کونسل کے رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور کونسل کے ڈپٹی چیئر مین بھی رہے۔ اپنے والد ماجد مولانا منت اللہ رحمانی کی وفات 1991 کے بعد سے خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشین اور جامعہ رحمانی مونگیر کے سرپرست تھے۔ آپ کے دادا مولانا محمد علی مونگیری ندوۃ العلما کے بانیان میں سے ہیں۔ مولانا ولی رحمانی اس وقت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ وہ رحمانی 30 کے بانی بھی تھے۔ یہ وہ پلیٹ فارم ہے جہاں عصری تعلیم کے متعدد شعبوں میں معیاری اعلیٰ تعلیم و قومی مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے طلبہ کو تیار کیا جاتا ہے۔ ان کے انتقال پر مسلم تنظیموں، سرکردہ شخصیات اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ لوگوں نے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اپریل 2021

افتخار امام صدیقی

ممبئی: معروف و مشہور شاعر اور آگرہ کے استاد شاعر سیماب اکبر آبادی کے پوتے اور اعجاز صدیقی کے فرزند افتخار امام صدیقی کا 4 اپریل کو جنوبی ممبئی کے گنجان آبادی والے علاقے گرانٹ روڈ پر واقع بلڈنگ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 74 برس تھی۔ مرحوم افتخار امام صدیقی کے

آبا و اجداد کا تعلق اتر پردیش کے تاج محل کے لیے مشہور شہر آگرہ سے تھا۔ معروف شاعر اور کوئز مقابلہ کے مشہور حامد اقبال صدیقی ان کے چھوٹے بھائی ہیں، جب کہ ایک چھوٹے بھائی رئیس صدیقی خطاط کا چند سال قبل انتقال ہو چکا ہے۔ افتخار امام 19 نومبر 1947 کو ملک کی تقسیم اور آزادی ہندوستان میں تاریخی شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سیماب اکبرآبادی ایک استاد شاعر رہے اور کہا جاتا ہے کہ ان کے تین ہزار شاگرد تھے اور بمبئی پہنچ کر بھی انھوں نے مشہور زمانہ رسالہ 'شاعر' کی اشاعت جاری رکھی۔ آزادی کے بعد سیماب اکبرآبادی ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے، لیکن ان کے بیٹے اعجاز صدیقی نے پاکستان جانے سے انکار کر دیا اور جنوبی ممبئی میں واقع پلے ہاؤس علاقے کی سیتارام بلڈنگ میں مقیم ہوئے تین چار نسلوں نے یہاں زندگی گزار دی اور مرحوم افتخار صدیقی نے بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ماہنامہ 'شاعر' کی اشاعت روک ٹوک جاری رکھی۔ افتخار امام صدیقی 2020 میں ریل کے سفر کے دوران جبل پور میں حادثہ کا شکار ہو گئے تب سے مشاعروں سے دوری اختیار کر لی۔ ان کے ساتھ یہ حادثہ 11 مارچ 2002 کو جبل پور اسٹیشن پر پیش آیا تھا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ افتخار امام صدیقی نے شاعر کے لیے تقریباً سو شخصیات کے انٹرویو بھی لیے۔ جبل پور میں ٹرین حادثہ کی وجہ سے وہ معذور ہو گئے اور وہیل چیئر کے محتاج ہو گئے تھے، لیکن اس کا ماہنامہ 'شاعر' کی اشاعت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے 'ون مین آرمی' کے طور پر 'شاعر' کو جاری و ساری رکھا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 اپریل 2021

ساگر سرحدی

ممبئی: ہندوستان کے اردو زبان کے افسانہ نگار، ڈراما نگار،

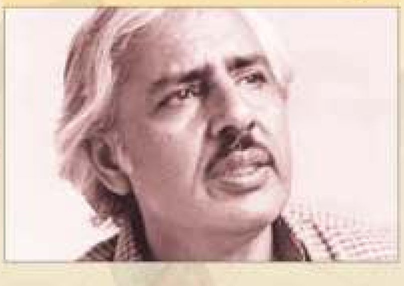

فلم ساز، ہدایت کار، مکالمہ نویس اور اسکرین پلے رائٹر ساگر سرحدی 22 مارچ کو ممبئی کے متوسط طبقہ کے علاقے سائن میں انتقال کر گئے۔ انھوں نے ملک کی تقسیم کے بعد سائن کولی واڑہ کے سردار نگر رفیوجی کیمپ میں پناہ لی تھی اور گزشتہ 73 سال سے یہیں زندگی گزاری، وہ غیر شادی شدہ تھے۔ ان کا اصل نام تلوار گنگا ساگر ہے۔ ساگر سرحدی 11 مئی 1933 میں پاکستان کے خیبر پختونخوا صوبے (سابقہ صوبہ سرحد) کے شہر ایبٹ آباد کے ایک خوب صورت قصبے 'بفا' میں پیدا ہوئے تھے۔ ساگر سرحدی نے کبھی کبھی، نوری، سلسلہ اور بازار جیسی فلمیں لکھیں اور شہرت حاصل کی۔ ان کے بھتیجے رمیش تلوار کے مطابق 88 سال کی عمر میں اتوار کی رات دیر گئے معمولی علالت کے بعد آخری سانس لی۔ تھیٹر کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ساگر سرحدی نے فلموں میں بھی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ساگر سرحدی 12 سال کی عمر میں ملکی تقسیم کے بعد 1947 میں اپنے خاندان کے ہمراہ دہلی آ گئے اور پھر بڑے بھائی کے خاندان کے ساتھ ممبئی آ گئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی خالصہ کالج میں تعلیم کے دوران انھوں نے سینٹ زیویرز میں داخلہ لیا لیکن دوران تعلیم سرحدی نے ایک اشتہاری ایجنسی میں ملازمت اختیار کر لی۔ ساگر سرحدی نے اردو مصنف کی حیثیت سے اپنے کریئر کا آغاز کیا اور تھیٹر سے فلمی دنیا میں آ گئے۔ انھوں نے 1976 میں یش چوپڑہ کی فلم کبھی کبھی سے فلمی دنیا میں داخلہ لیا۔ پھر انھوں نے سلسلہ، نوری، دیوانہ، کہو نہ پیار ہے وغیرہ فلموں میں مکالمے لکھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 23 مارچ 2021

ڈاکٹر صفدر

ممبئی: اردو کے مشہور ادیب، جدید شاعر، ناقد اور مزاح نگار ڈاکٹر صفدر، مورخہ 26 مارچ کی صبح اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ امراوتی (مہاراشٹر) میں چند دنوں سے زیر علاج تھے۔ 27 مارچ کو امراوتی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ڈاکٹر صفدر

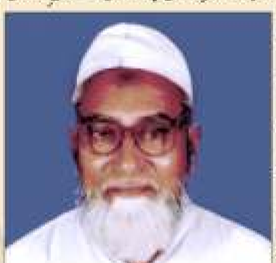

یکم جولائی 1946 کو اچلپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ موصوف ورود (ضلع امراوتی) میں اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد پرنسپل کے عہدے سے سبک دوش ہوئے تھے۔ تدریسی کتابوں کی تدوین کے ادارے مہاراشٹر بورڈ اور بال بھارتی پونا کی لسانی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے آپ نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انھیں علاقہ برار کے پہلے تنقید نگار اور جدید شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ کی کئی تنقیدی اور شعری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری اور شیوۂ پیغمبری، جدید شعری تنقید، بے آمیز (تنقید) قل قل آب وضو، لفظوں پہ رم (شاعری) اور آئینۂ خنداں (طنز و مزاح) کے علاوہ ان کے فکر و فن پر مشتمل دو کتابیں، صفدر۔ تخلیقی و تنقیدی جہتیں (مرتبہ: شاہد رشید) اور تنقیدِ نو (ڈاکٹر شائستہ تبسم) بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آپ کو متعدد قومی اور علاقائی اعزازات سے نوازا گیا۔ آپ نے بحیثیت صحافی اور کالم نگار بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ 2004 تا 2006 آپ 'روز نامہ صدائے وِدربھ امراوتی' کے مدیر رہے۔ اسی اخبار میں آپ کا مزاحیہ کالم 'نیم کارس' بڑے شوق سے پڑھا جاتا رہا ہے۔ ان کالموں اور ان کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ 'آئینۂ خنداں' منظرِ عام پر آ چکا ہے جسے اس سال مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے انعامات سے نوازا ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر محمد اسد اللہ، ناگپور، 27 مارچ 2021

فاطمہ رفیق زکریا

اورنگ آباد: مشہور صحافی اور ماہر تعلیم نیز سابق ریاستی وزیر اور دانشور ڈاکٹر رفیق زکریا کی بیوہ پدم شری فاطمہ زکریا 7 اپریل کو اورنگ آباد کے ایک اسپتال میں علاج کے

دوران انتقال کر گئیں۔ پسماندگان میں 2 بیٹے فرید زکریا اور ارشد زکریا ہیں۔ فرید زکریا عالمی شہرت یافتہ صحافی اور سی این این کے معروف اینکر ہیں۔ خود مرحومہ ٹائمز آف انڈیا اور السٹریٹیڈ ویکلی جیسے موقر انگریزی اخبارات سے وابستہ رہیں اور صحافتی حلقوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انھوں نے خشونت سنگھ جیسے ملک کے صفِ اول کے صحافی کے ساتھ کام کیا۔ یہی نہیں بلکہ ٹائمز آف انڈیا کے ممبئی ٹائمز کی مدیرہ بھی رہیں۔ سرفراز آرزو نے بتایا کہ فاطمہ زکریا درازی عمر کے سبب ادھر کچھ برسوں سے علیل

رہا کرتی تھیں۔ انھیں امراض قلب کی شکایت تھی۔ چند روز قبل کووڈ 19 سے متاثر ہونے پر انھیں اورنگ آباد کے اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی، خیرالاسلام ایجوکیشن ٹرسٹ اور مولانا آزاد ایجوکیشن ٹرسٹ کے ذریعے انھوں نے ملت اسلامیہ کی ہمہ جہت خدمت کا سلسلہ آخری عمر تک دراز رکھا۔ انھوں نے اپنے شوہر کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کے معیار کو بلند کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اپریل 2021

انیس چشتی

ممبئی: ملک گیر شہرت کے حامل ادیب، محقق، مورخ، مترجم، مقرر اور درجنوں کتابوں کے مصنف انیس چشتی کا 5 اپریل کو دورۂ قلب کے سبب پونے میں ان کی رہائش

گاہ پر انتقال ہوگیا۔ رات ساڑھے 8 بجے پونے ہی میں ان کی تدفین عمل میں آئی جس میں علم و ادب سے متعلق شہر و بیرون شہر کی کئی اہم شخصیات شریک ہوئیں۔ انیس چشتی علم و ادب کی بے حد فعال شخصیت تھے اور اپنی عمر کے آخری دنوں بھی لیکچرس میں مصروف رہے تھے۔ انھیں تحریر و تقریر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ مارچ کے آخری ہفتے میں ہونے والی ان کی آن لائن تقریر دنیا کے کئی ممالک میں سنی گئی تھی۔ انھیں بیک وقت اردو، ہندی، انگریزی اور مراٹھی زبان میں تحریر و تقریر کا ملکہ حاصل تھا۔ پسماندگان میں اکلوتی دختر جاذبہ ہے۔ انیس چشتی نے کئی اہم موضوعات پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اسلامی تعلیمات کو غیر مذاہب کے لوگوں تک پہنچانے کے لیے بھی انھوں نے قلم کا سہارا لیا۔ ان کی مراٹھی کتابیں محمدؐ پیغمبر، اسلام اچے وچار ویبھو، رمضان پرچے اور آدھونک ریگات اسلامی جیون شیلی کو دعوتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیگر کتابیں مثلاً تذکرۂ ابوالحسن علی ندویؒ، عصری و تحقیقی مقالات، اقبال کا ادبی و تہذیبی ورثہ، بدلتی دنیا اور پیاسا تعلیمی عمل سمیت کم و بیش 42 کتابوں کی تصنیف و تالیف کی۔ ترجمہ نگاری میں بھی وہ طاق تھے۔ اس طرح وہ بیک وقت کئی فنون پر قدرت رکھتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اپریل 2021

احمد کلیم فیض پوری

بھساول: مقبول احمد کلیم فیض پوری 17 مارچ کو علی الصباح جلگاؤں کے ایک نجی اسپتال میں علاج کے لیے جاتے

وقت انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 84 سال تھی۔ گزشتہ ہفتہ کو ان کی شریک حیات کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی دائمی جدائی کے غم نے انھیں ایسا نڈھال کیا کہ ان کی حالت گرتی ہی چلی گئی۔ مرحوم کی نماز جنازہ نورانی مسجد کھڑکا روڈ پر ادا کی گئی جبکہ تدفین بھساول کے کھڑکا روڈ قبرستان میں عمل میں آئی۔ احمد کلیم فیض پوری ویسے تو فیض پور کے تھے مگر ملازمت کے سبب وہ بھساول آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ انھوں نے کم و بیش 34 برس تدریسی خدمات انجام دیں اور انجمن اسکول سے 1993 میں بحیثیت صدر مدرس سبکدوش ہوئے۔ اس دوران تخلیقی و تصنیفی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ ان کی دو کتابیں 'چندا کے دیس میں' (نظمیں) اور 'ساگوان کی چھاؤں میں' (افسانے) شائع ہوئی ہیں، مگر انھوں نے لکھا بہت کچھ۔ روزنامہ 'اردو ٹائمز' میں ان کا کالم 'میرے شہر کے لوگ' کافی مقبول ہوا تھا۔ ان کا تخلیقی سفر عمر کے کسی پڑاؤ میں تھما نہیں۔ وہ ایک زمانے تک اس وقت کے مقبول ماہنامہ بانو، شمع اور بیسویں صدی میں چھپتے رہے۔ دیگر ادبی جریدوں میں بھی ان کی تخلیقات بہ اہتمام شائع ہوئیں۔ مجموعہ 'ساگوان کی چھاؤں میں' کی رسم رونمائی میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 مارچ 2021

پروفیسر ظفرالدین

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مرکز

برائے مطالعات اردو ثقافت و نظامت ترجمہ و اشاعت کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد ظفرالدین کا 5 اپریل کو حرکت قلب بند ہوجانے کے باعث 55 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کا شمار یونیورسٹی کے اولین رفقائے کار میں کیا جاتا تھا۔ لواحقین میں اہلیہ ڈاکٹر مسرت جہاں، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو (مانو) کے علاوہ 2 فرزند شبیہ ظفر اور فرقان ظفر اور ایک دختر شامل ہیں۔ پروفیسر ظفرالدین اردو یونیورسٹی سے بہ حیثیت اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر 16 مارچ 1998 کو منسلک ہوئے۔ 13 ستمبر 2004 کو بہ حیثیت ریڈر ٹرانسلیشن ڈویژن ان کا تقرر ہوا۔ 4 مارچ 2008 کو شعبۂ ترجمہ میں بہ حیثیت پروفیسر ان کا تقرر عمل میں آیا۔ انھیں یونیورسٹی کا اولین پراکٹر ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہ حیثیت ڈین اسکول آف لینگویجز اور صدر شعبۂ ترجمہ بھی خدمات انجام دیں۔ تاحال وہ یونیورسٹی کے مجلس انتظامی اور مجلس تعلیمی کے رکن بھی تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 اپریل 2021

رضا سرسوی

سرسی سادات: عالمی شہرت یافتہ شاعر شاعر الحاج قاضی سید نوشے رضا، رضا سرسوی کا 6 اپریل مرادآباد کے اسپتال میں 78 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ آپ کو ان کے آبائی وطن سرسی کے آبائی قبرستان میں سیکڑوں سوگواران کی موجودگی میں جس میں بڑی تعداد میں علما، شعرا، ادبا، معززین ملت اور بیرونی لوگ شامل تھے، سپرد خاک کردیا گیا۔ نماز جنازہ مولانا قاضی سید حسین رضا نقوی نے پڑھائی۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیٹی اور ایک بیٹا شامل ہیں۔ مرحوم گزشتہ کچھ دنوں سے بیمار تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 اپریل 2021

افضال صابری

دیوبند: عہد ساز شخصیت دیوبند کے مشہور قوال افضال صابری کا 6 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 73 برس کے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے علاقہ کی ادبی و سماجی حلقوں کی فضا مغموم ہوگئی۔ جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر عام ہوئی، تو محلہ قلعہ میں واقع ان کی رہائش گاہ پر شعرا، وکلا، ادبا، سیاسی اور سماجی شخصیات سمیت شہر کے سرکردہ لوگوں کا تعزیت کے لیے تانتا لگ گیا۔ ملک کی نامور سیاسی اور سماجی شخصیات نے ان کے انتقال کو دیوبند کی تاریخ کے ایک باب کا خاتمہ قرار دیا ہے۔ افضال صابری گزشتہ کئی سالوں سے صاحب فراش تھے۔ افضال صابری کی پیدائش میوزک کے استاد سمجھے جانے والے بشیر احمد کے

یہاں اقبال صابری کی پیدائش کے دو سال بعد سال 1949 میں ہوئی تھی۔ صابری برادران نے اپنے والد بشیر احمد صابری سے موسیقی سیکھی۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کو قوالی اور ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی تربیت دی۔ صابری برادران نے ابتدائی طور پر اپنے کیریئر کا آغاز صوفی زیارتوں اور نجی محفلوں میں انجام دے کر کیا۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 اپریل 2021

ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی

لکھنؤ: معروف ادیب ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی کا 12 اپریل بروز پیر مختصر علالت کے بعد بعمر 75 سال انتقال ہوگیا۔

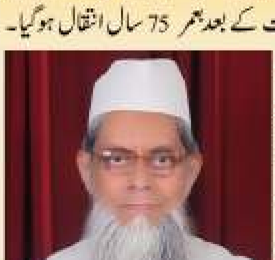

13 اپریل کو بعد نماز ظہر کھدرا علاقے میں واقع تکیہ تاران شاہ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ آپ کی پیدائش نگینہ ضلع بجنور یوپی میں ہوئی تھی۔ سی سی آر یو ایم لکھنؤ کی شاخ میں یونانی مرکبات کی کیمیائی معیار بندی کے تحقیقی کام کو آپ نے انجام دیا۔ آپ نے اپنی تحقیق کو نہ صرف انگریزی بلکہ اردو میں بھی شائع کرایا۔ ماہنامہ 'باغیچہ' لکھنؤ کے اعزازی مدیر بھی رہے۔ آپ کی تصانیف میں گلدستہ در گلدستہ، ادبی معلوماتی پہیلیاں، گنجینۂ رباعیات، گلدستہ بیت بازی، گلدستہ تحقیق و تجزیہ، جانوروں سے ملاقات قابل ذکر ہیں۔ آپ کو کئی اہم اعزازات بھی مل چکے ہیں۔

روزنامہ'اودھ نامہ' لکھنؤ، 15 اپریل 2021

نور پھندیڑوی

نئی دہلی: معروف شاعر اہل بیت الحاج سید نور محمد زیدی المعروف نور پھندیڑوی کا 13 مارچ کو نئی دہلی کے مجیدیہ اسپتال میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے جسد خاکی کو اتر پردیش کے امروہہ ضلع کے گاؤں پھندیڑی سادات لے جایا گیا جہاں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ 85 سال سے زائد عمر پانے والے نور پھندیڑوی نے اوکھلا کے غفور نگر اور نور نگر میں اپنی زندگی گزاری۔ مرحوم کے پسماندگان میں پانچ بیٹے، پانچ بیٹیاں اور اہلیہ ہیں۔ نور پھندیڑوی نے مداح اہل بیت میں سیکڑوں قصیدے، نعت، نوحے اور سلام لکھے ہیں جو مجالس و محافل میں پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نور صاحب نے غزلیں بھی لکھیں، نور اپنا کلام خود بھی پڑھا کرتے تھے اور ان کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ جس محفل میں بطور شاعر مدعو نہیں ہوتے تھے اس میں وہ سامع کی حیثیت سے شریک ہوا کرتے تھے۔ مرحوم نہایت ملنسار اور اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ خدا ان کے درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 مارچ 2021

شمشاد احمد

ممبئی: ممبئی میں رہائش پذیر سینئر اردو صحافی شمشاد احمد انتقال کر گئے۔ شمشاد احمد 47 نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ممبئی سے شائع ہونے والے اردو کے ایک روزنامہ اخبار سے کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے مختلف اخبارات میں اپنی خدمات انجام دیں۔ شمشاد احمد کورونا پازیٹو پائے جانے کے بعد گزشتہ چند دنوں سے علیل تھے اور الہاس نگر کے میکس لائف اسپتال میں زیر علاج تھے جہاں گزشتہ روز انھوں نے آخری سانس لی۔ علاج کے دوران انھیں دو دو ہارٹ اٹیک بھی آئے تھے۔ کورونا پازیٹو ہونے کے سبب بدلاپور کے پل گاؤں میں واقع مسلم قبرستان میں محدود افراد کی موجوگی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ سمیت تین بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کے انتقال پر سیاسی، ملی و سماجی لوگوں نے اظہار تعزیت پیش کیا۔

روزنامہ'سچ کی آواز' دہلی، 28 مارچ 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............... بتاریخ.............................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زر تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو صحافت (آغاز سے 1857 تک کا ایک مختصر جائزہ)

مصنف: معصوم مرادآبادی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190

قیمت 110 روپے

اردو صحافت (1901 تا 1947 ایک مختصر جائزہ)

مصنف: اسد رضا

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 95 روپے

اردو صحافت (1948 تا 2000 ایک مختصر جائزہ)

مصنف: سہیل انجم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 80 روپے

مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے عام قانونی معلومات

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 375

قیمت: 180 روپے

تاریخ و تہذیب و ثقافت

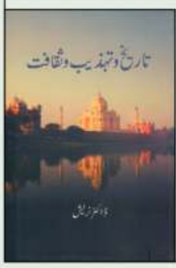

مصنف: ڈاکٹر نریش

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 210

قیمت: 120 روپے

رودر پریاگ کا آدم خور تیندوا

مصنف: جم کاربیٹ

مترجم: شرافت یار خاں

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 164، قیمت: 100 روپے

آؤ سائنسی خط پڑھیں!

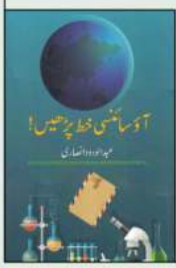

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 75 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 80 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, मई-२०२१, वर्ष:२३, अंक:०५
URDU DUNIYA Monthly, May-2021, Vol.23, Issue:05
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/04/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6